پس نوشت

چہارم

اُردو کی خود نوشتوں کا تجزیہ

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی

نیا زمانہ پبلیکیشنز
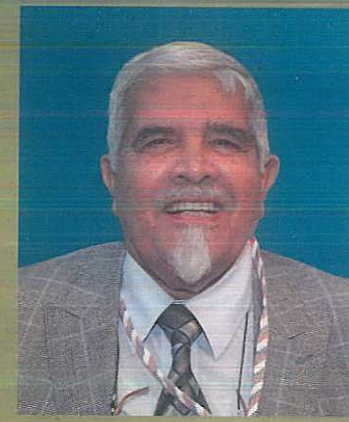
پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی - تصنیفات و تالیفات

1964 ۔ ذکر اردو، تعلیم الاسلام کالج کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ،

1977 ۔ خوبصورت جاپان اور میں، کاواباتا یاسوناری کی نوبل سپیچ کا اردو ترجمہ

1978 ۔ یوکی گونی، کاواباتا کے نوبل ناول کا اردو ترجمہ،

1980 ۔ جاپان کا سب سے لمبا دن،

1980 ۔ جاپان کی ہائیکو شاعری کا انتخاب اور ترجمہ

1981 ۔ سورج کے ساتھ ساتھ، جاپان کا سفرنامہ

1997 ۔ صدائے آب، ہائیکو پر تنقیدی مضامین،

2002 ۔ آ کی مے، ہیروشیما کے المیہ کے پس منظر میں ناول

2003 ۔ احمدیہ کلچر

2003 ۔ سر ظفر اللہ کا تحریک آزادی میں حصہ

2003 ، پس نوشت ۔ اردو کی خود نوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

2005 ۔ سر ظفر اللہ کی یادداشتیں،

Reminiscences of Sir Zafarullah 2006

2008 ۔ پس نوشت اور پسِ پس نوشت (مزید خود نوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

2010 ۔ پس نوشت سوم (مزید خود نوشتوں کا جائزہ)

خود نوشتوں کے تجزیہ کا کام جاری ہے، جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

حاصل عمر: ''حبل الورید'' قرآن حکیم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ)

تیسری ہجرت کے بعد 2003 سے کینیڈا میں مقیم ہیں

ISBN 978-969-9179-09-9

9 789699 179099

Price Rs. 600/-

منصور نورالدین
15-10-2013

پس نوشت

چہارم

ڈاکٹر پرویز پروازی

نیازمانہ پبلیکیشنز

پس نوشت

چہارم

ڈاکٹر پرویز پروازی

ISBN 978-969-9179-09-9

2012

نیا زمانہ

محمد شعیب عادل نے

ندیم یونس پرنٹرز سے چھپوا کر

نیا زمانہ پبلیکیشنز،

میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ لاہور سے شائع کی

ماہنامہ نیا زمانہ، میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور فون 042 5065015

Email:niazamana@yahoo.com, www.niazamana.com

قیمت ——— 600 روپے

مندرجات

انتساب

اردو خود نوشتوں کے تجزیہ کے سلسلہ کی
چوتھی جلد پس نوشت چہارم کو میں اپنے مرحوم
دوست حمید اختر کے نام معنون کرتا ہوں۔

اظہار تشکر

پس نوشت چہارم کے سلسلہ میں میرے ساتھ تعاون کرنے والے کرم فرماؤں میں عبدالوہاب خاں سلیم، ڈاکٹر داؤد رہبر، پروفیسر شمیم احمد، ڈاکٹر تقی عابدی اور بیدار بخت کے علاوہ کراچی کے راشد اشرف اور ہری پور ہزارہ کے زاہد کاظمی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ اس جلد میں ان کی فراہم کردہ بہت سی خودنوشتیں شامل ہیں۔ کتابوں کو یہاں پہنچانے میں عبدالکریم قدسی صاحب کا تعاون شامل حال نہ ہوتا تو کام تکمیل تک نہ پہنچ سکتا۔

اسی طرح کتاب کی پروف ریڈنگ میں میری مادر علمی تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے ایک قدیم طالب ونگ کمانڈر ریٹائرڈ حنیف شاد بھی شامل ہو گئے ہیں۔ استاذی المحترم مبارک احمد انصاری اور کرنل راجہ اسلم کے ساتھ ان کا تعاون بھی پروف ریڈنگ میں شامل حال رہا۔ میں ان احباب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو کی خودنوشتوں کے تجزیہ کے سلسلے میں میری چوتھی کتاب پس نوشت چہارم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اب تک کم وبیش تین سو خودنوشتیں زیر بحث آ چکی ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کتاب کے ساتھ اردو خودنوشتوں کے مزاج پر ایک مبسوط جائزہ بھی لکھوں مگر یہی فیصلہ کیا ہے کہ جائزہ تو لکھوں مگر اسے اس کتاب کا حصہ بنانے کی بجائے علیحدہ سے شائع کروں۔ انشاء اللہ بشرط صحت وزندگی اس موضوع پر کام کروں گا وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

یکم اکتوبر ۲۰۱۲

پرویز پروازی

5914, Long Valley Road,

Mississauga. Ont. L5M 6J6

Canada

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں

پاکستان کے مشہور مصور اور خطاط جناب بشیر موجد کی خودنوشت ''بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں'' 2004 میں لاہور سے پاکستان کیلیگراف آرٹسٹس گلڈ کے زیرِاہتمام اشاعت پذیر ہوئی۔ بشیر موجد ہمارے دور کے مشہور اور جانے پہچانے خطاط اور مصور ہیں۔ آپ نے اپنی سرگزشت کا آغاز کسی کے نہایت خوبصورت شعر سے کیا ہے ''گو سخن ہائے گفتنی تھے بہت۔ لکھنے بیٹھے تو مختصر نکلے۔'' یہ بات یوں بھی ٹھیک ہے کہ سخن ہائے گفتنی قلمبند نہیں کئے جا سکتے کیونکہ ان کے آگے سخن ہائے ناگفتنی کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ افسوس بے شمار سخن ہائے گفتنی۔ خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے۔ وزیر آغا نے کتاب کے تعارفیہ میں لکھا ہے ''یہ ایک ایسے معصوم اور بے داغ شخص کی کہانی ہے جو گاؤں کی پاک فضا سے نکل کر شہر کی زہر آلود فضا میں داخل ہوا اور پھر ان گنت چرکے اپنے سینے پر سہتا چلا گیا۔ شہری کرداروں کے دوغلے پن کو ان کی منافقت اور ریاکاری کو بغیر کسی جھجک کے بیان کر دیا ہے''۔ ''شہری'' ہونا بجائے خود کوئی جرم نہیں مگر شہریوں کی ذہنیت میں جو کثافت پیدا ہو جاتی ہے وہ گاؤں کے صاف ستھرے بے ریا اور مخلصانہ ماحول سے شہر میں آ جانے والوں کو بہت کھلتی ہے۔ پاک صاف کھلی فضا سے آنے والے لوگ نئے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے ہیں تس پر لوگ گاؤں سے آنے والے نئے پنکھ پکھیروؤں کو آزماتے بھی بہت ہیں۔ بشیر موجد کے استاد حضرت احسان دانش نے تو لاہور شہر کے رہنے والوں کے لئے بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ''لاہور کے شعرا اور ادبا کو قریب ہو کر دیکھئے تو شعر و ادب سے نفرت ہو جاتی ہے'' (جہانِ دانش صفحہ ۵۳۰) بشیر موجد نے اپنے استاد احسان دانش کا احسان مند ہونے کے باوجود ان کے باب میں ایک ایسی بات لکھ دی ہے جو نہ لکھی جاتی تو بہتر تھی۔

''ایک دن میں ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گنپت روڈ کی ایک دکان پر پہنچا یہ دکان اردو مرکز کے نام سے معروف تھی غالباً احسان دانش صاحب نے یہ دکان الاٹ کروا رکھی تھی یا وہاں صرف بیٹھا کرتے تھے مجھے فرمانے لگے ''تم بھی کوئی جگہ تلاش کر لو اور مجھے اس جگہ کے کوائف لا دو۔ میں تمہیں وہ جگہ الاٹ کروا دوں گا''۔ میں نے ایک دکان کے کوائف احسان صاحب تک پہنچا دئے اور چند دن کے لئے گاؤں چلا گیا واپس آیا تو معلوم ہوا کہ ''حضرت احسان دانش نے وہ دکان اپنے نام الاٹ کروا لی ہے'' (بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں صفحہ ۳۷) اگرچہ بشیر موجد نے اپنی تلخی کو چھپانے کے لئے اپنے استاد کے احسانات کو یاد کیا ہے اور ان کے اس سلوک کے مقابلہ میں ان کے احسانات کا پلڑا بھاری ہی پایا ہے مگر ''انسانی کمزوریوں کے اس کھیل پر میری بے یقینی میرے یقین پر غالب آ چکی تھی میری روح پر لگے زخم پھر سے ہرے ہو گئے تھے میں چپ چاپ واپس آ گیا اور کئی برس ان سے نہ مل سکا۔'' (صفحہ ۳۸) حالانکہ بشیر موجد کے سوچنے اور سمجھنے کو یہی ایک بات کافی تھی کہ بشیر موجد مہاجر نہیں تھے اور کسی الاٹمنٹ کے حقدار ہی نہیں تھے۔ کیا ان کے ذہنِ حق شناس نے انہیں یہ بات یاد نہ دلائی؟

عبدالغفور نساخ نے اپنی خودنوشت میں لکھا تھا کہ ''کلکتہ میں ایک شخص کو خطِ ناخن لکھتے دیکھا اور میں نے سیکھنا چاہا انہوں نے بتایا نہیں'' (خودنوشت نساخ صفحہ ٦)۔ یہ روایت ہمارے ہاں اب تک چلی آتی ہے لوگ جس فن پر عبور حاصل کر لیتے ہیں اسے دوسروں کو سکھانا عار جانتے ہیں۔ بشیر موجد نے بھی ''ایک خاندانی پینٹر سے جو شیشے پر نقاشی کے ماہر تھے یہ فن سیکھنا چاہا انہوں نے بتا کے نہیں دیا'' (صفحہ ۳) اسی طرح عبدالرحمٰن چغتائی نے بھی انہیں فنی رموز سے آگاہ کرنے سے انکار تو نہیں کیا ٹالتے رہے تا آنکہ انہیں یقین ہو گیا کہ استاد انہیں کچھ سکھائیں گے نہیں (صفحہ ۴٦)

ان کی خودنوشت میں تقسیم ملک کی افراتفری کا بہت ذکر ہے مگر نیک دل لوگوں کی مہاجر نوازی کا ایک واقعہ پڑھ کر جی بہت خوش ہوا۔ مہاجروں کی ٹرین کراچی جا رہی تھی۔ ٹرین کی چھت پر بھی لوگ سوار تھے۔ ایک جگہ کچھ دیہاتیوں نے ٹرین کے آگے لیٹ کر گاڑی رکوا لی۔ معلوم ہوا وہ مہاجرین کے لئے کھانا لے کر آئے ہیں۔ چونکہ گاڑی سٹیشن پر نہیں رکتی تھی اس لئے انہوں نے گاڑی کو رکوانے کے لئے یہ حربہ استعمال کیا ہے۔ موجد صاحب نے ایک بوڑھے شخص سے اس مہمانداری کا سبب پوچھا تو

اس نے کہا ''بیٹا ہم لوگ خوش قسمت ہیں کہ ہمیں گھر بیٹھے آزادی مل گئی اس آزادی کے صحیح وارث یہ مہاجرین ہیں جنہوں نے اپنے گھر بار چھوڑے، نسل در نسل بنائی ہوئی جائیدادیں چھوڑیں، اپنی بہو بیٹیوں کی عصمتیں لٹائیں بچے بوڑھے جوان قربان کیے تب جا کر یہ نعمت آزادی حاصل کرنے کے قابل ہوئے۔ ہم ان کی جتنی بھی عزت کریں کم ہے جتنی بھی خدمت کریں وہ بھی کم ہے'' ۔۔۔ ''بیٹا میرے پاس چند بھینسیں چند گائیں اور چند بکریاں تھیں جو میں ہر روز پکا پکا کر لاتا رہا ہوں آج یہ آخری گائے تھی جو میں لے آیا ہوں رات کا کھانا کھلا کر ہم لوگ واپس چلے جائیں گے کل کا اللہ مالک ہے'' (صفحہ ۲۷) اے کاش خدمت گزاری اور شکر گذاری کا یہ جذبہ قائم رہتا تو ہم آج کی تکلیف دہ صورت حال سے دوچار نہ ہوتے۔

فردوسیِ اسلام حفیظ جالندھری کی ایک دعوت کا ذکر بھی بڑا پر لطف ہے اور ان کی شخصیت کے خدوخال کو اجاگر کرتا ہے۔ موجد صاحب کا کہنا ہے کہ ہم لوگ یعنی قتیل شفائی اور میں کراچی میں حفیظ صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم لوگ دوستوں سے ملتے ملاتے دیر سے گھر پہنچے تو حفیظ صاحب سخت ناراض تھے۔ فرمایا ''میں نے تم دونوں کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا جس میں فلاں وزیر اور فلاں سفیر آئے تھے۔ لیکن تمہاری غیر حاضری کی وجہ سے مجھے خفت اٹھانا پڑی'' ۔۔۔ حفیظ صاحب کے چلے جانے کے بعد قتیل شفائی نے باورچی سے سگرٹ منگوائے اور اسے انعام دے کر اس ''زوردار دعوت'' کا پوچھا اس نے جواب دیا ''آپکو غلط اطلاع ملی ہے، ہم نے معمولی دال پکائی تھی جو سب گھر والوں نے کھائی تھی اور جب سے میں نے باورچی خانہ سنبھالا ہے دعوت تو کبھی ہوئی ہی نہیں'' (صفحہ ۷۲۔۷۳)

جناب حکیم نبی احمد جمال سویدا کی خوبیوں کا پڑھ کر اپنے بزرگوں کی اور ان کی اولاد کی وضع داریاں یاد آئیں۔ انہوں نے ایک ضرورت کے موقعہ پر موجد صاحب کو ایک لاکھ روپے قرض دے دئے تھے۔ (صفحہ ۵۸) مگر ہمیں تو ان کا بیان کردہ مولانا ابوالخیر مودودی کا ذکر بہت خوش آیا۔ یہ بیان حکیم جمال سویدا کا ہے ''مولانا ابوالخیر مودودی جب مولانا تھے نہ مودودی صرف ابوالخیر تھے۔۔۔ پڑوس کی ایک لڑکی کو دل دے بیٹھے۔۔۔ شریف لوگوں کی طرح شادی کا پیغام بھیجا گیا جو منظور نہ ہوا۔

ابوالخیر خود لڑکی سے ملے اس نے بھی نفی میں جواب دیا۔ نہ میں جواب سنتے وقت آپ کے کرتے کے بٹن غائب تھے۔۔۔ زندگی تو گذر گئی آپ ابوالخیر مودودی بھی بن گئے مگر آپ نے عمر بھر کرتے کو بٹن نہیں لگائے۔'' (صفحہ ۵۷)

غرض موجد صاحب کی سرگزشت دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ''احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کا موازنہ بھی ہے'' (صفحہ ۸۳۱) امرتا پریتم کے شوہر اندر جیت (امروز) کا تذکرہ بھی ہے'' (صفحہ ۲۵۲) حج کا سفر اختیار کرنے کے لئے مشہور ڈاکٹر ڈاکٹر حمید ملک کا تذکرہ بھی ہے کہ دونوں میاں بیوی نے دو بھینسیں پال رکھی تھیں جن کا دودھ بیچ کر وہ حج کے لئے زادراہ جمع کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ممکن تھا کہ مریضوں کی دی ہوئی فیس میں مریضوں کی مجبوری بھی شامل ہو اس لئے ایسا روپیہ حج کے سفر میں خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس نیک دل جوڑے کو اس طرح جمع کی ہوئی رقم سے حج کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ (صفحہ ۲۶۱)

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان کے سفر پر گئے تو ان کے ہندو دوست سلام کہتے وقت السلام علیکم اور خیریت پوچھنے پر الحمدللہ کہہ کر جواب دیتے تھے (صفحہ ۲۵۰) اور سب سے اہم موجد صاحب کا یہ شکوہ کہ ''انسان بھی عجیب ہے۔ ملکہ برطانیہ کے مرنے پر اسے مادر ہند کہہ کر خطاب کرتا ہے'' (صفحہ ۷۸) موجد صاحب کی باتیں محض قصے کہانیاں نہیں دعوت فکر دینے والی باتیں ہیں۔

❁

جیون دھارا

مشہور سول سرونٹ جناب جیون خان کی خودنوشت جیون دھارا کا دوسرا حصہ سنگت پبلشرز لاہور کی جانب سے ۲۰۱۰ میں چھپا ہے۔ پہلے حصہ کے عنوان کے نیچے ذیلی عنوان تھا کیکر کی چھاؤں سے کمشنر ہاؤس تک۔ دوسرے حصہ کا ذیلی عنوان ہے قصر سلطانی کے سائے تلے۔ پہلے حصہ کا اختتام مصنف کے کمشنر سرگودھا کے مقتدر عہدے سے پنجاب کے نئے نویلے چیف منسٹر کا سکرٹری مقرر ہونے پر ہوا تھا اور آپ راتوں رات دھاوا مارتے ہوئے لاہور پہنچے تھے کہ نئے چیف منسٹر کا استقبال کرسکیں۔ مارشل لا کی چھتری تلے نئی نئی جمہوریت قائم ہوئی تھی اس لئے اقتدار کا سرچشمہ گورنر ہاؤس تھا نئے چیف منسٹر کے پاس ''چند کوڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا'' (جیون دھارا صفحہ ۸) نئے چیف منسٹر کا استقبال کرنے بھی صرف ایک ایڈیشنل چیف سکرٹری آئے تھے۔ ''بند لفافہ کی مانند زندگی گذرنے لگی'' (صفحہ ۱۲) شاید جیون خاں نے عبدالقادر حسن کا وہ کالم اس روز تک نہ پڑھا ہو جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ گورنر جیلانی نے تمام صحافیوں کو مدعو کر کے نواز شریف کو وزیر اعلیٰ بنانے کے فیصلے کا اعلان کیا تھا۔ جب اعلان کر چکے تو لوگوں سے گھل مل گئے نواز شریف لوگوں سے مبارکبادیاں وصول کرنے لگے۔ گورنر جیلانی نے یکا یک خدمت کرنے والے ایک بیرے کے سر سے پگڑی اتاری اور نواز شریف کے سر پر رکھ دی۔ گویا انہیں باور کروا دیا کہ وزارت علیا تمہیں میں نے عطا کی ہے مگر تمہاری حیثیت ایک بیرے کی سی ہوگی۔ مگر حالات بدلے اور میاں نواز شریف کے سر پر ہما آ بیٹھا تو دفتر کے رنگ ڈھنگ ہی نہیں میاں صاحب کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے اپنے سرپرست جنرل ضیاء الحق کے تتبع میں ''سرکاری خرچ پر اللے تللے ہونے لگے'' (صفحہ ۴۰)

جنرل ضیاء الحق کے چیف آف سٹاف جنرل خالد محمود عارف نے بھی ''ضیاء الحق کے ہمراہ دس سال'' میں یہی لکھا تھا کہ صدر صاحب ذاتی اور سرکاری اخراجات میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے (صفحہ ۱۷۳) یہ دونوں اصحاب امیر المؤمنین بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ دوسروں نے تو سنی سنائی لکھی ہوگی جیون خان نے تو ''ضیاء الحق کے جوانِ صالح'' (صفحہ ۷۷) اور صدر رفیق تارڑ کے لفظوں میں ''نیکی کے سمندر'' (صفحہ ۳۵۶) اور امیر المؤمنین بننے کا خواب دیکھنے والے نواز شریف کے ہمراہ پنجاب میں بھی کام کیا ہے اور مرکز میں بھی ان کے طور اطوار دیکھے ہیں اس لئے ان کی بات مستند ہے۔ نواز شریف پنجاب میں تھے تو مختار کل بن بیٹھے تھے (صفحہ ۴۵) مرکز میں وزیر اعظم تھے تو ذہن میں مختار کل بننے کا سودا تھا (صفحہ ۲۹۶) یہی بات جیون دھارا کی خوبی ہے اور یہی نکتہ جیون دھارا کا سب سے بڑا سقم ہے۔ اس خودنوشت میں جیون خان کی موجودگی کا احساس کم تر ہے دوسروں کا تذکرہ اور ذکراذکار زیادہ تر۔ کچھ سفرنامے ہیں اور کچھ ادھر ادھر کی باتیں۔

فسخ نکاح کا معاملہ بھی ایک سے زیادہ بار معرضِ بیان میں آیا ہے۔ پہلا یوں کہ ہر رکن اسمبلی وعدہ کرے کہ ''اگر وہ میاں نواز شریف سے بے وفائی کرے گا تو اس کا نکاح فسخ ہو جائے گا'' (صفحہ ۴۳) دوسرے یوں کہ یہ خود اس کی زد میں آتے آتے بچے۔ آپ سکرٹری داخلہ تھے ان دنوں مولانا حق نواز جھنگوی نظر بند تھے۔ ''ایک دفعہ تین مستند علما تشریف لائے ان سے مسلمانوں کے ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کا گلہ کیا آیت کریمہ کا حوالہ دیا جس میں مسلمانوں کو جھوٹے خداؤں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے تاکہ وہ بدلے میں سچے خدا پر لعن طعن نہ کریں علما کرام نے فرمایا آپ عالم نہیں اس لئے ان مسائل میں نہ الجھیں۔۔۔ ہم اپنی شریعت سے خوب واقف ہیں اور بلا جواز کوئی فتویٰ نہیں دیتے ہم جانتے ہیں کہ آپ مسلمان آدمی ہیں ورنہ جس بحث میں آپ الجھ رہے ہیں اس کی مناسبت سے فسخ نکاح کا فتویٰ جاری ہو سکتا تھا'' (صفحہ ۷۵)۔۔ جیون خان نے خوب لکھا ہے کہ گفتگو کا یہ انداز ہو تو کون مدعی بنے اور کسے کوئی گواہ کرے؟

جیون خان نے جیون دھارا کے دوسرے حصہ میں بھی اپنی اس محرومی کا ذکر حسرت کے ساتھ کیا ہے کہ انہیں اپنے بعض دوسرے ساتھیوں کی طرح باہر کے ممالک میں اعلیٰ تعلیم کا موقعہ نہیں ملا (صفحہ

۴۹) ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ اگر ہمارے محترم دوست کو باہر کے اعلیٰ ترقی یافتہ ممالک میں کچھ عرصہ رہنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل جاتا تو کم از کم ''کوڑے کھانے والوں کی اذیت کو نشر کرنے کے لئے ان کے منہ کے سامنے لاؤڈ سپیکر رکھنے'' (صفحہ ٦٦) اور ''سرعام پھانسی دینے'' (صفحہ ٦٧) جیسے غیر انسانی افعال کے احکام ان کے محکمہ داخلہ کے سکرٹری ہونے کے دوران تو جاری نہ ہوتے اور اگر مارشل لاء کے تحت جاری ہونا ہی تھے تو جیون خان کی عدم رضامندی کا زوردار نوٹ تو ریکارڈ پر ہوتا مگر جو کچھ کتاب میں لکھا گیا ہے اس سے تو ان کی رضامندی کا تاثر ابھرتا ہے۔ ہمیں ان سے مکمل اتفاق ہے کہ ''فقیر کی طبیعت طرفہ تماشا ہے'' (صفحہ ۳۵۲)

غلام حیدر وائین صاحب کی درویشی اور استغناء کا ذکر ہے (صفحہ ۳۰) نگران کے میرٹ پر بھرتی کرنے اور انصاف کا بھی کہ چپڑاسی کی اسامیوں کے لئے ایم اے پاس نوجوان بھی امیدوار تھے ۔میرٹ پر بھرتی کا فیصلہ ہوا کہ ''آدھی اسامیاں میرٹ پر پر کی جائیں'' (صفحہ ۱۷۴) اس انصاف اور میرٹ پروری پر فرشتے بھی عش عش کر اٹھے ہوں گے۔

مرکز میں نے جانے سے پہلے سندھ کا مزا چکھا۔ بے نظیر کی وزارت عظمیٰ میں ناحق کی جھڑکیاں گھرکیاں سنیں۔ مرد اول کے جلال پادشاہی کا نظارا کیا (صفحہ ۲۲۷۔۲۲۸) اب تو وہ مرد اول قصر صدارت میں براجمان ہیں۔ اس بات کا بھی ذکر ہے کہ بھٹو کو سب کچھ ملا (صفحہ ۲۳۱) لیکن جس طرح ان کا سب کچھ چھنا وہ بھی تاریخ کا ناقابل فراموش ورق ہے۔ اقتدار کل حاصل کرنے کے بعد نواز شریف کے اجنبی بن جانے کا ذکر ہے۔ (صفحہ ۲۵۹۔ صفحہ ۲٦۹ اور صفحہ ۲۹۰) کہ یہی اقتدار ہے جو انسان کو اندھا بنا دیتا ہے۔ پرویز مشرف کو کماندار بنانے کا بہت ذکر آپ نے کیا ہے۔ ان کی مے نوشی اور پس پردہ محبوب پرستی کا بھی تذکرہ ہے (صفحہ ۳۹۴) مگر نواز شریف صاحب کی اس شہرت کا ذکر تک نہیں کہ وہ پس پردہ کیا کیا ''پرستی'' کیا کرتے تھے؟ سٹاف کالج کے کماندار تھے تو انہیں حیرت ہوئی کہ بیس گریڈ کے افسر قرآن تک نہیں جانتے تھے (صفحہ ۳۵۲) ہم نے تو اکیس گریڈ کے ایسے افسر دیکھے ہیں جو قرآن کریم ناظرہ نہیں پڑھ سکتے تھے اور اداروں کے سربراہ تھے۔

صدر کے پرنسپل سکرٹری مقرر ہوئے تو انہیں رفیق تارڑ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ان کی جتنی

تعریف ہم نے ان کے ہاں دیکھی ہے اتنی کسی جگہ نہیں دیکھی۔ ان کی نیکی ان کی ''متبرک'' شکل و صورت اپنی جگہ مگر چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی بات کا ان سے کوئی جواب نہیں ہو سکا کہ رفیق تارڑ صاحب نے عدالت عظمیٰ کے ججوں میں افتراق پیدا کرنے میں جو گھناؤنا کردار ادا کیا تھا اس کے عوض میں وہ منصب صدارت پر فائز کئے گئے تھے۔؟ ایک سابق سکرٹری قانون میاں محمد ارشد نے تو اپنی خود نوشت میں یہ تک لکھ دیا ہے کہ نواز شریف کو سپریم کورٹ پر حملہ کرنے کا مشورہ رفیق تارڑ نے دیا تھا۔ (مبالغہ نہ مغالطہ صفحہ ۹۲)

ہم بھی مدتوں جھنگ کے ضلع کے باسی رہے مگر یہ معلوم کر کے اپنے اس اعزاز پر شرم محسوس ہو رہی ہے کہ جسٹس منظور حسین سیال جھنگ کے تھے۔ (صفحہ ۱۲۸) جج صاحب نے ضیاء الحق کے رسوائے زمانہ آرڈیننس XX کو جائز قرار دیا تھا اور دلیل یہ باندھی تھی کہ ارکان اسلام اسلام کے ٹریڈ مارک ہیں۔ گویا اسلام بھی کوئی جنسِ تجارت ہے۔ انا لله و انا اليه راجعون ان کے عدالتی تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ریٹائر ہونے (۲۴ مارچ ۱۹۹٦) کے کئی روز بعد (۴ اپریل ۱۹۹٦) کو جسٹس سجاد علی شاہ کے ایک اختلافی فیصلہ پر توثیقی دستخط ثبت فرما دئے تھے۔ (جج بولتا ہے۔ خود نوشت جسٹس اجمل میاں صفحہ ۱۹۰) کیا جج صاحب نے اعدلو هو اقرب للتقوى کا ارشادِ قرآنی نہیں سنا تھا؟ یہ لوگ کس منہ سے عادلِ مطلق کے سامنے جائیں گے؟ فیض صاحب کی بات کیا سچی بات ہے بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں!

اس خود نوشت میں ایف آئی اے کے الف لیلوی کرداروں کا بھی ذکر ہے (صفحہ ۲۷۸) رفیق تارڑ صاحب کے صدارت سے اعزاز کے ساتھ رخصت ہونے سے انکار کا بھی تذکرہ ہے (صفحہ ۳۳۰) این ایم خاں کی مشرقی پاکستان میں نیکنامی کا بھی (صفحہ ۳۴۸) مسرور حسن خاں کا بزرگوں کی عزت کرنے کا بھی (صفحہ ۳۴۰)

غرض یہ خود نوشت دوسروں کے اذکار کا پلندہ بن کر رہ گئی ہے۔

اپنے دوست علی کاظم کا ذکر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ جن دنوں وہ گورنر پنجاب کے سکرٹری تھے ہمارے دوست امتیاز جاوید ہر ملاقات پر یہی کہتے تھے ہم لوگ علی کاظم کی گورنر ہاؤس سے رہائی کی ہر

ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر کوئی کوشش بار آور نہیں ہو رہی۔ یہ گورنر ہاؤس اسے لے بیٹھے گا۔ علی کاظم تو
اس لئے بھی یاد رہتے ہیں کہ ان کی ہمشیرہ نغمانہ اختر نغمہ ہمارے دور کی بہترین مقرر تھی اور وہ جو کتابوں
میں ''بات کرتے میں منہ سے پھول جھڑنے'' کا محاورہ ہم نے پڑھا تھا عملاً ہم نے دیکھا کہ نغمانہ
مرحومہ بات کرتی تھی تو اس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ نغمانہ تو فردوس بریں میں جا مقیم ہوئی۔ علی
کاظم خدا جانے کہاں ہے سول سروس تو اس نے سنا ہے ریٹائرمنٹ سے کہیں پہلے چھوڑ دی تھی۔

ایک دو فاش غلطیاں۔ حضرت علی کا قول ہے **عرفت ربی بفسخ العزائم** یعنی میں نے
اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔ آپ نے اس کا ترجمہ ارادے بدلنے کیا ہے جو صریحاً
سنت اللہ (**ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا**) اور لغت کے بھی خلاف ہے۔ (صفحہ ۱۴۴)۔ اسی طرح
اقبال کے فارسی کے ایک شعر کا آپ نے حوالہ دیا ہے وہ بھی ٹھیک نہیں (صفحہ ۳۷۹) اصل شعر ہے۔
گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں۔ ہزار بادہ ءِ ناخوردہ در رگِ تاک است۔ صفحہ ۴۰۹ پر تو آپ
نے ایک مصرعہ نظیری کا اور دوسرا حافظ کا ملا کے ایک شعر کی صورت میں لکھ دیا ہے۔ کسے کہ کشتہ نہ شد از
قبیلہ ءِ ما نیست، نظیری کا مصرعہ ہے اور ثبت است بر جریدہ ءِ عالم دوام ما۔ حافظ کا!

ایم ایم احمد کے باب میں بھی آپ سے تسامح ہوا۔ ایم ایم احمد کا انتقال تو بیشک امریکہ میں ہوا
مگر وہ امریکہ میں سپرد خاک نہیں ہوئے۔ (صفحہ ۳۷۸) ایم ایم احمد تو خاموش طبع تھے اور بقول شخصے
(پی آر) کے فن سے نابلد تھے۔ ورلڈ بنک میں آ گئے تو پاکستان میں ان کا چرچا معدوم ہو گیا۔ پاکستان
میں احمدیوں کے بنیادی حقوق کی تلفی کا سلسلہ تو دیر سے چلا آتا ہے۔ ایک مُلا نے تھانہ میں رپورٹ
درج کروائی کہ جماعت احمدیہ پاکستان کے امیر نے کوئی کام ایسا کیا ہے جو دفعہ ۲۹۳ سی کے تحت اس
ایف آئی آر کی رو سے جو سارے ربوہ شہر کے چالیس ہزار مکینوں کے خلاف تھانہ میں درج ہے قابل
دست اندازی پولیس ہے۔ امیر صاحب نے ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دی جو سیشن جج نے
مسترد کر دی اور امیر محترم صاحبزادہ مرزا مسرور احمد (موجودہ امام جماعت احمدیہ عالمگیر) گرفتار کر
لئے گئے۔ ان دنوں اتفاق سے پنجاب کے آئی جی پولیس میری جان پہچان کے آدمی تھے۔ یونیورسٹی
کی تعلیم کے دوران ہمارے جونیئر ڈیبیٹر ساتھیوں میں ان کا شمار تھا۔ ہم نے سویڈن سے انہیں فیکس

بھیجی اور ''شاباش'' دی کہ جو کام ضیاء الحق جیسا جابر نہ کر سکا وہ تمہاری پولیس نے کر دکھایا۔ ان کا جوابی
فیکس آیا کہ میری پولیس نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے تو امیر صاحب محترم کو یقین دلایا تھا کہ ہم اس ایف
آئی آر پر کوئی کارروائی نہیں کریں گے مگر وہ خود ضمانت کے لئے عدالت میں چلے گئے۔ عدالت نے
ضمانت نہ لی تو ہم کیا کر سکتے تھے؟ دیکھو میری پولیس نے ایم ایم احمد ''مرحوم'' کے بھتیجے کے قاتلوں کو
کس طرح کیفر کردار تک پہنچایا تھا۔ میں نے پھر جواب میں فیکس دیا کہ آپ کی ''پولیس رپورٹ''
درست نہیں۔ ایم ایم احمد اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندہ سلامت موجود ہیں اور جماعت ہائے احمدیہ
امریکہ کے امیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ آئی جی صاحب کا جواب آیا کہ وہ اپنی بے خبری پر
بہت شرمندہ ہیں دراصل مدتوں سے پاکستان میں ان کے بارہ میں نہ پڑھا تھا نہ سنا تھا اس لئے یہ
گستاخی ہو گئی۔ یہ بھی اسی پی آر کی کمی کا شاخسانہ ہے کہ جناب جیون خاں نے بھی انہیں امریکہ میں
دفن کر دیا حالانکہ وہ اپنے وطن پاکستان کی مٹی میں ربوہ میں دفن ہیں۔

سچ اپنا اپنا

ڈاکٹر خالد سہیل نے اپنی کتاب ''سچ اپنا اپنا'' اس نوٹ کے ساتھ مجھے بھجوائی ہے کہ یہ گویا ان کی ''آپ بیتی، پاپ بیتی اور خواب بیتی'' ہے۔ ٹائیٹل پر بھی عنوان کے ذیل میں یادیں تذکرے اور کچھ خواب کے الفاظ درج ہیں۔ یہ کتاب ایک ایسے ماہرِ نفسیات کی کتاب ہے جسے شعر کہنے، افسانے لکھنے اور ادب کی دوسری اصناف میں دلچسپی رکھنے کا شوق ہے مگر ان کے ماہر نفسیات ہونے کا قد و قامت اتنا ہے کہ ادبی حیثیت ان کے قد و قامت کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی معلوم دیتی ہے کہ وہ نوجوانی میں جب ابھی ان کا ادبی ذوق پرورش و تہذیب کے مرحلہ میں تھا وہ ادب کے مراکز سے دور تر آگئے اور عصری ادب سے ان کے رشتہ میں رخنہ پیدا ہو گیا۔ ادب میں جو نو بہ نو تجربات ہو رہے تھے وہ ان کی دسترس میں رہے نہ انہیں ان کے بالاستیعاب مطالعہ کا موقع ملا۔ اور مجھے قوی شبہ ہے کہ انہوں نے اردو کا کلاسیکی ادب پڑھا ہی نہیں۔ کورس کی ایک دو کتابیں شاید ضرور پڑھی ہوں وہ جو کلاسیکی ادب کا رچاؤ ہوتا ہے اس تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ (خدا کرے میرا شبہ ٹھیک نہ ہو)۔

ترک وطن کے بعد کچھ عرصہ تک تو وہ اپنی ڈاکٹری کی تعلیم میں مصروف رہے ان کا ادبی ذوق موجود تو رہا مگر اس کی کما حقہ، آبیاری شاید نہ ہو سکی۔ انہیں ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے مناسب ماحول اور اساتذہ میسر آتے گئے ادبی میدان میں انہیں (ٹورنٹو آنے تک) کوئی رہنمائی دینے والا کوئی میسر نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنی ہر تخلیق کو خود ہی اپنے معیار پر جانچتے اور اپنی مقرر کردہ کسوٹی پر اسے پرکھتے رہے۔ ایسے ماحول میں جو چیز تخلیق ہوتی ہے لکھنے والا اسے جلد سے جلد چھپوانا اور اپنی ادبی حیثیت منوانا چاہتا ہے مگر اس ''کاتا اور لے دوڑی'' کے عمل میں عجلت زیادہ ہوتی ہے معیار کم تر ہوتا ہے۔ اسی

وجہ سے ان کی ادبی تخلیقات کے معیار میں وہ ترفع پیدا نہ ہو سکا جس کا انہیں ارمان تھا اور ہے۔ میں ادب کا استاد ہونے کے ناتے ان کے سچ کا جائزہ نہیں لے رہا اس تجزیہ میں جو کچھ ہے وہ ان کی آپ بیتی پاپ بیتی یا خواب بیتی سے اخذ کردہ ہے۔ ان کے نفسیاتی مضامین تو اعلیٰ درجے کے ہیں ان کے اشعار میرے منہ میں خاک دوسرے درجہ کے ادب تک بھی نہیں پہنچتے تس پر وہ سند کے طور پر بھی اپنے ہی اشعار پیش کرتے ہیں (صفحات ۱۴۳۔۱۷۶۔۱۸۱۔۲۴۲۔۳۲۸۔۳۳۴)۔ اہلِ ادب اس عمل کو کم ذوقی کہتے ہیں۔ اور تو اور کتاب کے آغاز میں حرف اول کے طور پر بھی آپ نے اپنا ہی فرمودہ رقم کیا ہے کہ ''اس دنیا میں اتنے ہی سچ ہیں جتنے انسان'' (سچ اپنا اپنا صفحہ ۳)۔ جمیل مظہری کا خوبصورت شعر یاد آتا ہے بقدرِ پیمانہء تخیل غرور ہر سر میں ہے خودی کا۔ اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا۔ اور اپنے خود فریبی کا شکار ہونے کا تو انہیں اعتراف بھی ہے ''میرے پہلو سے دل بولا کس خود فریبی میں مبتلا ہو؟'' (صفحہ ۲۵۷)

ڈاکٹر خالد سہیل ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ میں ان کے ابا سے تو شناسا نہیں ان کے ماموں عارف عبدالمتین سے میری مدتوں شناسائی رہی اور میں ان کے ادبی مرتبہ کا مداح رہا۔ ان کی ترقی پسندی کبھی ان کی انسان دوستی یا انسان شناسی کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ بزرگ ادیب انتظار حسین نے اپنی خودنوشت ''چراغوں کا دھواں'' میں عارف عبدالمتین کا جو نقشہ پیش کیا وہ میری نگاہ سے بھی گذرا ہے اور میں اس کا عینی گواہ بھی ہوں۔ انتظار صاحب لکھتے ہیں'' عارف عبدالمتین کیا ہیرا آدمی تھے۔ امرتسر کی مٹی مگر رکھ رکھاؤ میں لکھنویوں سے بڑھ کر لکھنوی انتہا قسم کے انقلابی مگر نعرہ لگانے کی طاقت سے عاری۔ لہجہ اتنا دھیما مانو کانا پھوسی کر رہے ہیں پھر یہ کہ انقلاب اپنی جگہ دوستوں سے وضع داری اپنی جگہ۔ میرا ان سے نظریاتی اختلاف بھی چل رہا تھا اور دوستانہ تعلقات بھی چل رہے تھے وقتاً فوقتاً مجھے محبت سے نوٹس دیتے ''انتظار صاحب اگلے مہینے انجمن میں آپ کو افسانہ پڑھنا ہے'' اور میں خوشی خوشی انجمن میں جا کر اپنا نخالص رجعت پسندانہ افسانہ پڑھتا بعد میں جو بھی حال ہوتا مگر ایک شام انہوں نے کہا آؤ چل کر بیٹھتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی پیار محبت کی باتیں کیں دیر کے بعد جھجکتے جھجکتے ہوئے بولے'' انتظار صاحب وہ جو میں نے

انجمن کے لئے آپ کا افسانہ بک کیا تھا وہ پروگرام بدل گیا میں آپ سے شرمندہ ہوں''۔ ''کوئی بات نہیں عارف صاحب''۔ پھر رکتے رکتے بولے ''اور وہ جو جاوید کے لئے میں نے آپ سے افسانہ لیا تھا وہ بھی اب وہاں نہیں چھپ سکے گا۔ برا نہ مانئے گا پارٹی کا فیصلہ ہے''۔ ''کوئی مضائقہ نہیں'' پارٹی نے رجعت پسند ادیبوں کا حقہ پانی بند کر دیا تھا'' (چراغوں کا دھواں صفحہ ۶۰۔۶۱)۔ یہ زمانہ خالد سہیل کے بچپن کا دور ہے، ہم نے عارف صاحب کو چشتیہ ہائی سکول کی سائنس ماسٹری سے ایم اے او کالج میں اسلامیات کی استادی اور اوراق کی ادارت کے زمانہ تک جانا پہچانا اور دیکھا ہے۔ ان کی طبیعت میں کوئی سنک تھی نہ کسی جنون کے آثار ان میں تھے۔ وہ کسی بیماری کے نتیجہ میں مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے وہ سکول ٹیچری سے نکل کر کالج کی پروفیسری تک جانا چاہتے تھے چشتیہ ہائی سکول کے زمانہ میں ان سے گفتگو کے مواقع ملتے رہے وہ سکول ماسٹری سے تنگ آ گئے تھے کیونکہ ہمارے ہاں سکول ماسٹر کو سکول ماسٹر ہی سمجھا جاتا ہے معاشرہ مین اس کا مرتبہ وہ نہیں جو یہاں مغربی معاشرہ میں ہے۔ انہوں نے اسلامیات میں ایم اے کرنے کی ٹھان لی کیونکہ ان کے بقول ان کے خون میں باپ دادا کی طرف سے دین کا خمیر موجود تھا۔ اسی زمانہ میں عارف عبدالمتین نے مجھے بتایا کہ میرے باپ دادا تمہارے ہم عقیدہ تھے مگر میں جوانی ہی میں ترقی پسند ہونے کے ناتے دین سے دور بھاگ گیا۔ اسلامیات میں ایم اے کرنے کے بعد ان کے لیکچروں میں اسلام کی جو تفسیر بیان ہوتی تھی وہ ان کے اپنے اعتراف کے مطابق تنگ نظر ملاؤں کے نکتہ نظر سے بہت دور تھی۔

ان کی عائلی زندگی کے باب میں دو باتیں اہم ہیں ایک تو یہ کہ ان کی شادی بہت دیر سے ہوئی۔ پھر اولاد دیر سے آئی۔ بیٹا ہوا جو باپ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ ہم نے عارف صاحب کو یہ کہتے سنا ہے کہ اس بیٹے کو دیکھتا ہوں تو خدا کے وجود پر میرا ایمان پختہ ہو جاتا ہے۔ جب وہی بیٹا موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان سے چھین لیا تو بیٹے کی اس المناک وفات کے صدمہ نے ان کا دھڑ توڑ دیا۔ وہ گوشہ نشین اور خاموش ہو گئے کالج جانے اور پڑھانے کے علاوہ بہت کم لوگوں سے ان کا ملنا جلنا رہ گیا۔ میں تو جب بھی لاہور میں ان سے ملا وزیر آغا کے ہمراہ ان سے ملا اس لئے کہ سوائے ڈاکٹر وزیر آغا کے وہ کسی اور سے ملتے جلتے ہی نہیں تھے۔ یہ بات میں نے ان کے منہ سے سنی ہے کہ بیٹے کی

وفات کے بعد میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں نفسیات دان اسے ڈپریشن کہتے ہیں اس پر مستزاد ان کی بیماری۔ عارف عبدالمتین کی اسلام پسندی بیماری کے نتیجہ میں وقوع میں نہیں آئی۔ ڈاکٹر خالد سہیل کا تجزیہ یوں ہے کہ ''عارف عبدالمتین کے خیالات نظریات، اعتقادات، نقطہ نظر اور طرز زندگی میں جو اہم تبدیلیاں آئی ہیں ان میں ان کی طویل بیماری نے اہم کردار ادا کیا ہے'' (سچ اپنا اپنا صفحہ ۹۸) فرق صرف تقدیم و تاخیر کا ہے ان میں نظریاتی تبدیلیاں پہلے آئیں بیٹے کی وفات کے صدمہ کی وجہ سے ڈیپریشن اور علالت کا شکار وہ بعد میں ہوئے اور یہ باتیں میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہہ رہا ہوں اور مجھے ڈاکٹر خالد سہیل کے شعبہ میں دخل در معقولات کرنے کا کوئی شوق نہیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر خالد سہیل نے اپنے والد صاحب کی ذہنی علالت کا کھل کر ذکر اور تجزیہ کیا ہے مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اپنی والدہ کی مامتائی محرومیوں کو بھی وہ ذہنی بیماری میں شمار کرتے ہیں۔ اول اول تو اپنی والدہ کی اس مایوسی کا ذکر کرتے ہیں کہ ''میری ماں نے میری طرف دیکھا فور جذبات سے ان کی آنکھیں تر ہو گئیں انہوں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے مجھے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا انہوں نے مجھے دودھ پلانا چاہا تو انہیں ایک بحران کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ میں نے دودھ الٹ دیا ۔۔۔ وہ بہت پریشان ہوئیں ان کے لخت جگر نے جسے انہوں نے مدتوں سوچا تھا اس کے خواب دیکھے تھے نو مہینے اپنی کوکھ میں لئے پھرتی رہی تھیں اس نے ان سے منہ پھیر لیا تھا'' (صفحہ ۱۸) نوزائیدہ بچے کی بیان کردہ یہ باتیں حدیث متواتر کے طور پر دوسروں سے سنی ہوئی یاد ہیں۔ یہ ساری نفسیاتی تشخیص تو مستقبل کے اس ڈاکٹر کی بیان کردہ ہیں جس نے ماں کا دودھ ہی نہیں الٹا ماں کو دائمی جدائی کے کرب سے دوچار رکھا اور یہ کہہ کر ماں کے زخموں پر نمک پاشی بھی کی ماں نے کہا ''میں چاہتی ہوں تمہارے ساتھ کینیڈا چلی جاؤں ۔۔۔ کم از کم روز تمہاری شکل تو دیکھ سکوں گی ۔۔۔ مجھے ساتھ کینیڈا لے چلو ۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ہم دریا کے دو کنارے ہیں'' (صفحہ ۳۸)۔ اس کی وجوہات کی تفصیل تو سچ کے طور پر بیان ہوئی ہے۔ ماں کے ہوتے ان کی آزادانہ زندگی اور کھلم کھلا ڈیٹنگ کا امکان باقی نہ رہتا اور ''زلیخاؤں کی لمبی صف'' (صفحہ ۶۵) سے دوچار نہ ہوتے۔ ''پامسٹری کا چکر چلا کر نوجوان لڑکیوں کو رام کرنے کا امکان باقی نہ رہتا'' (صفحہ ۶۷) ان کی زندگی میں ''شکر کرنے والی راتیں صبر

کرنے والی راتوں سے زیادہ نہ آتیں''۔(صفحہ ۳۳۶) سب سے بڑھ کر یہ کہ رومانوی آزادی کے بعد بدہضمی کا شکار نہ ہوتے'' (صفحہ ۶۱)

خالد سہیل کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہجرت کے کرب سے دوچار نہیں ہوئے۔انہوں نے صرف بہتر تعلیم اور بہتر مستقبل کی خاطر نقل مکانی کی ہے اس لئے وہ اس کرب سے آشنا نہیں جو مجبوراً ہجرت کرنے والوں کے مقدر میں لکھا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی نقل مکانی کو ہجرت بنانے کے لئے اپنی مہربان ماں کے پیار سے فرار کو اپنی مجبوری قرار دیا ہے جو ان کا نفسیاتی مسئلہ تو بن سکتا ہے انہیں ہجرت کا سزاوار نہیں بناتا۔اور یہ ان کا اپنا اعتراف ہے کہ''مجھے تو ہجرت کے بعد سزاؤں سے زیادہ جزائیں ملی ہیں'' (صفحہ ۳۲۸) مہجری ادب کے سلسلہ میں دو تین بار ان کا سویڈن آنا ہؤا۔میں نے اپنے غریب خانہ پر سب مندوبین کی دعوت کی اور اخباری نمائندوں نے کسی مہاجر ادیب کا انٹرویو کرنا چاہا تو ہم سب نے اپنے شہر کے کہنہ مشق صحافی کے سامنے ڈاکٹر خالد سہیل کو انٹرویو دینے کے لئے منتخب کیا۔ان کا وہ انٹرویو اخبار میں چھپا اس صحافی کا تجزیہ یہ تھا اگر سارے مہاجر ادیب ایسی ہی ''خانگی'' مجبوریوں کی وجہ سے مہاجر بنے ہیں تو آپ کا تخلیق کیا ہؤا ادب کبھی عالمی معیار کو نہیں چھو سکے گا۔مجھے علم نہیں کہ اس صحافی اور خالد سہیل کے مابین کیا گفتگو ہوئی کیونکہ میں ان دونوں کو کمرہ میں چھوڑ کر باہر باقی ادباء کے ساتھ آ کر شامل ہو گیا تھا۔جو کچھ چھپا تھا اس سے اکثر ادیب ناخوش ہوئے تھے کیونکہ سویڈن اور ناروے کے بیشتر ادیب اصل مہاجرت سے دوچار ہوئے تھے اور اپنی نظریاتی وابستگی کی بنا پر ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔کلکتہ کے رسالہ ''انشاء'' نے جو مہجری ادب نمبر چھاپا تھا اس کے بارہ میں، بی بی سی سے اس مہجری ادب کانفرنس کو رپورٹ کرنے کے لئے آئے ہوئے عارف وقار نے، کہ وہ بھی بڑے صاف گو آدمی ہیں برملا کہہ دیا تھا کہ انشاء کے اس نمبر میں ایک آدھ مضمون کے سوا باقی سب کچھ دوسرے درجہ کے ادب کے زمرہ میں آتا ہے۔یہ حادثہ اس لئے ہؤا تھا کہ ہم نے ہجرت کے اصل مفہوم کو سامنے نہیں رکھا تھا۔خالد سہیل اور سعید انجم مرحوم کے افسانوں میں وہی فرق ہے جو بہتر مستقبل کی خاطر نقلِ مکانی کرنے والے ادیب اور ہجرت کے کرب سے دوچار ہونے والے ادیب کے مابین ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر شخص سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کی طرح اپنے ماضی سے مکمل انقطاع اختیار کر لے اپنے ماں باپ کو ذہنی مریض جانے۔اپنے عقائد اور اپنے ثقافتی ورثہ کو تج دے اور مکمل طور پر liberated (صفحہ ۶۹) ہو جائے یعنی کوئی مرد بھائی یا شوہر یا بیٹا اپنی ماں یا بہن یا بیوی کے دوسرے مردوں کے ساتھ روابط رکھنے میں حائل نہ ہو۔انہیں اپنے درویشوں کے ڈیرہ کے ساتھیوں پر بہت ناز ہے۔مجھے یقین ہے کہ اگر وہ صرف ایک سوال ان سے پوچھ لیں کہ کیا وہ اپنی بیوی، بیٹی یا بہن کو کسی دوسرے مرد کے ساتھ کھلم کھلا ڈیٹنگ کی اجازت دینے کو تیار ہیں؟ تو مجھے یقین ہے ان کا جواب نفی میں ہوگا۔خود ڈاکٹر سہیل کی بہن جب ان سے پوچھتی ہے کہ''تم کب ذی روح بچے پیدا کرو گے؟'' (صفحہ ۵۳) تو ان کا جواب ایک مسکراہٹ اور خاموشی کے سوا کچھ نہیں کیونکہ یہ خود بھی جانتے ہیں کہ باہر سے یہ کتنے بھی لبریٹڈ ہوں ان کے اندر ایک انسان بیٹھا ہوا ہے جو انسانی جبلتوں کا دشمن نہیں۔

یہ کتاب ان کی پاپ بیتی بھی نہیں کیونکہ ان کے ہاں گناہ کی تعریف ''اخوان الشیاطین'' (صفحہ ۵۷ اور صفحہ ۸۲) کے دائرہ کار میں محدود ہے اور کوئی پاپ پاپ نہیں۔ان کے نزدیک ''شہوت یا محبت پاک یا ناپاک محبت کے تصورات ان ذہنوں کی اختراع ہیں جو حقیقت کی نسبت خیالوں کی دنیا میں اپنا وقت گذار دیتے ہیں'' (صفحہ ۶۴) ان کا اپنا ارشاد یہ ہے کہ''راسپوٹین کے بارہ میں گفتگو کرنا اور جذباتی نہ ہونا بہت مشکل کام ہے'' (صفحہ ۳۱۴)۔

اتفاق یوں ہے کہ احوال الرجال میں جن دوستوں کا ذکر آپ نے کیا ہے ان میں سے پاکستان کی حد تک میں بھی آشنا ہوں۔ان کے تجزیے وقتی ملاقاتوں پر مبنی ہیں اور ایک آدھ ملاقات میں انسان کو سمجھنا جانچنا پرکھنا ممکن نہیں ہوتا۔کشور ناہید اور جاوید شاہین کی خودنوشتیں آ چکی ہیں اس لئے ان کی شخصیات تو الم نشرح ہیں۔ساقی فاروقی کے تتبع میں انہیں اپنی یادوں کو آپ بیتی پاپ بیتی کہنے کا حوصلہ ہؤا مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ساقی کی سی آزادخیالی (جی ہاں آزادخیالی! آزادخیالی اور مادر پدر آزادی میں بعد المشرقین ہے) اور زبان کے دروبست پر مکمل گرفت ڈاکٹر خالد سہیل کو کہاں سے نصیب ہوتی؟

غرض ڈاکٹر خالد سہیل کی یہ کتاب جسے وہ سچ اپنا اپنا کہتے ہیں ان کا اپنا پورا سچ نہیں۔ اگر ان کا سچ پورا سچ ہوتا تو ان کا ''سانحہ ءعرسہ غزل'' اور اس عرصہ میں کہی ہوئی ''عرسہ غزلیں'' ضرور اس سچ کا حصہ ہوتیں۔ ان کو بیان نہ کرنے کی علت ہمیں تو سمجھ نہیں آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر خالد سہیل کسی ذہنی خلش سے دوچار ہیں؟ اور اپنے خود اختیار کردہ طریق پر ازدواج کرنے اور اس پر ناکام ہونے کی خفت کو چھپانا چاہتے ہیں؟ خود ان کے قول کے مطابق ''میرے خیالات غیر روایتی ہیں جن کا انجام ـــــــ'' (صفحہ ۸۵۔۸۶) میں تو روایتی خیالات رکھنے والا آدمی ہوں میں تو ایسی بدشگونی کی باتوں کو بھی قلم پر نہیں لاسکتا۔ اللہ ڈاکٹر خالد سہیل کے ساتھ ہو۔

❁

فلائٹ آف دی فالکن

پچھلے دنوں پاکستانی فضائیہ کے ایک ریٹائرڈ ائیر کموڈور ایس سجاد حیدر کی کتاب Flight of the Falcon چھپ کر سامنے آئی ہے جس میں ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی پاک بھارت جنگوں کے بارہ میں بعض من گھڑت اور فرضی کامیابیوں کامرانیوں کو مسمار کرنے اور ان کی اصل حقیقت کو بیان کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں فوجی فتوحات اور کامرانیوں کے بارہ میں بیان کردہ باتوں کا تجزیہ تو کوئی فوجی مبصر ہی کرسکتا ہے مگر ایک عام قاری کی حیثیت سے اس کتاب کو ائیر کموڈور سجاد حیدر صاحب کی داستان حیات سمجھ کر پڑھتے ہوئے میں نے جو کچھ سمجھا جانا ہے وہ بیان کرتا ہوں اس سے ان کی شخصیت کے دروبست کو سمجھنے میں شاید مدد مل سکے۔

سجاد حیدر صاحب ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ کو پاکستان کی فضائیہ میں شامل ہوئے اور ضیاء الحق کے زمانہ میں ائیر فورس سے فارغ ہوئے۔ آپ کا شمار پاکستان کی فضائیہ کے اچھے جنگ جو ہوابازوں میں ہوتا تھا آپ نے ہندوستان کے ساتھ دونوں جنگوں میں حصہ لیا اور ستارہ ء جرات کا اعزاز حاصل کیا۔ جنگ کے دوران انہیں اور ان کے سکواڈرن ۹۱ کو خود ان کے قول کے مطابق نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئیں ان کی وجہ سے ان کے اندر ایسا احساس برتری پیدا ہو گیا جس کی حدیں احساس کمتری سے جاملتی ہیں۔ ۱۹۷۱ کی جنگ کے بعد حمود الرحمن کمشن کے سامنے پیش ہوئے تو کہتے ہیں'' I made Justice Humoodur Rehman wiser'' (فلائٹ آف دی فیلکن صفحہ ۲۶۰)۔ انگریزی میں تو اس فقرہ کا مطلب جانے کیا ہوگا اردو میں سادہ سا مطلب یہ ہے کہ ''میں نے جسٹس حمود الرحمن کے علم میں بہت اضافہ کیا'' اس ایک فقرہ سے ہی ان کی بے لگام انانیت کا اندازہ لگایا جا

سکتا ہے۔

''ایئرفورس میں شمولیت کی ابتدا ہی میں انہیں اپنے دوستوں ساتھیوں کے ہمراہ دوسروں سے جھگڑنے لڑنے کی جو عادت پڑی تھی'' (صفحہ ۳۷)۔ اس نے اور ان کی میخواری نے ان کی عدم برداشت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ ان کی دوستی دشمنی دونوں انتہاؤں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس وقت کے سکرٹری ایئر بورڈ اور ان کے دوست گروپ کیپٹن ایچ ایچ کریم نے انہیں بتایا کہ ''آپ شدید حسد کا نشانہ بن رہے ہیں'' (صفحہ ۱۹۱) تو پھر یوں ہوا کہ انہیں اپنا ہر افسر اپنا دشمن نظر آنے لگا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی شہرت یہ ہے کہ یہ ''اپنے ماتحتوں سے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتے نہ ہی عدم تعاون کا رویہ برداشت کر سکتے ہیں'' (صفحہ ۲۰۰) مگر خود ان کے افسروں کو شکایت ہے کہ ''تم نے ایک سکواڈرن کمانڈر کو اس کے ونگ کے پائلٹوں کی موجودگی میں گالیاں دیں اور تمہارے سٹیشن کمانڈر کو شکایت ہے کہ تم سینیئرز کے ساتھ گستاخی کرتے اور ان سے اشتعال دلانے والی زبان میں گفتگو کرتے ہو''۔۔۔ ان کا جواب یہ تھا ''میں ان تمام کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں مگر کیا یہ کمزوریاں فضائیہ کے قانون کے مطابق ضابطہء اخلاق کے خلاف ہیں'' (صفحہ ایضاً) حیرت ہے کہ خود تو انہیں اپنے ماتحتوں سے مکمل اطاعت کی توقع ہے اور اپنے افسروں سے ان کا رویہ عدم احترام اور عدم تعاون کا ہے۔

یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کا ہے اور یہ ساری روداد سرگودھا میں ان کے قیام کی ہے کہ ان کے کچھ ساتھی اپنے ایک زخمی پائلٹ کی عیادت کے بہانے نشہ کے عالم میں رات کے وقت پی اے ایف ہسپتال کے میٹرنٹی وارڈ میں پہنچ گئے وہاں میٹرن نے انہیں خوب جھاڑا اور اس غیر شریفانہ رویے پر انہیں سرزنش کی۔ سٹیشن کمانڈر تک یہ بات پہنچی تو یہ ایسا معاملہ تو تھا نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ جب اس حادثہء فاجعہ کی رپورٹ سٹیشن کمانڈر تک پہنچی تو اس نے سب افسروں کو جواب طلبی کے لئے اپنے روبرو طلب کیا۔ اتفاق یوں ہے کہ سجاد حیدر صاحب ان کے ہمراہ بار میں تو موجود تھے مگر ہسپتال نہیں گئے تھے۔ سٹیشن کمانڈر نے ان سے پوچھا تو آپ نے صاف بتا دیا کہ یہ اس گروپ میں شامل نہیں تھے۔ بات رفت گزشت ہوئی مگر آپ نے سٹیشن کمانڈر کے خلاف دل میں گرہ باندھ لی جو اس

سٹیشن کمانڈر کے چیف آف ایئر سٹاف ہو جانے تک قائم رہی اور اس کے ریٹائر ہونے کی خبر سن کر جب تک یہ ''سجدہء شکر بجا نہیں لائے ان کی تسلی نہیں ہوئی'' (صفحہ ۳۵۷)۔ ان کی دشمنی کی دیرپائی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ اونٹ والا کینہ شاید اسی کو کہتے ہیں۔ یہ کتاب ایسی ہی کینہ توزیوں سے بھری پڑی ہے۔

دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی ایک مثال تو ان کا وہ ارشاد ہے جو انہوں نے پولیس والوں کے خلاف استعمال کیا ہے کہ پولیس والے کیا ہیں پولیس تو ''پولیس کی وردی میں احمق دیہاتیوں کے ایک گروہ کے سوا کچھ نہیں'' (صفحہ ۲۷۹)۔ دوسروں کے کام کا کریڈٹ لینے کی عادت بھی آپ کو بہت ہے فلائنگ آفیسر مقصود امیر نے ایف ۸۶ کے ذریعہ انڈیا کا ایک مگ ۲۱ طیارہ مار گرایا لکھتے ہیں ''کسی کو یقین نہیں آیا ہوگا کہ یہ ان دو ہوابازوں میں سے ایک تھا جس کو میں نے ایئر ڈیفنس مشن کی اجازت دی تھی'' (صفحہ ۲۵۴)۔ صدر ایوب سے اپنا ستارہء جرات کا اعزاز لینے گئے تو صدر نے پوچھا ''تم نے دشمن کے کتنے طیارے تباہ کئے؟'' جواب میں کہا ''سر میں نے کوئی طیارہ تباہ نہیں کیا مگر میری رہنمائی میں میرے سکواڈرن نے گیارہ طیارے تباہ کئے'' آگے ان کی انانیت کا اظہار لکھتے ہیں ''میرا جی چاہا صدر سے پوچھوں آپ کو کون سی جنگی کامیابی کے نتیجہ میں ہلالِ جرأت دیا گیا تھا؟'' (تصویر مقابل صفحہ ۳۱۰)۔ پھر ارشاد فرماتے ہیں ''ہم تاریخ کو کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں اور سچے بہادروں کی قدر و توصیف کرنے کی بجائے بدمعاشوں کو بت بنا لیتے ہیں'' (صفحہ ۱۵۱) غالباً اسی لئے آپ نے اپنی ایک ''بدمعاشی'' کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔ بیوی سے علیحدگی ہوئی تو وہ ان کے بیٹے کو لے کر اپنے بھائی کے پاس راولپنڈی چلی گئی آپ نے اپنے بیٹے کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا اور اپنے دوستوں سے مل کر یہ کارنامہ سرانجام دیا اور بیٹے کو اغوا کر کے ڈیرہ بگٹی پہنچا دیا تا کہ دوسروں کی پہنچ سے باہر رہے۔ اس سارے واقعہ میں ان کے دوست جن میں ایک آئی جی پولیس بھی شامل تھے ان کے مددگار رہے اور ''پولیس کو ہدایت کر دی کہ وہ کسی ایسی رپورٹ پر کارروائی نہ کریں جس میں ان کا اور ان کے بیٹے کا نام ہو'' (صفحہ ۱۹۲)۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی نگاہ میں قانون کی کتنی وقعت ہے؟ ان کے اس ''صحت مند'' اثر کے تحت انہی کی سنت کی پیروی میں ان کے سکواڈرن

کے ایک فلائٹ لیفٹیننٹ ارشد سمیع خاں نے بھی زندگی کے ایک حصہ میں اپنے پوتے یا پوتی کو اغوا کیا اور پھر مدتوں قانون کی زد سے بچنے کے لئے در در کی خاک چھانتے پھرے مگر ان کی طرح کامیابی سے دندنانے کا موقعہ انہیں نہ ملا اور بچے کی تولیت سے محروم رہے۔ سید صاحب نے کوئی اچھا اثر اپنے ماتحتوں پر چھوڑا ہوتا تو کیا اچھی بات ہوتی۔

انہیں اپنے سیاسی تعلقات پر بہت گھمنڈ ہے اور جب بھی کسی مشکل کا شکار ہوتے ہیں سیاست دانوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ بگٹی صاحب اور کھر صاحب کی سفارش پر بھٹو صاحب نے انہیں کہا ''جب تک میں اقتدار میں ہوں تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا'' (صفحہ ۲۹۷) چیف آف ایئر سٹاف نے وزیر مملکت برائے دفاع کے احکام ماننے سے انکار کر دیا تو انہیں بھٹو صاحب نے سامنے پیش ہونا پڑا مگر چیف اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس وقت کے چیف ظفر چوہدری نے اپنی خود نوشت میں اس وقوعہ کا ذکر کیا ہے مگر سید صاحب کا خیال ہے کہ ''وہ سب فکشن ہے'' (صفحہ ۲۹۸)۔ سید صاحب لکھتے ہیں ''میں نے رفیع رضا سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ مجھے کسی باہر کے ملک میں بھجوا دیا جائے تا کہ میں چیف کی چیرہ دستی سے دور رہ سکوں۔ رفیع نے کہا مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں اس مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے گا۔ باس نے (بھٹو نے) چیف سے پوچھا تھا کہ اس نے وزیر مملکت برائے دفاع کا حکم کیوں نہیں مانا تو چیف نے اس معاملہ میں اپنے اختیارات کا رونا رویا کہ یہ حکم اس کے اختیارات میں مداخلت ہے مگر ان سے کہا گیا ہے کہ تمہیں کسی مناسب پوسٹ پر لگا دیں'' (صفحہ ۲۹۶)۔ چیف نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ روایت کیا ہے وہ من و عن درج ہے۔ ''۱۹۷۳ کے وسط میں مجھے سکرٹری دفاع نے فون پر کہا کہ وزیر صاحب (مسٹر عزیز احمد نائب وزیر دفاع) فرماتے ہیں کہ فلاں سینئر افسر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پوسٹ کر دیا جائے۔ میرے نزدیک فضائیہ کے افسروں کا تبادلہ کرنا فضائیہ کے اپنے دائرہ اختیار میں شامل تھا اور اس میں وزارت دفاع کی دخل اندازی مناسب نہ تھی ایسا کرنا فضائیہ کے نظم و نسق کو کمزور کرنے اور اس کے سربراہ کے جائز اختیارات پر قدغن لگانے کے مترادف تھا اس لئے میرا یہ فرض تھا کہ ایسا نہ ہونے دوں۔ چنانچہ میں نے سکرٹری دفاع سے کہا کہ میں ان ہدایات پر عمل کرنے سے قاصر ہوں۔ انہیں بہت حیرانی ہوئی اور انہوں نے میرا جواب دہرا کر پوچھا کہ کیا میں نے واقعی

یہی کہا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں میں نے یہی کہا ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ جلد ہی پھر ان کا فون آیا کہ کہ میرا جواب سن کر وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک حکم ہے اس کی تعمیل ایک ہفتے کے اندر مکمل کر کے انہیں مطلع کروں۔ میں نے کہا میرا جواب وہی ہے جو میں پہلے دے چکا ہوں یعنی کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے دائرہ اختیار میں دخل اندازی ہے۔ چند منٹ بعد انہوں نے پھر فون کیا اور کہا وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ معاملے نے سنگین صورت اختیار کر لی ہے اور اس کے متعلق مجھے جلد از جلد صدر صاحب (مسٹر بھٹو) کے روبرو پیش ہونا چاہئیے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ جائز حکم ہے اور میں اس کی فوری تعمیل کروں گا'' (صفحہ ۱۵۸) بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا ''مجھے معلوم نہیں عزیز احمد نے ایسا کیوں کیا ہے میں اسے سمجھا دوں گا اور آپ کو اس معاملہ میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں'' (صفحہ ۱۵۹) میں نے چیف کی روایت کا حوالہ پورا درج کر دیا ہے اس میں فکشن کہاں ہے؟ جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہی بات چیف کہہ رہے ہیں۔ آپ کہیں تو درست چیف کہے تو فکشن؟ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

جس چیف کے خلاف یہ تن من دھن سے لڑ رہے ہیں اور جس کی ہر بات میں انہیں بد نیتی نظر آتی ہے اسی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ چیف نے مجھے بلایا۔ انہی دنوں ان کا بواسیر کا تکلیف دہ اپریشن ہوا تھا مگر وہ اپنے دفتر میں موجود تھے اور اپنی چیف کی سیٹ کی بجائے آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ چیف نے ان سے کہا ''حیدر آپ کا فائٹر پائلٹ کی حیثیت سے ریکارڈ بہت اچھا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کرسی پر (یعنی چیف کی کرسی پر) نہ بیٹھیں مگر بعض ایسی باتیں اور عادتیں ہیں جنہیں آپ کو بدلنا یا چھوڑنا ہوگا۔ آپ کی زندگی کا طور طریق اور آپ کی عادتیں سروس کی سنجیدہ اور معزز روایتوں سے لگا نہیں کھاتیں۔ آپ اپنی شکایات کے ازالہ کے لئے سیاسی روابط سے کام لیتے ہیں'' (صفحہ ۳۰۰) اس دوران آپریشن کے اثرات مابعد کے تحت چیف کا منہ سوکھنے لگا تو انہوں نے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔ سجاد حیدر صاحب اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''ایک معمولی سے گروپ کپتان سے بات کرتے ہوئے چیف کا منہ اس لئے خشک ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے ان کا دل ان سے متفق نہیں تھا'' (صفحہ ایضاً) یعنی انہیں چیف کی نیک نیتی میں بھی بد نیتی نظر آتی تھی اور نفسیات کی اصطلاح میں ایسا نتیجہ

نکالنے کو" بدنیتی اور کج فطرتی" کہتے ہیں۔ میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔

اب پی اے ایف میں آنے والی تبدیلی اور نئے چیف کے تقرر کا ذکر خود ان کی زبان سے سنئے۔ "افضل آغا مجھ سے کہنے لگے ارے لڑکے! پی اے ایف میں کوئی ایسا افسر بھی ہے جو سروس کو اس مشکل سے نکال سکے"؟ میں نے فوراً جواب دیا ائیر کموڈور ذوالفقار علی خاں ہی ایک ایسا افسر ہے جو جو پی اے ایف کو اس نقصان سے اور گرے ہوئے مورال سے بچا سکتا ہے" انہوں نے بتایا کہ یہ سوال وزیر اعظم اور مصطفیٰ کھر کے مابین بھی اٹھا تھا۔۔۔ کچھ ہفتے کے بعد مصطفیٰ کھر نے بھی یہی سوال مجھ سے کیا اور میں نے یہی جواب دیا۔ کھر نے کہا کہ ائیر کموڈور ذوالفقار اور وزیر اعظم کی ملاقات ہونی چاہئیے ۔۔۔ اور یہ ملاقات رسالپور میں ہوئی" (صفحہ ۳۵۲) سجاد حیدر صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ ائیر کموڈور ذوالفقار ان کی کوششوں سے پرموٹ ہوئے اور چیف بنائے گئے۔ جب آپ نے انہیں مبارکباد دینے کو فون کیا تو ان کے" بیٹے نے پوچھا کیا آپ نے خبر سن لی ہے؟ فرمایا ہاں کیونکہ اس میں میرا بھی حصہ ہے" (صفحہ ۳۶۱) مگر حسب توقع نئے چیف کے باب میں بھی ان کے خیالات بدل گئے اور انہیں احساس ہونے لگا کہ "ان کی ترجیحات بھی بدل گئی ہیں اور ان کے گرد خوشامدی اکٹھے ہو گئے ہیں" (صفحہ ۳۶۳)۔ افسوس کہ سجاد حیدر صاحب کو ان کی انا کو تسکین دینے والا چیف پھر بھی میسر نہ آیا۔

واشنگٹن میں ائیر اتاشی بن کر گئے تو وہاں بھی ان کے حاسدوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ شاہ ایران ان کے پیچھے پڑ گئے اور بڑی مشکل سے ان کی جان بچی۔ اب وظیفہ یابی کی زندگی گذار رہے ہیں خدا کرے اپنے اولاد و احفاد میں خوش رہیں اور انہیں اپنے خاندان میں بھی ویسی ہی حاسدانہ کیفیت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اللہ ان کو امان میں رکھے۔ ہاں ائیر مارشل ذوالفقار کی صفحہ تین سو اکسٹھ والی اس نصیحت کو دہرا دینے کیا حرج ہے کہ میاں "اچھی طرح حجامت بنوا کے رکھو"۔ یہی بات ظفر چوہدری نے کہی تھی تو آپ سیخ پا ہو گئے تھے۔ ان کے لینے کے معیار اور ہیں دینے کے اور ہیں۔

❁

قصوروار کون؟

ہمارے کالج کے زمانہ اور ساتھیوں میں سے ایک عزیز دوست میجر ریٹائرڈ عبدالوحید ظفر کی سوانح حیات "قصوروار کون؟ پاکستان شکست وریخت کے دہانے پر" آواز پبلشرز کولون جرمنی کی جانب سے ۲۰۰۹ میں چھپی ہے اور ہماری کتابوں کے پبلشر نیا زمانہ لاہور والوں کی وساطت سے ہمیں پہنچی ہے۔ وفا کی بات کدھر سے چلی کہاں پہنچی!

وحید ظفر کا تعلق مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور کے ایک ملازمت پیشہ زمیندار کاشتکار گھرانے سے ہے جس کے دادا ہجرت کر کے تقسیم ملک سے قبل ہی جھنگ کے نئے آباد ہونے والے علاقہ میں آ کر بس گئے تھے مگر ان کی اولاد ہوشیار پور میں مقیم رہی اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں آئی۔ وحید کے ابا سکول ٹیچر بنے۔ وحید بھی ابا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ٹیچر ہی بنا مگر ۱۹۶۳ میں ملٹری اکیڈمی کاکول پہنچ گیا اور کمشن ملنے پر فوجی افسر بن گیا اور ۱۹۶۵ کی جنگ میں پنجاب رجمنٹ میں شامل ہو کر دفاع پاکستان کی سعادت حاصل کی۔ وحید ظفر کی تعلیم ہماری ہی مادر علمی تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ہوئی اس لئے ان سے کالج کے زمانہ میں تعلق قائم ہؤا وہ اب تک چل رہا ہے۔ پختہ اور مخلص ہم عقیدہ ہونے کا تعلق مستزاد! اس کی طبیعت کے لحاظ سے اس کا فوجی افسر ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس کا استاد ہونا محال سا لگا اچھا ہوا کہ جلد ہی محکمہ تعلیم کو وحید ظفر جیسے سخت جان وسخت کوش استاد سے فراغت نصیب ہوگئی اور وہ اپنے مناسب ماحول میں پہنچ گیا۔ ہمیں یاد ہے اس کے کمشن ملنے تک ہم کالج کے سٹاف پر آ گئے تھے۔ وحید ملنے کو آیا تو جہاں اپنے اساتذہ سے ملا وہاں ہم جیسے پرانے دوستوں سے بھی اسی احترام سے ملا جس کے سزاوار صرف اساتذہ ہوتے ہیں۔

سکتا ہے۔

''ایئر فورس میں شمولیت کی ابتدا ہی میں انہیں اپنے دوستوں ساتھیوں کے ہمراہ دوسروں سے جھگڑنے لڑنے کی جو عادت پڑی تھی'' (صفحہ ۳۷)۔ اس نے اور ان کی میخواری نے ان کی عدم برداشت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ ان کی دوستی دشمنی دونوں انتہاؤں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس وقت کے سکرٹری ایئر بورڈ اور ان کے دوست گروپ کیپٹن ایچ ایچ کریم نے انہیں بتایا کہ ''آپ شدید حسد کا نشانہ بن رہے ہیں'' (صفحہ ۱۹۱) تو پھر یوں ہوا کہ انہیں اپنا ہر افسر اپنا دشمن نظر آنے لگا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی شہرت یہ ہے کہ یہ ''اپنے ماتحتوں سے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی برداشت نہیں کر سکتے نہ ہی عدم تعاون کا رویہ برداشت کر سکتے ہیں'' (صفحہ ۲۰۰) مگر خود ان کے افسروں کو شکایت ہے کہ ''تم نے ایک سکواڈرن کمانڈر کو اس کے ونگ کے پائلٹوں کی موجودگی میں گالیاں دیں اور تمہارے سٹیشن کمانڈر کو شکایت ہے کہ تم سینیئرز کے ساتھ گستاخی کرتے اور ان سے اشتعال دلانے والی زبان میں گفتگو کرتے ہو''۔۔۔ ان کا جواب یہ تھا ''میں ان تمام کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں مگر کیا یہ کمزوریاں فضائیہ کے قانون کے مطابق ضابطہ ءاخلاق کے خلاف ہیں'' (صفحہ ایضاً) حیرت ہے کہ خود تو انہیں اپنے ماتحتوں سے مکمل اطاعت کی توقع ہے اور اپنے افسروں سے ان کا رویہ عدم احترام اور عدم تعاون کا ہے۔

یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کا ہے اور یہ ساری روداد سرگودھا میں ان کے قیام کی ہے کہ ان کے کچھ ساتھی اپنے ایک زخمی پائلٹ کی عیادت کے بہانے نشہ کے عالم میں رات کے وقت پی اے ایف ہسپتال کے میٹرنٹی وارڈ میں پہنچ گئے وہاں میٹرن نے انہیں خوب جھاڑا اور اس غیر شریفانہ رویے پر انہیں سرزنش کی۔ سٹیشن کمانڈر تک یہ بات پہنچی تو یہ ایسا معاملہ تو تھا نہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ جب اس حادثہ فاجعہ کی رپورٹ سٹیشن کمانڈر تک پہنچی تو اس نے سب افسروں کو جواب طلبی کے لئے اپنے روبرو طلب کیا۔ اتفاق یوں ہے کہ سجاد حیدر صاحب ان کے ہمراہ بار میں تو موجود تھے مگر ہسپتال نہیں گئے تھے۔ سٹیشن کمانڈر نے ان سے پوچھا تو آپ نے صاف بتا دیا کہ یہ اس گروپ میں شامل نہیں تھے۔ بات رفت گزشت ہوئی مگر آپ نے سٹیشن کمانڈر کے خلاف دل میں گرہ باندھ لی جو اس

سٹیشن کمانڈر کے چیف آف ایئر سٹاف ہو جانے تک قائم رہی اور اس کے ریٹائر ہونے کی خبر سن کر جب تک یہ ''سجدہ ءشکر بجا نہیں لائے ان کی تسلی نہیں ہوئی'' (صفحہ ۳۵۷)۔ ان کی دشمنی کی دیرپائی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے۔ اونٹ والا کینہ شاید اسی کو کہتے ہیں۔ یہ کتاب ایسی ہی کینہ توزیوں سے بھری پڑی ہے۔

دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی ایک مثال تو ان کا وہ ارشاد ہے جو انہوں نے پولیس والوں کے خلاف استعمال کیا ہے کہ پولیس والے کیا ہیں پولیس تو ''پولیس کی وردی میں احمق دیہاتیوں کے ایک گروہ کے سوا کچھ نہیں'' (صفحہ ۲۷۹)۔ دوسروں کے کام کا کریڈٹ لینے کی عادت بھی آپ کو بہت ہے فلائنگ آفیسر مقصود امیر نے ایف ۸۶ کے ذریعہ انڈیا کا ایک مگ ۲۱ طیارہ مار گرایا لکھتے ہیں ''کسی کو یقین نہیں آیا ہوگا کہ یہ ان دو ہوا بازوں میں سے ایک تھا جس کو میں نے ایئر ڈیفنس مشن کی اجازت دی تھی'' (صفحہ ۲۵۴)۔ صدر ایوب سے اپنا ستارہ ءجرات کا اعزاز لینے گئے تو صدر نے پوچھا ''تم نے دشمن کے کتنے طیارے تباہ کئے؟'' جواب میں کہا ''سر میں نے کوئی طیارہ تباہ نہیں کیا مگر میری رہنمائی میں میرے سکواڈرن نے گیارہ طیارے تباہ کئے'' آگے ان کی انانیت کا اظہار لکھتے ہیں ''میرا جی چاہا صدر سے پوچھوں آپ کو کون سی جنگی کامیابی کے نتیجہ میں ہلالِ جرأت دیا گیا تھا؟'' (تصویر مقابل صفحہ ۳۱۰)۔ پھر ارشاد فرماتے ہیں ''ہم تاریخ کو کلنک کا ٹیکہ سمجھتے ہیں اور سچے بہادروں کی قدر و توصیف کرنے کی بجائے بدمعاشوں کو بت بنا لیتے ہیں'' (صفحہ ۱۵۱) غالباً اسی لئے آپ نے اپنی ایک ''بدمعاشی'' کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔ بیوی سے علیحدگی ہوئی تو وہ ان کے بیٹے کو لے کر اپنے بھائی کے پاس راولپنڈی چلی گئی آپ نے اپنے بیٹے کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا اور اپنے دوستوں سے مل کر یہ کارنامہ سرانجام دیا اور بیٹے کو اغوا کر کے ڈیرہ بگٹی پہنچا دیا تا کہ دوسروں کی پہنچ سے باہر رہے۔ اس سارے واقعہ میں ان کے دوست جن میں ایک آئی جی پولیس بھی شامل تھے ان کے مددگار رہے اور ''پولیس کو ہدایت کر دی کہ وہ کسی ایسی رپورٹ پر کارروائی نہ کریں جس میں ان کا اور ان کے بیٹے کا نام ہو'' (صفحہ ۱۹۲)۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی نگاہ میں قانون کی کتنی وقعت ہے؟ ان کے اس ''صحت مند'' اثر کے تحت انہی کی سنت کی پیروی میں ان کے سکواڈرن

کے ایک فلائٹ لیفٹیننٹ ارشد سمیع خاں نے بھی زندگی کے ایک حصہ میں اپنے پوتے یا پوتی کو اغوا کیا اور پھر مدتوں قانون کی زد سے بچنے کے لئے در در کی خاک چھانتے پھرے مگر ان کی طرح کامیابی سے دندنانے کا موقعہ انہیں نہ ملا اور بچے کی تولیت سے محروم رہے۔ سید صاحب نے کوئی اچھا اثر اپنے ماتحتوں پر چھوڑا ہوتا تو کیا اچھی بات ہوتی۔

انہیں اپنے سیاسی تعلقات پر بہت گھمنڈ ہے اور جب بھی کسی مشکل کا شکار ہوتے ہیں سیاست دانوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ بگٹی صاحب اور کھر صاحب کی سفارش پر بھٹو صاحب نے انہیں کہا ''جب تک میں اقتدار میں ہوں تمہیں کچھ نہیں ہو سکتا'' (صفحہ ۲۹۷) چیف آف ایئر سٹاف نے وزیر مملکت برائے دفاع کے احکام ماننے سے انکار کر دیا تو انہیں بھٹو صاحب نے سامنے پیش ہونا پڑا مگر چیف اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس وقت کے چیف ظفر چوہدری نے اپنی خودنوشت میں اس وقوعہ کا ذکر کیا ہے مگر سید صاحب کا خیال ہے کہ ''وہ سب فکشن ہے'' (صفحہ ۲۹۸)۔ سید صاحب لکھتے ہیں ''میں نے رفیع رضا سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ مجھے کسی باہر کے ملک میں بھجوا دیا جائے تا کہ میں چیف کی چیرہ دستی سے دور رہ سکوں۔ رفیع نے کہا مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں اس مسئلہ کا کوئی حل نکل آئے گا۔ باس نے (بھٹو نے) چیف سے پوچھا تھا کہ اس نے وزیر مملکت برائے دفاع کا حکم کیوں نہیں مانا تو چیف نے اس معاملہ میں اپنے اختیارات کا رونا رویا کہ یہ حکم اس کے اختیارات میں مداخلت ہے مگر ان سے کہا گیا ہے کہ تمہیں کسی مناسب پوسٹ پر لگا دیں'' (صفحہ ۲۹۶)۔ چیف نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ روایت کیا ہے وہ من و عن درج ہے۔ ''۱۹۷۳ کے وسط میں مجھے سکرٹری دفاع نے فون پر کہا کہ وزیر صاحب (مسٹر عزیز احمد نائب وزیر دفاع) فرماتے ہیں کہ فلاں سینئر افسر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پوسٹ کر دیا جائے۔ میرے نزدیک فضائیہ کے افسروں کا تبادلہ کرنا فضائیہ کے اپنے دائرہ اختیار میں شامل تھا اور اس میں وزارت دفاع کی دخل اندازی مناسب نہ تھی ایسا کرنا فضائیہ کے نظم و نسق کو کمزور کرنے اور اس کے سربراہ کے جائز اختیارات پر قدغن لگانے کے مترادف تھا اس لئے میرا یہ فرض تھا کہ ایسا نہ ہونے دوں۔ چنانچہ میں نے سکرٹری دفاع سے کہا کہ میں ان ہدایات پر عمل کرنے سے قاصر ہوں۔ انہیں بہت حیرانی ہوئی اور انہوں نے میرا جواب دہرا کر پوچھا کہ کیا میں نے واقعی

یہی کہا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں میں نے یہی کہا ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ جلد ہی پھر ان کا فون آیا کہ کہ میرا جواب سن کر وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ایک حکم ہے اس کی تعمیل ایک ہفتے کے اندر مکمل کر کے انہیں مطلع کروں۔ میں نے کہا میرا جواب وہی ہے جو میں پہلے دے چکا ہوں یعنی کہ میں اس حکم کی تعمیل نہیں کر سکتا کیونکہ یہ میرے دائرہ اختیار میں دخل اندازی ہے۔ چند منٹ بعد انہوں نے پھر فون کیا اور کہا وزیر صاحب فرماتے ہیں کہ معاملے نے سنگین صورت اختیار کر لی ہے اور اس کے متعلق مجھے جلد از جلد صدر صاحب (مسٹر بھٹو) کے روبرو پیش ہونا چاہئیے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ جائز حکم ہے اور میں اس کی فوری تعمیل کروں گا'' (صفحہ ۱۵۸) بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا ''مجھے معلوم نہیں عزیز احمد نے ایسا کیوں کیا ہے میں اسے سمجھا دوں گا اور آپ کو اس معاملہ میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں'' (صفحہ ۱۵۹) میں نے چیف کی روایت کا حوالہ پورا درج کر دیا ہے اس میں فکشن کہاں ہے؟ جو بات آپ کہہ رہے ہیں وہی بات چیف کہہ رہے ہیں۔ آپ کہیں تو درست چیف کہے تو فکشن؟ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

جس چیف کے خلاف یہ تن من دھن سے لڑ رہے ہیں اور جس کی ہر بات میں انہیں بدنیتی نظر آتی ہے اسی کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ چیف نے مجھے بلایا۔ انہی دنوں ان کا بواسیر کا تکلیف دہ اپریشن ہوا تھا مگر وہ اپنے دفتر میں موجود تھے اور اپنی چیف کی سیٹ کی بجائے آرام کرسی پر بیٹھے تھے۔ چیف نے ان سے کہا ''حیدر آپ کا فائٹر پائلٹ کی حیثیت سے ریکارڈ بہت اچھا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس کرسی پر (یعنی چیف کی کرسی پر) نہ بیٹھیں مگر بعض ایسی باتیں اور عادتیں ہیں جنہیں آپ کو بدلنا یا چھوڑنا ہوگا۔ آپ کی زندگی کا طور طریق اور آپ کی عادتیں سروس کی سنجیدہ اور معزز روایتوں سے لگا نہیں کھاتیں۔ آپ اپنی شکایات کے ازالہ کے لئے سیاسی روابط سے کام لیتے ہیں'' (صفحہ ۳۰۰) اس دوران آپریشن کے اثرات مابعد کے تحت چیف کا منہ سوکھنے لگا تو انہوں نے پانی کا ایک گھونٹ لیا۔ سجاد حیدر صاحب اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''ایک معمولی سے گروپ کپٹن سے بات کرتے ہوئے چیف کا منہ اس لئے خشک ہو رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے ان کا دل ان سے متفق نہیں تھا'' (صفحہ ایضاً) یعنی انہیں چیف کی نیک نیتی میں بھی بدنیتی نظر آتی تھی اور نفسیات کی اصطلاح میں ایسا نتیجہ

نکالنے کو ''بدنیتی اور کج فطرتی'' کہتے ہیں۔ میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔

اب پی اے ایف میں آنے والی تبدیلی اور نئے چیف کے تقرر کا ذکر خود ان کی زبان سے سنئے۔ ''فضل آغا مجھ سے کہنے لگے ارے لڑکے! پی اے ایف میں کوئی ایسا افسر بھی ہے جو سروس کو اس مشکل سے نکال سکے''؟ میں نے فوراً جواب دیا ائیر کموڈور ذوالفقار علی خاں ہی ایک ایسا افسر ہے جو جو پی اے ایف کو اس نقصان سے اور گرے ہوئے مورال سے بچا سکتا ہے'' انہوں نے بتایا کہ یہ سوال وزیر اعظم اور مصطفیٰ کھر کے مابین بھی اٹھا تھا۔۔۔ کچھ ہفتے کے بعد مصطفیٰ کھر نے بھی یہی سوال مجھ سے کیا اور میں نے یہی جواب دیا۔ کھر نے کہا کہ ائیر کموڈور ذوالفقار اور وزیر اعظم کی ملاقات ہونی چاہئے۔۔۔ اور یہ ملاقات رسالپور میں ہوئی'' (صفحہ ۳۵۲) سجاد حیدر صاحب یہ بتا رہے ہیں کہ ائیر کموڈور ذوالفقار ان کی کوششوں سے پروموٹ ہوئے اور چیف بنائے گئے۔ جب آپ نے انہیں مبارکباد دینے کو فون کیا تو ان کے ''بیٹے نے پوچھا کیا آپ نے خبر سن لی ہے؟ فرمایا ہاں کیونکہ اس میں میرا بھی حصہ ہے'' (صفحہ ۳۶۱) مگر حسب توقع نئے چیف کے باب میں بھی ان کے خیالات بدل گئے اور انہیں احساس ہونے لگا کہ ''ان کی ترجیحات بھی بدل گئی ہیں اور ان کے گرد خوشامدی اکٹھے ہو گئے ہیں'' (صفحہ ۳۶۳)۔ افسوس کہ سجاد حیدر صاحب کو ان کی انا کو تسکین دینے والا چیف پھر بھی میسر نہ آیا۔

واشنگٹن میں ائیر اتاشی بن کر گئے تو وہاں بھی ان کے حاسدوں نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ شاہ ایران ان کے پیچھے پڑ گئے اور بڑی مشکل سے ان کی جان بچی۔ اب وظیفہ یابی کی زندگی گذار رہے ہیں خدا کرے اپنے اولاد و احفاد میں خوش رہیں اور انہیں اپنے خاندان میں بھی ویسی ہی حاسدانہ کیفیت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اللہ ان کو امان میں رکھے۔ ہاں ائیر مارشل ذوالفقار کی صفحہ تین سو اکسٹھ والی اس نصیحت کو دہرا دینے کیا حرج ہے کہ میاں ''اچھی طرح حجامت بنوا کے رکھو''۔ یہی بات ظفر چوہدری نے کہی تھی تو آپ سیخ پا ہو گئے تھے۔ ان کے لینے کے معیار اور ہیں دینے کے اور ہیں۔

❀

قصور وار کون؟

ہمارے کالج کے زمانہ اور ساتھیوں میں سے ایک عزیز دوست میجر ریٹائرڈ عبدالوحید ظفر کی سوانح حیات ''قصور وار کون؟ پاکستان شکست و ریخت کے دہانے پر'' آواز پبلشرز کولون جرمنی کی جانب سے ۲۰۰۹ میں چھپی ہے اور ہماری کتابوں کے پبلشر نیاز زمانہ لاہور والوں کی وساطت سے ہمیں پہنچی ہے۔ وفا کی بات کدھر سے چلی کہاں پہنچی!

وحید ظفر کا تعلق مشرقی پنجاب کے شہر ہوشیار پور کے ایک ملازمت پیشہ زمیندار کاشتکار گھرانے سے ہے: جس کے دادا ہجرت کر کے تقسیم ملک سے قبل ہی جھنگ کے نئے آباد ہونے والے علاقہ میں آ کر بس گئے تھے مگر ان کی اولاد ہوشیار پور میں مقیم رہی اور قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں آئی۔ وحید کے ابا سکول ٹیچر بنے۔ وحید بھی ابا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ٹیچر ہی بنا مگر ۱۹۶۳ میں ملٹری اکیڈمی کاکول پہنچ گیا اور کمشن ملنے پر فوجی افسر بن گیا اور ۱۹۶۵ کی جنگ میں پنجاب رجمنٹ میں شامل ہو کر دفاع پاکستان کی سعادت حاصل کی۔ وحید ظفر کی تعلیم ہماری ہی مادر علمی تعلیم الاسلام ہائی سکول اور تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں ہوئی اس لئے ان سے کالج کے زمانہ میں تعلق قائم ہوا وہ اب تک چل رہا ہے۔ پختہ اور مخلص ہم عقیدہ ہونے کا تعلق مستزاد! اس کی طبیعت کے لحاظ سے اس کا فوجی افسر ہونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اس کا استاد ہونا محال سا لگا اچھا ہوا کہ جلد ہی محکمہ تعلیم کو وحید ظفر جیسے سخت جان و سخت کوش استاد سے فراغت نصیب ہوگئی اور وہ اپنے مناسب ماحول میں پہنچ گیا۔ ہمیں یاد ہے اس کے کمشن ملنے تک ہم کالج کے سٹاف پر آ گئے تھے۔ وحید ملنے کو آیا تو جہاں اپنے اساتذہ سے ملا وہاں ہم جیسے پرانے دوستوں سے بھی اسی احترام سے ملا جس کے سزاوار صرف اساتذہ ہوتے ہیں۔

ہمارے اور بہت شاگرد فوج میں گئے مگر وحید شاگرد نہ ہونے کے باوجود ہمیں استادوں جیسی عزت دیتا رہا۔ یہ اس کی سلامت طبعی بھی ہے اور ہماری خوش نصیبی بھی اور ان دونوں کا سبب تعلیم الاسلام کالج کا ماحول ہے اس کالج کا پڑھا ہوا ہر شخص کالج میں پڑھانے والے کو ہمیشہ استاد ہی سمجھتا ہے اور یہی ہمارے اسلاف کی روایت تھی۔

وحید ظفر ایک بار سویڈن میں ہمیں ملنے آیا۔ وہ اپنی کسی بنگالی بہن کی دعوت پر اسے ملنے کو سویڈن آیا تھا جو اتفاق سے ہمارے ہی شہر اپسالا میں رہتی تھی۔ اپسالا پہنچتے ہی وحید نے ہمیں فون کیا اور اگلے روز ملاقات ہوگئی۔ ہم اس کی بنگالی بہن کے خاندان والوں سے بھی ملے۔ سویڈن میں بسنے والے جتنے بنگالی خاندانوں سے ہماری ملاقات ہوتی رہی ہمیں یہی محسوس ہوتا رہا کہ ان کے دل میں پاکستان اور پاکستانیوں کے لئے بے پناہ نفرت ہے۔ کسی کا باپ پاکستانی فوج کے مظالم کا نشانہ بنا تھا کسی کا بھائی کسی کا بیٹا۔ ایک دو بنگالی عورتیں بھی ان مہاجروں میں تھیں جو جنسی جبر کا شکار ہوئی تھیں۔ سو جب وحید نے اپسالا میں ہمیں بتایا کہ وہ اپنے کسی بنگالی رفیق کار قیصر کی بہن کی دعوت پر اپسالا آیا ہے تو ہمیں یک گونہ حیرت ہوئی۔ قیصر کی بہن وحید بھائی کے نام پر بچھی جاتی تھی۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ وحید نے اپنی جماعتی تربیت کو فراموش نہیں کیا تھا اور ''Love for All Hatred for None'' کو حرز جاں بنائے رکھا تھا۔ اب اس کتاب میں مشرقی پاکستان میں اس کے قیام اور قیصر کے ماں باپ بہن بھائیوں سے اس کے گہرے پرخلوص تعلقات کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور یہ بات پڑھ کر تو ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ وحید بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ۱۹۹۹ میں اپنی بیوی کے ساتھ قیصر اور اس کے خاندان کو تلاش کرتا ہوا بنگلہ دیش بھی گیا تھا اور اپنے اچھے دنوں کے محسنوں سے ملا تھا۔ الحمد للہ کہ وہ لوگ سوائے قیصر کے باپ کے جو انتقال کر چکے تھے محفوظ تھے مگر پرو پاکستان ہونے کی وجہ سے اب نئے حکمرانوں کے شکوک و شبہات کی زد میں تھے۔ (صفحہ ۱۷۳) ایک خودنوشت سوانح حیات کا ایسا نام دیکھ کر دوسروں کو حیرت ہوتی ہوگی ہمیں نہیں ہوئی کیونکہ اگر اس کی سوانح حیات میں سے اس کی بنگالی زندگی کا رخ منہا کر دیا جائے تو صرف ایک سخت جان اور سخت کوش فوجی افسر باقی رہ جاتا ہے وحید ظفر غائب ہو جاتا ہے۔

شیخ مجیب الرحمن، اگرتلہ سازش کے دوران ان کی حراست میں تھے۔ اس کی تفصیلات پہلی بار کسی موقعہ پر موجود حاضر افسر نے لکھی ہیں جو بڑی دلچسپ ہیں اور عبرت انگیز بھی اور چشم کشا بھی!''

پچھلی رات اگرتلہ سازش کیس میں ملوث کسی وی وی آئی پی کو گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔۔۔۔ کیپٹن غفور نے اپنا پستول اور اپنا ایمونیشن میرے حوالہ کرتے ہوئے سرگوشی سے کہا کہ اس صوفے پر بیٹھ جاؤ اور بستر پر منہ سر لپیٹ کر لیٹے ہوئے آدمی کی نگرانی کرو۔ اور اگلے حکم کا انتظار کرو۔۔۔۔ جونہی وہ کمرہ سے باہر نکلا (اس لیٹے ہوئے آدمی نے) منہ سے کمبل ہٹا کر انگریزی میں سوال کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا Do you know me? میرا موڈ چونکہ خراب تھا میں نے فوراً جھنجلا کر جواباً کہا No sir! I don't know you! اس پر وہ دوبارہ کمبل منہ پر لے کر سو گیا۔ میں پاس پڑے صوفہ پر بیٹھ کر بے اعتنائی سے نوٹ بک میں اس قیدی کے بارہ میں دی گئی ہدایات پڑھ کر سوچنے لگا کہ یہ کون اتنا اہم قیدی ہوسکتا ہے جس پر پہرے کے لئے ایک مسلح فوجی افسر کی ضرورت آن پڑی ہے۔۔۔۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب وہ شخص جاگا اور اٹھ کر چند لمحوں کے لئے چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اٹھ کر ڈریسنگ روم کے ساتھ باتھ روم میں چلا گیا۔ پہلی نظر میں دیکھنے سے ایسا محسوس ہوا کہ چہرہ تو جانا پہچانا ہے۔ میں دماغ پر زور دے کر سوچنے لگا خدایا یہ کون شخص ہوسکتا ہے؟ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ وہ ڈریسنگ روم سے واپس کمرے میں آ کر چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اور سموکنگ پائپ کھول کر سلائی سے صاف کرنے لگا۔ پہلے وہ بازو والی بنیان اور لنگی پہنے ہوئے تھا اب اس نے صاف ستھرا کرتا اور لنگی پہنی ہوئی تھی۔ گول بارعب چہرہ کشادہ ماتھا بڑی بڑی بارعب آنکھیں۔ لمبے لمبے سیدھے سیاہ بال جنہیں پیچھے کی طرف کنگھی کر کے سنوارا ہوا تھا دراز قد مضبوط جسم ایک بارعب شخصیت تھی۔ میں نے دماغ پر زور دیا۔ یا اللہ! یہ تو عوامی لیگ کا سربراہ شیخ مجیب الرحمن لگتا ہے۔ اس تمام عرصے میں نہ اس نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے۔ بلا اختیار میں نے بھی اس سے اسی طرح انگریزی میں سوال کر دیا جیسے اس نے مجھ سے کیا تھا۔ Are you Sheikh Mujib sir? اس نے مسکراتے ہوئے چہرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا Yes. اور ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ شیخ صاحب نے اپنی پائپ سلگائی ایک دو کش لگائے اور مجھ سے مخاطب ہو

کر میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتایا انہوں نے پھر پوچھا آیا میں شادی شدہ ہوں؟ میں نے کہا ہاں میں شادی شدہ ہوں۔ وہ پھر کوئی بات کرنے لگے لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی بات کرتے میں نے پھر پہلے سے فوجی انداز میں جواب دیا Sorry sir! I am not allowed to discuss with you any thing at all. اس پر شیخ صاحب کو جوش آگیا ان کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ کڑک کر بولے You may not discuss any thing with me. I am sure you don't have the order to stop me talking. I will talk, you may listen. اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اتنے میں بیرا ناشتہ لے کر آگیا۔ شیخ صاحب ناشتہ کرنے لگے اور بات آئی گئی ہوگئی"۔

"اب شیخ صاحب بولتے تھے اور میں سنتا تھا۔ وہ اگرتلہ سازش کے بارہ میں بتانے لگے اور بڑے رنج و غم سے کہہ رہے تھے کہ اب ہمارے ملک کی سیاست اتنی گندی ہوگئی ہے کہ حکمران اپنے مخالفین کو ہٹانے کے لئے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے میں پاکستان کے بانیوں میں سے ہوں۔ اور ہم نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان کی خاطر اپنی تعلیم کی قربانی دی اور ایک سٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے مسلم سٹوڈنٹس کو حصول پاکستان کی جدوجہد کے لئے منظم کیا انہوں نے بتایا کہ جن دنوں حصول پاکستان کی تحریک زوروں پر تھی اس وقت وہ بی اے کے طالب علم تھے لیکن جدوجہد پاکستان میں حصہ لینے کی وجہ سے بی اے کا امتحان نہ دے سکے۔ ساری عمر انڈر گریجوایٹ ہی رہے۔ قریہ قریہ جا کر لوگوں کو مسلم لیگ کے لئے ووٹ ڈالنے کے لئے تیار کیا۔ اور آخرِ کار بنگال میں محض ہماری کوششوں سے مسلم لیگ نے کانگریس کو شکست دی۔ اب جب پاکستان جوان ہو گیا ہے تو ہم غدار ہو گئے۔ اس لئے کہ ہم نہ صرف بنگالیوں کے بلکہ سب کے حق کی بات کرتے ہیں۔" (صفحہ ۷۳۔۷۴)۔

"پہلے دو ہفتوں میں شیخ صاحب پر (کورٹ مارشل) کے نام سے اتنا خوف طاری تھا کہ ان کا وزن ۱۵ پونڈ کم ہو گیا۔ پہلے ہفتے کے خوف و ہراس کی وجہ سے وہ سیاست سے دست بردار ہونے کو بھی تیار تھے۔ انہوں نے جنرل مظفر الدین کو جو اس وقت مشرقی پاکستان کے جی او سی تھے فیلڈ مارشل

ایوب خاں کے نام تحریری درخواست دی کہ اگر انہیں اس کیس میں ملوث نہ کیا جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے سیاست سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں۔ یہ خط شیخ صاحب نے پہلے مجھے پڑھ کر سنایا۔ سارے خط کا متن یاد رکھنا تو مشکل ہے لیکن شیخ صاحب نے بڑے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انہیں یہ امید نہ تھی انہیں اتنے گھٹیا ہتھکنڈوں سے ذلیل و خوار کیا جائے گا۔۔۔ انہیں یقین ہو گیا ہے کہ اب ان کے لئے پاکستان کی سیاست میں نہ تو کوئی جگہ ہے اور نہ ہی انہیں خود کوئی دلچسپی۔ Enough is enough اگر انہیں اس کیس میں ملوث نہ کیا جائے تو وہ ساری عمر کے لئے سیاست سے دستبردار ہونے کا وعدہ کرتے ہیں۔ یہ خط ایوب خاں کے سپیشل ایلچی آئی ایس آئی کے بریگیڈئیر محمد اکبر خاں کے حوالے شیخ صاحب نے میری ڈیوٹی کے دوران ہی کیا یہ وہی اکبر خاں تھے جو بھٹو دور میں لفٹیننٹ جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے۔۔۔ چونکہ اگرتلہ سازش آئی ایس آئی کی دریافت تھی اور سارے کیس کی بنیاد ہی شیخ مجیب کی شخصیت اور اس کے سیاسی عزائم پر رکھی گئی تھی اس لئے یحیٰی نے شیخ صاحب کا خط ایوب خاں تک پہنچنے ہی نہیں دیا"۔۔۔ "۱۹ جون ۱۹۶۸ کو شیخ مجیب اور ۳۵ ریٹائرڈ اور حاضر سروس سول اور فوجی ملازمین پر سپیشل ٹریبونل میں (جس کے صدر جسٹس ایس اے رحمٰن اور دو ارکان ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جج تھے) پاکستان کے خلاف سازش کا مقدمہ شروع ہوا۔۔۔" (ایک روز) میں نے کہا "شیخ صاحب دیکھیں میں اتنے عرصہ سے سن رہا ہوں کہ آپ کے خلاف سازش ہے آپ کو بلاوجہ اس مقدمہ میں شامل کیا گیا ہے۔ آپ مجھے بتائیں کہ یہ کیا سب کچھ جھوٹ ہے؟ شیخ صاحب یکدم خاموش ہو کر مجھے گھور کر دیکھنے لگے۔ اور پھر بولے: "نہیں یہ سب جھوٹ نہیں۔ یہ مقدمہ درست ہے لیکن میں اس میں ملوث نہیں۔ یہ فوج اور سول کے بنگالی ملازِمین کی کارروائی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے آپ کو سروس کے دوران معتوب سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی مجنونانہ حرکت ہے۔ کیا یہ سٹوارٹ ریٹائرڈ نائب صوبیدار یا سارجنٹ ملک کا تختہ الٹ سکتے ہیں؟ میں ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کا سربراہ ہوں میں ان چھوٹی افسروں اور نائب صوبیداروں یا کپتانوں کے ساتھ مل کر ملک پر قبضہ کروں گا۔ میں نے ایسا کرنا ہوتا تو بنگالی جرنیلوں کو ساتھ ملاتا اور میری پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر میرے ساتھ ہوتے میں اپنی پارٹی کے لیڈروں سے یہ کام کرواتا میرے سوا عوامی لیگ کا اور کوئی لیڈر

کیوں نہیں پکڑا؟'' (صفحہ۷۹) اس کے بعد کے حالات کا سب کو علم ہے کس طرح شیخ مجیب رہا کئے گئے اور گول میز کانفرنس ہوئی اور پھر ملک کی تاریخ کا نیا باب رقم ہونا شروع ہو گیا۔ اس قید کے دوران ان کے ساتھ ان کا گہرا تعلق بن گیا تھا بلکہ وحید کا تبادلہ ہوا تو شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کے ایک دوست سے کہا کہ وہ وحید کی دعوت کرنا چاہتے ہیں مگر ایسا کرنے سے ان کے فوجی کیریئر کو سخت دھچکا لگنے کا خطرہ ہے اس لئے وہ ہم عقیدہ دوست ان کو دعوت پر بلائیں اس میں شیخ مجیب الرحمٰن شریک ہونگے۔ چنانچہ اس دوست نے وحید کی الوداعی دعوت کی اور شیخ مجیب اس میں شریک ہوئے اور محبت سے وحید کو رخصت کیا'' (صفحہ۹۳)

بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھٹو صاحب نے ۱۹۷۲ میں ''ازرہِ کرم'' شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیا تو انہیں لندن لے جانے والے دوست ہمارے دوست ائیر مارشل ظفر احمد چوہدری تھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں یہ روداد بیان کی ہے۔ ان کی خودنوشت کا یہ حصہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ ائیر مارشل اس سفر میں شیخ مجیب الرحمٰن کو خود لے کر گئے تھے'' آدھی رات کے کچھ ہی بعد مسٹر بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن اور کمال حسین کو لے کر جہاز میں داخل ہوئے۔ پھر ہم نے ایک حیران کن اور جذباتی سین دیکھا۔ بھٹو اور مجیب نے ایک لمبا معانقہ کیا اور پھر مجیب الرحمٰن نے مسٹر بھٹو کے دونوں رخساروں پر بوسہ دیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ اور وہ سخت ہیجان میں مبتلا نظر آتے تھے۔ ہم قریب کھڑے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ گویا ہم تاریخ رقم ہوتی دیکھ رہے ہیں۔ جونہی مسٹر بھٹو جہاز سے اترے ہم روانہ ہوئے۔ موسم کے لحاظ سے ہمیں امید تھی کہ سیدھا لندن پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔۔۔۔ روانگی کے بعد جہاز میں خاصہ تناؤ محسوس ہونے لگا۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہمارے ''مہمان'' ہم سے بات بھی کرنا چاہیں گے یا نہیں۔ مجیب الرحمٰن تو کمال حسین صاحب کی بیگم اور بچوں سے حال احوال دریافت کرنے لگے اور میں نے کمال حسین سے کچھ رسمی باتیں کیں۔ پھر کھانا پیش کیا گیا اور جلد ہی فضا بے تکلف ہو گئی۔ میں شیخ صاحب کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنا تعارف کروایا۔ انہوں نے نہایت گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔ پھر شیخ مجیب الرحمٰن صاحب نے انتہائی جذباتی اور ڈرامائی انداز میں باتیں شروع کر دیں۔ ان کے ارشادات کچھ اس طرح تھے ''یحیٰی خاں

نے ملک تباہ کر دیا آپ اندازہ کریں نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ ہندوستانی ڈھاکے میں گھس آئے ہیں۔ اگر ہمارے پاس ایک ضلع بھی بچا ہوتا تو میں لوگوں کو منظم کر کے ہندوستانیوں کو مار بھگاتا مگر اب سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی میں کام کس سرے سے شروع کروں۔ خیر مجھے واپس بنگال پہنچ لینے دیں کچھ نہ کچھ صورت ضرور نکال لوں گا۔ اور سب سے پہلے ہندوستانیوں کو نکال باہر کروں گا۔۔۔۔ باقی باتیں بعد میں دیکھی جائیں گی۔ دنیا جانتی ہے میں بنگالیوں کا واحد لیڈر ہوں۔ اور میرے لوگ ہمیشہ میرے پیچھے چلیں گے اور میں جہاں چاہوں انہیں لے جا سکتا ہوں۔۔۔۔ فکر مت کرو میں اکٹھا رہنے کی کوئی راہ نکال لوں گا۔ دیکھئے اب مجھے ہندوستانیوں سے کچھ میٹھی باتیں بھی کرنا پڑیں گی لیکن یہ میرے دل کی آواز نہیں ہوگی''۔۔ ''ہمیں سمجھ نہیں آتی تھی کہ ان کی باتوں کو کس حد تک قبول کریں۔ وہ خود کو ایک عظیم لیڈر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی ہر بات اپنی ذات سے شروع ہو کر وہیں واپس آ جاتی۔ وہ ایسے بات کرتے جیسے کسی ڈرامہ میں مکالمے بول رہے ہوں وہ کبھی لمبا سانس کھینچتے کبھی سر کو جنبش دیتے کبھی بازو پھیلاتے اور کبھی آنکھیں ملنے لگتے۔ جیسے کسی سیاسی مجمعے کو متاثر کرنے کی کوشش میں ہوں۔ ان کی بات سطحی اور پوچ ہوتی اور متانت اور گہرائی سے یکسر مبرا۔ وہ خود کو اعلیٰ سیاست دان سمجھ رہے تھے لیکن ان کا انداز اور ان کی سوچ ایک ادنیٰ شعبدہ باز کی سی تھی۔ شاید انہیں پورا یقین بھی نہیں تھا کہ ہم انہیں واقعی لندن پہنچا دیں گے۔ اور اس لئے ضروری تھا کہ وہ ہماری خوشنودی حاصل کریں مبادا ہم انہیں کہیں اور پہنچا دیں''۔۔۔ ہم کوئی چھ بجے لندن پہنچے۔ ہم سب وی آئی پی روم میں آ گئے۔۔۔۔ محمود ہارون ان سے ملنے آ گئے۔ شیخ صاحب نے نہایت گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اب ان کے رفقا کام سنبھال لیں گے اور ہماری مدد کی ضرورت نہیں ہوگی۔۔۔۔ جیسے ہم شہر کی طرف جا رہے تھے تو کار کے ریڈیو پر بی بی سی کہہ رہا تھا کہ شیخ مجیب اچانک لندن پہنچ گئے ہیں۔۔۔ دو ایک روز بعد وہ برطانوی فضائیہ کے ایک جہاز میں دہلی پہنچے جہاں اندرا گاندھی نے ان کا استقبال کیا اور انہوں نے ایک جلسہ سے بھی خطاب کیا پھر وہ ڈھاکہ پہنچے اور بنگلہ دیش کی باگ ڈور سنبھالی''۔

(فضائیہ میں گذرے ماہ و سال جستہ جستہ از صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۱)

یہاں جنرل خالد محمود عارف کی کتاب ''working with Zia''یاد آ رہی ہے کیونکہ عجیب ،اندرا گاندھی، بھٹو اور ضیاء الحق کے انجام میں عجیب معنوی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اندرا گاندھی کے ہولناک قتل کی خبر آئی تو ضیاء الحق نے کہا تھا ''اللہ پاک نے پاکستان کو نقصان پہنچانے والے تمام کرداروں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا ہے۔'' اس وقت تین کردار کیفر کردار تک پہنچے تھے پاکستان کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دینے والے چوتھے کردار کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہیبت ناک تجلی کا نشانہ بنا کر اور زیادہ عبرت ناک بنا دیا۔

میجر وحید ظفر کی کتاب اپنے عقائد کی بنا پر زیادتیوں کا نشانہ بننے والے ایک حوصلہ مند فوجی افسر کی داستان ہے جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پینا گوارا کر لیا مگر اپنے عقائد پر سمجھوتا نہیں کیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس کی قربانیوں کو رائیگاں بھی نہیں جانے دیا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوشحال مطمئن اور پرسکون زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس کتاب میں اپنے مخلص اور پرانے مبلغ دوست مولانا محمد اجمل شاہد کا ذکر پڑھ کر بھی خوشی ہوئی کہ نائیجیریا میں جب وحید مشکلات کا شکار ہوا اس وقت اجمل شاہد وہاں رئیس التبلیغ تھے انہوں نے ایک ہمدرد اور سچے مربی سرپرست کی طرح وحید کی دستگیری کی اور انہیں ملازمت دلوا دی۔ اور یہی ایک مربی اور مبلغ کی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنے دائرہ میں رہنے والے کسی ہم عقیدہ کو بے سہارا محسوس نہ ہونے دے۔ یہ الگ بات ہے کہ نائیجیریا وحید کو راس نہیں آیا اور مولانا اجمل شاہد بھی نائیجیریا کی بجائے امریکہ میں بیٹھے ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔ ہمیں یاد ہے کینیڈا کے ایک جلسہ سالانہ کے موقع پر مولانا اجمل شاہد اور ہم ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک نائیجیرین دوست مولانا اجمل کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا آیا اور ان سے لپٹ کر بغل گیر ہوا اور زار و قطار رونے لگا۔ بار بار مولانا کو سینہ سے لگاتا اور یہی کہتا رہا کہ مولانا مدتوں بعد آپ کو دیکھ کر اور آپ سے مل کر سیری نہیں ہو رہی۔ میں کیا کروں؟ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنے خلوص کی جزا دے اور مولانا اجمل شاہد کی خدمات کو بھی قبول فرمائے۔

اس کتاب میں بنگال کا ذکر جہاں تہاں موجود ہے اس لئے یہ بتا ہی دوں کہ ہمارے یہی

دوست مولانا اجمل کچھ عرصہ مشرقی پاکستان میں بھی مبلغ رہے۔ وہاں کے دوست انہیں مولانا ازمل کہہ کر پکارتے تھے۔ واپس آئے تو ہم نے انہیں چڑانے کے لئے انہیں ازمل ازمل کہنا شروع کر دیا۔ مولانا زچ ہو گئے ایک روز کہنے لگے اگر تم مجھے ازمل کہنا ترک نہیں کرو گے تو میں تمہارے خسر مولانا محمد احمد جلیل صاحب کا نام بنگالی لہجہ میں لینا شروع کر دوں گا۔ اس دھمکی نے ہمیں خاموش کر دیا۔

وحید کی اس نیم فوجی اور نیم سیاسی سوانح عمری نے ہمیں بہت سی باتیں یاد دلا دی ہیں اور یہی ایک اچھی خودنوشت کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کی یادوں کو مہمیز کرتی ہے۔

امام کی بیٹی

پچھلے دنوں شمالی انگلستان میں بسنے والے کچھ پاکستانی مسلمانوں کے ایک خودساختہ ''امام'' کی باغی بیٹی حنہ شاہ کی خودنوشت ''امام کی بیٹی'' The Imam's Daughter کے عنوان سے ''زاندروان پبلشرز'' کی جانب سے امریکہ میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسی مظلوم بیٹی کی کہانی ہے جس کا سید باپ پاکستان کے کسی مدرسہ میں معمولی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق اپنے اردگرد بسنے والے پاکستانیوں کا امام بن بیٹھا تھا اپنے مقتدیوں کے لئے اس کی ہر بات سند کا درجہ رکھتی تھی سادات میں ہونے کی وجہ سے لوگ اس کی تعظیم کرتے تھے مگر اپنے گھر والوں سے خاص طور سے اپنی بڑی بیٹی حنان سے اس کا سلوک شرمناک تھا۔ بیوی کو ذرا ذراسی بات پر مارنا پیٹنا اس کا شیوہ تھا۔ بیٹے اس کے کہے سنے میں نہیں تھے اس لئے وہ ان کا غصہ بھی اپنی بیوی اور بیٹیوں پر نکالتا تھا۔ بیوی تو گویا اس کی زرخرید لونڈی کا حکم رکھتی تھی جو اس کے کسی حکم سے سرتابی کی جرات بھی نہیں کرسکتی تھی۔ بچیاں سکولوں میں پڑھتی تھیں مگر انہیں کسی غیر ملکی سے ملنے جلنے تعلقات رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔

بڑی بیٹی حنان کو وہ ہمیشہ برا بھلا کہتا تھا شیطانی فطرت رکھنے کے طعنے دیتا تھا نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس ظالم سید نے اپنی بیٹی کو سزا دینے اور اس کے اندر سے شیطان کو نکالنے کے بہانے اس کے ساتھ جنسی جبر شروع کردیا۔ وہ بچی چھ سال کی عمر سے سولہ سال کی عمر تک باپ کی جنسی بہیمیت کا نشانہ بنتی رہی اور کسی سے کچھ کہنے سننے کی جرات اس میں اس لئے پیدا نہ ہوئی کہ اس کا باپ اپنے معتقدین میں اتنا معزز شخص ہے اس کی بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا اور باپ کو اس پر مزید ظلم

ڈھانے کا موقع مل جائے گا۔ آخر جب باپ نے اس کو پاکستان بھیج دینے اور وہاں زبردستی اس کا نکاح کرنے دینے کا فیصلہ کرلیا تو حنان نے اپنی ایک ایسی سہیلی کے ذریعہ جس کو جبری نکاح سے وہ پہلے بچا چکی تھی اپنی استاد سے سب کچھ کہہ دینے اور زبردستی کے نکاح سے چھٹکارا حاصل کرلینے کا فیصلہ کرلیا مگر اس راہ میں بھی اسے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ سکول والوں نے جس نفسیات دان سے اس کے نفسیاتی مسائل کا حل چاہا وہ پاکستانی تھا وہ حنان کی شکایات سن کر سیدھا اس کے باپ کے پاس پہنچ گیا اور اس کے لئے اور مشکلات کھڑی ہوگئیں۔ دوسری بار جو ماہر نفسیات ملی اس کی ہمدردی نے حنان کو تسلی دی اور جب باپ نے چپکے چپکے اس کو پاکستان بھجوانے کا سارا انتظام کرلیا تو یہ مظلوم لڑکی گھر سے فرار ہوکر اس ہمدرد نفسیات دان استاد کے گھر میں پناہ گزیں ہوگئی۔ یہاں سے ایک نئی داستان شروع ہوتی ہے مگر اس مظلوم لڑکی پر اسلام اور دین کے نام پر جو ظلم ہوا اس کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔

یہ خاندان جب انگلستان منتقل ہوا تو بچوں کو بتایا گیا کہ ''سوائے پاکستانی مسلمانوں کے کسی اور سے تعلق رکھنا کافروں سے تعلق رکھنے کے مترادف ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستانی مسلمانوں سے ملنا بھی مناسب نہیں'' (امام کی بیٹی صفحہ ۵۱)۔ حنان کا باپ فیکٹری کی ملازمت ترک کرکے امام بن گیا اور اس کے لئے ہمیشہ حجاب پہننا ضروری ٹھہرا۔ ''لوگ ہنستے بولتے خوشیاں مناتے تو ابا کو برا لگتا'' (صفحہ ۱۹) ''ابا کی تعلیم کا سلسلہ گیارہ سال کی عمر میں منقطع ہوگیا تھا۔ وہ قرآن پڑھنے کے لئے ایک مدرسہ میں داخل ہوگئے تھے۔ جب ابا انگلستان آئے تو ان کی عمر بیس تیس سال کے درمیان تھی''۔۔۔۔''وہ غیر مسلموں کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ ان سے اقتصادی مراعات لینا جائز سمجھتے تھے مگر اس معاشرہ کے طور اطوار سے علیحدہ رہنا چاہتے تھے'' (صفحہ ۲۵) ''ان کی زندگی مذہبی فرائض تک محدود تھی۔ ان کی بول چال بھی مردوں کے ساتھ تھی ان کے لئے زندگی سادہ سنجیدہ مگر لازماً بیرونی مداخلت سے پاک صاف رہنا ضروری تھی'' (صفحہ ۲۶) ''انہیں گوروں سے نفرت تھی'' (صفحہ ۳۰) ہمیں قرآن پڑھایا جاتا تھا مگر لفظوں کے معانی نہیں بتائے جاتے تھے۔ مجھے تسبیح پر اللہ کے ننانوے نام یاد کروادئے گئے تھے مگر کسی ایک کا مطلب نہیں بتایا گیا تھا۔

''اسلام میں کسی کو امام بنانے یا مقدس شخصیت ماننے کا کوئی معین طریقہ موجود نہیں۔ میرا والد کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا مگر قرآن کے الفاظ جانتا تھا اور مشرقی سٹریٹ کے علاقہ کے لئے اسے امام بنانے کو یہی کچھ کافی تھا'' (صفحہ۴۴) جب باپ کو لوگوں نے امام مان لیا تو اس نے اپنے تمام تر غصے اور خبثِ باطن کا رخ بیٹی کی طرف موڑ دیا۔ ''اسلام میں زنا کا شکار بننے والی عورت ہی مجرم قرار دی جاتی ہے'' (صفحہ ٦٦) اور اس کا نمونہ تو ہم پاکستان میں ضیاء الحق کے نافذ کردہ حدود آرڈیننس میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ بیٹی باپ کی خباثت کا شکار بنتی رہی اور خاموش رہی۔

ایک بار کلاس میں استاد نے بتایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسلام کی تعلیمات کے مطابق بھی اللہ کے سچے رسول تھے تو باپ نے بیٹی کو ڈانٹا کہ ''خبردار اس شخص یعنی حضرت عیسیٰ کا نام دوبارہ اس گھر میں کسی کی زبان پر نہ آئے'' (صفحہ۷۹)۔ ''باہر کے ملکوں سے مثلاً سعودی عرب سے پاکستان سے پیر درآمد کئے جاتے جو لوگوں کو تعویز وغیرہ دیتے'' (صفحہ۸۱) حنان کے لئے پیر صاحب سے تعویذ لئے گئے اور انہیں گھول کر بھی اسے پلائے گئے مگر اس کے ''اندر کے شیطان'' کی اصلاح نہ ہوسکی۔ اصلاح نہ ہونے کی ایک وجہ اس لڑکی کی بغاوت تھی جو اس بات کی مخالف تھی کہ اس کا باپ سوسائٹی سے اور حکومت سے سارے فوائد حاصل کرتا تھا تو ان سے نفرت کیوں کرتا تھا مگر باپ کا فلسفہ یہ تھا کہ ''گوروں سے لینا نیکی ہے'' (صفحہ۸۹)

باپ نے اپنے ایک بیٹے کو قرآن حفظ کرنے کے لئے پاکستان بھیج دیا کچھ عرصہ کے بعد وہ بھاگ کر واپس آ گیا۔ بہن نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ''مدرسوں میں وہ زدوکوب کرتے ہیں۔ صرف چھڑی سے ہی نہیں مارتے زمین پر پٹخ دیتے ہیں اور گھونسوں مکوں اور لاتوں سے ٹھکائی کرتے ہیں'' ۔۔۔ ''ایک بار میں نے سورت کے الفاظ غلط پڑھ دئے اس پر انہوں نے مجھے کئی روز تک ایک اندھیرے کمرہ میں بند کر دیا اور کہا یا تو تم ٹھیک پڑھنے لگو گے یا اس کمرہ میں پڑے پڑے مر جاؤ گے''۔۔۔ میرے بھائی سے جو کچھ ہوا تھا وہ ''عام بات تھی پاکستان کے اکثر مدرسے لڑکوں کو مغرب کے خلاف جہاد کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ بچوں کو چھوٹی عمر میں ان کے گھروں سے لے جاتے ہیں انہیں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں اور ان کے ذہنوں کی صفائی کر کے ان کی روحوں کو تباہ کر دیتے

ہیں جب بچے ان کے مطابق تیار ہو جاتے ہیں تو ان کے ذہنوں میں نفرت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور انہیں موت کی غذا بننے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔'' (صفحہ۱۴۰) میرا بھائی اس راہ پر چلنے سے تو بچ گیا مگر ہمیشہ کے لئے نفسیاتی مریض بن گیا۔

نفسیاتی مریض تو یہ بچی بھی بن گئی کیونکہ اس کو باپ کی بہیمیت سے بچانے والا کوئی نہ نکلا اور یہ خود اپنے باپ کے خلاف جنسی جبر کی شکایت کر کے اس کی عزت اور شہرت کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ کتاب کے اواخر کا بیشتر حصہ اسی پچھتاوے اور خود اپنے خلاف شکووں سے بھرا ہوا ہے کہ وہ کیوں اپنے باپ کی بہیمیت کا ذکر نہ کر سکی۔

ایک نتیجہ تو نکلا کہ یہ بچی باپ اور اس کے تنگ نظر نام نہاد اسلام سے نفرت کرنے لگی اور بالآخر عیسائیت کے حلقہ بگوش ہوگئی۔ جب حنان عیسائیت کی آغوش میں چلی گئی تو اس کا باپ اور اس کے علاقے کے مسلمان اسے ارتداد کی سزا دینے یعنی اس کے قتل کے درپے ہوگئے اور اسے مدتوں چھپ کر اپنی زندگی بچانا پڑی۔ کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق مرتد کی سزا موت ہے۔ عیسائی ہونے کے بعد حنہ نے خود قرآن کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو اس کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی کہ اس کے باپ نے جو کچھ ''قرآن سے منسوب کر کے بتایا تھا اس کا قرآن میں کہیں بھی ذکر نہ تھا وہ محض سنی سنائی باتیں تھیں۔'' (صفحہ۲۳۲)

کتاب کے فلیپ پر یہی لکھا ہے کہ اپنے عقیدہ سے بغاوت کرنے سے ''اس کی زندگی بیجا کی شرم وحیا مذہبی عدم رواداری اور بچپن کے خوفناک بہیمانہ سلوک کے خوف سے آزاد ہوگئی۔'' اور اب وہ چرچ کے زیر اہتمام انسانی خدمت کے کام میں مصروف اور مطمئن شادی شدہ زندگی گذار رہی ہے۔

اگر باپ دین اور نیکی کے نام پر اس بچی کے ساتھ ایسا غیر انسانی اور غیر فطری سلوک روا نہ رکھتا تو یہ کہانی بالکل مختلف ہوتی اور حنان کو حنہ شاہ کا نام اختیار نہ کرنا پڑتا۔

یہ کتاب مغربی ممالک میں رہنے والوں کے لئے ایک سبق کا حکم بھی رکھتی ہے کہ اگر وہ اپنی اولادوں کو اپنے دین کی حکیمانہ تعلیم سے حکیمانہ طریق سے روشناس نہیں کروائیں گے تو اس کا نتیجہ دین سے بغاوت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے اور دین کی تعلیم وتشریح نیم پڑھے اور بدکردار اماموں کے

سپرد کر دینا کیسے خوفناک نتائج پیدا کرنے کا موجب بھی ہو سکتا ہے۔

☆☆

(ساقی فاروقی کی اس نظم کو مضمون ''امام کی بیٹی'' کا تتمہ سمجھا جائے)

شہناز بانو دختر شہباز حسین

(یوں ہے کہ مغرب کی طرح مشرق میں بھی محرم کے ساتھ زنا کی شرمناک وبا عام ہے۔ یہ نظم لاکھوں کروڑوں بے زبانوں کو زبان دینے کی ایک کوشش ہے۔ ساقی)

وہ غصہ کی سرخ شال میں
طرح طرح کے اندیشوں میں گھری ہوئی
کسی بھڑکتے شعلے کی مانند
لرز رہی تھی
دھیان کے دھندلے بائیسکوپ میں
رات کی خونیں تصویریں متحرک تھیں:
وہ دزدانہ کمرے میں آئے تھے
بتی اجال کے
آہستہ آہستہ
اس کی شلوار اتاری تھی
ننگی پنڈلیاں تہ کر کر کے
جانگھوں کے متوازی کر دی تھیں
دونوں گھٹنے ڈھال ڈھکیل کے
ناف کے اوپر
ننھے منے پستانوں کے برابر
تک لے آئے تھے

پھر اس کے ممنوعہ گتھے علاقے میں
جبراً سما گئے تھے

دو رانوں کی زنجیروں میں قید
سولہ سالہ تنگ عمودی شرمیلی سی بیر بہوٹی
رنگ چھوڑ کے
بلبلا کر بلک پڑی تھی۔۔۔
(اس افسردہ فلیش بیک میں
بقیہ
صرف بلیک آؤٹ کا پہرا تھا،
اب تک بیہوشی طاری تھی
یاد معطل ہوتی جاتی تھی)

سوچتے سوچتے
سبز آنکھوں میں خون اتر آیا
اور بارہ گھنٹوں میں بارہ صدیاں بیت گئیں
اپنی آگ میں لوٹ پوٹ۔۔۔
۔۔۔اچانک اٹھ کر
باپ کے کمرے میں درانہ چلی گئی

ڈری ڈری سی باہر آئی
دائیں ہاتھ میں لال چھری تھی

بائیں ہاتھ میں ایک مردہ سا

ختنہ شدہ ساچوہا تھا

اور اباجی

بھل بھل بہتے خون میں لت پت

پڑے ہوئے تھے۔

ساقی فاروقی۔لندن۔۲۰۰۸(شاہ دولہ کا چوہا اور دوسری نظمیں صفحہ ۱۱۳۔۱۱۵)

کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں

کشمیر کے نامور ماہر تعلیم ڈاکٹر آغا اشرف علی کی خودنوشت ''کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں'' مجھے میرے دوست ڈاکٹر داؤد رہبر نے بھجوائی ہے۔ یہ خودنوشت کشمیر ٹائمز پبلیکیشنز جموں کشمیر نے 2010 میں سرینگر سے شائع کی ہے۔ آغا صاحب کی تعلیم ایس پی کالج سرینگر، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ دہلی میں ہوئی۔ ان کا خاندان دھدیال ننھیال دونوں جانب سے معزز اور متمول تھا۔ بہ قول ان کے ان کے نانا ''ڈوگرہ شاہی کی چوٹی تک پہنچ گئے تھے'' (کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں صفحہ۱۳)۔ جامعہ ملیہ میں اپنے اساتذہ کے وقف کے جذبے سے متاثر ہوئے اور خود بھی عمر بھر اسی جذبہ کے ساتھ کشمیر والوں کی خدمت کرتے رہے۔ لندن میں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا مگر ریسرچ اور ڈاکٹریٹ کا کام امریکہ میں مکمل کیا۔ کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے زوال کے بعد شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا۔ سکول ایجوکیشن میں نام پیدا کیا اور کشمیر میں تعلیم کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا سہرا انہی کے سر ہے۔

علی گڑھ میں پروفیسر رشید احمد صدیقی سے بہت متاثر ہوئے۔ ہمارے مشہور و معروف بیوروکریٹ روئیداد خاں کا ذکر بھی آیا ہے۔ صدیقی صاحب نے ایک چینی طالب علم کو اپنے کمرہ میں طلب کیا۔ روئیداد خاں بھی موجود تھے۔ آپ نے جھٹ اس سے سوال کر دیا ''آپ پہلے مسلمان ہیں یا چینی؟''۔ صدیقی صاحب نے سوال کاٹ کر جواب دیا ''روئیداد چین میں پاکستان بنانا چاہتا ہے'' (صفحہ۳۸)۔ روئیداد خاں پاکستان کی سول سروس کے نامور افسر رہے۔ ایک سینئر سول افسر مختار مسعود نے لوح ایام میں لکھا ہے ''سقوط مشرقی پاکستان کے بعد بھی یحیٰی خاں بچے کھچے پاکستان کا صدر رہنے

پر مصر تھے۔ایک ریٹائرڈ جرنیل کا کہنا ہے کہ جب یحییٰ نے اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اپنے چند مشیروں سے مشورہ طلب کیا تو اس کی پر زور تائید کرنے والے دو سول افسروں کا تعلق محکمہ دفاع اور محکمہ اطلاعات سے تھا ایک نے کہا عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے ہم ٹی وی پر ایسے دلچسپ پروگرام دکھائیں گے کہ لوگ مشرقی پاکستان کو بھول جائیں گے۔ بریں عقل و دانش بباید گریست'' (لوح ایام صفحہ ۵۵) محکمہ اطلاعات کے اس سربراہ کا اسم گرامی روئیداد خاں تھا۔ہم نے جب روئیداد خاں کی خود نوشت ''پاکستان ایک خواب پریشاں'' کا تجزیہ کیا تھا تو بڑی ژرف نگاہی سے اس امر کا جائزہ لیا تھا کہ شاید روئیداد خاں صاحب نے اپنے ایک معزز رفیق کار کے الزام کا جواب دیا ہو مگر آپ نے اس موضوع کو چھیڑا تک نہیں تھا۔ پچھلے دنوں ایک ٹی وی پر ان کا ایک انٹرویو سننے میں آیا۔ٹی وی والے نے پاکستان میں اسلام کے نام پر روا رکھے جانے والے ظلم وستم کے بارہ میں ایک سیدھا سادہ سوال کیا تھا آپ نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے نہایت غصہ کی حالت میں فون بند کر دیا۔ہمیں مختار مسعود کا لکھا ہؤا مصرعہ یاد آیا۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ چلئے سول سروس کے بڑوں کی عقل و دانش پر رونے کی بجائے رشید احمد صدیقی صاحب کی بذلہ سنجی سے لطف اندوز ہوں۔ لکھتے ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب صدیقی صاحب کے ہاں تشریف فرما تھے۔صدیقی صاحب کہنے لگے قبلہ ''جب پاکستان وجود میں آئے گا تو ان کی اپنی کرنسی ہوگی؟'' ذاکر صاحب نے جواباً فرمایا ''یقیناً وہ علیحدہ ملک ہوگا اور لازمی ہے کہ ان کا اپنا سکہ ہوگا''۔رشید صاحب نے فی البدیہہ کہا ''تب پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر لکھا ہوگا میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس نوٹ کے پیش کرنے والے کو دس روپے کی قیمت دی جائے گی۔انشاءاللہ'' (صفحہ ۲۳)

علی گڑھ کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر ہو جائے تو کیا حرج ہے۔امام الہند کو علی گڑھ یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری ملنے والی تھی۔مولانا نے کہا ''سرسید مرحوم کی خدمات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں انہوں نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم وتہذیب سے روشناس کیا اور انہیں جدید زندگی کا رستہ دکھایا۔مگر سیاسی اعتبار سے ان کا وہ مشورہ غلط ثابت ہؤا جو انہوں نے ہندی مسلمانوں کو دیا'' (صفحہ ۴۸) ۔علی گڑھ والوں نے سرسید کے خلاف ایسی تقریر کاہے کو سنی ہوگی۔ اگلے

روز یونین کے طالب علم صدر نے کہا ''ابوالکلام کے صاحب کلام ہونے میں کس کو کلام ہے مگر ہمارے لئے کلام اللہ کافی ہے۔۔۔مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا قرآن کو جنون کے لئے استعمال کرنا اس کی بدترین توہین ہے مگر اس کی تعبیر کون کرے؟'' (ایضاً)

کشمیر کے کسی باسی کی سرگزشت ہو تو اس کا محور کشمیر ہی ہونا چاہئیے اور اس سرگزشت کا محور کشمیر ہی ہے۔تیسری دہائی کا کشمیر اور شیخ عبداللہ کی جدوجہد کی تاریخ ان کے سامنے ہے۔''کشمیر میں مسلمانوں کو ملازمتیں نہیں دی جاتی تھیں'' (صفحہ ۹۰) خود انہی کے ایک بزرگ نے شیخ صاحب کو ملازمت دینے سے انکار کیا تھا کیونکہ ''مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ نانا کی وفاداری بے لاگ اور مسلمہ تھی۔شیخ صاحب ایم ایس سی پاس کر کے نانا کے پاس نوکری کے لئے آئے تھے۔نانا ان دنوں ہوم اور جوڈیشل منسٹر تھے۔شیخ صاحب کو کم سے کم کمسٹری میں لکچرر کا عہدہ مل سکتا تھا۔نانا نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی جگہ خالی نہیں اس لئے وہ کام نہیں دے سکتے'' (صفحہ ۱۴) پھر یہ کشمیر کے وزیر اعظم سرایلبین بینر جی ہی تھے جنہوں نے شیخ عبداللہ کی سیاسی جاگرتی (بیداری) کی تحریک کے بارہ میں کہا تھا ''یہ لکڑ ہارے ہیں سقائی کا کام کرتے ہیں اور مویشیوں کی طرح گونگے بہرے ہیں جو حیوانی سطح پر گذارا کرتے ہیں'' (صفحہ ۳۰) آخر وہی تحریک کام آئی اور مہاراجہ کے فرار کے بعد جو کچھ کام ہؤا وہ شیخ عبد اللہ کے دور ہی میں ہؤا۔آغا صاحب نے شیخ عبداللہ کے ساتھ بہت وفا کی اور شیخ صاحب نے بھی حتی الوسع ان کا ساتھ دیا۔شیخ صاحب کے صاحبزادے فاروق عبداللہ ایک سفارش لے کر آغا صاحب کے پاس آئے تو آغا صاحب نے سفارش رد کر دی۔شیخ عبداللہ کو سفارش کا پتہ چلا تو ان سے کہا ''فاروق سفارش لے کر آیا تھا تو تم نے اس کی ٹانگیں کیوں نہ توڑ دیں'' (صفحہ ۱۶۵)

نہرو اور شیخ عبداللہ کی دوستی کا بھی بہت تذکرہ ہے مگر نہرو حکومت نے شیخ عبداللہ کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر حرف تاسف کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔تاہم کشمیر اور کشمیر کے نظام تعلیم کو مستحکم کرنے کا مشن ہر حال میں ان کے سامنے رہا اور جس قوم کو ایسے بے لوث کام کرنے والے مل جائیں اسے اور کیا چاہیے۔ہمارے ہاں تو بھٹو صاحب نے جہاں ملک کی اقتصادیات کا بیڑا ڈبویا وہاں سب سے زیادہ نقصان تعلیمی اداروں کے زیاں کا کیا۔تاریخ ان کے اور گناہ تو شاید معاف کر دے نام نہاد

اسلام پرستوں کے چنگل میں پھنس کر اسلام کے نام پر استحصال کی بنیاد ڈال دینے اور تعلیمی اداروں کو قومیا کران کا ستیاناس کرنے کا گناہ کبھی معاف نہیں کرے گی۔

خواجہ غلام السیدین صاحب مدتوں کشمیر میں محکمہ تعلیم کے سربراہ رہے۔ بخشی غلام محمد کے زمانہ میں انہیں بارِ دگر ایجوکیشن ایڈوائزر کے طور پر بلایا گیا۔ ایک بار ''بیس کے قریب لیکچرر اور پروفیسر متعین کرنے تھے۔ سیدین صاحب نے آٹھ دس کشمیری پنڈت بھی متعین کئے۔ بخشی صاحب نے سیدین صاحب کے انتخاب پر اعتراض کیا۔ سیدین صاحب نے جواب دیا ایک مسلمان کی حیثیت میں میرے لئے کوئی فخر کی بات نہیں کہ میں فرسٹ ڈویژن لوگوں کی موجودگی کے باوجود کسی تھرڈ ڈویژن مسلمان کا تقرر کردوں'' (حاشیہ صفحہ ۱۱۱) اور مستعفی ہوکر واپس چلے گئے۔

آغا اشرف علی کی خودنوشت کا لہجہ علمی لہجہ ہے اور بہت سی ایسی حکمت کی باتیں ہیں جو پڑھنے والے کے علم میں اضافہ کا موجب بنتی ہیں۔ راقم الحروف چار سال جاپان کی اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں وزیٹنگ پروفیسر رہا۔ یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ جاپان میں استاد کو سنسے sensei کے لقب سے پکارا جاتا ہے اور میرے شاگرد مجھے اسی لقب سے پکارتے تھے مگر اس لفظ کی جو باریکی مجھے آغا صاحب کی کتاب سے معلوم ہوئی وہ میرے علم میں نہیں تھی ''ارک ہابس بام (Eric Habsbawm) نے کارل مارکس کے لئے ایک جاپانی اصطلاح سنسے استعمال کی ہے۔ اس کا مطلب ہے استاد کا وہ قرضہ جوادا نہیں کیا جاسکتا'' (صفحہ ۳۷)۔ اس ایک بات سے ہی جاپانیوں کے ہاں استاد کی عزت افزائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور سنسے کی یہ اصطلاح صرف اساتذہ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اساتذہ خواہ وہ پرائمری سکول کے ہوں یا یونیورسٹی کے سنسے کے لقب سے پکارے جاتے ہیں یعنی وہ لوگ جن کا قرضہ کبھی چکایا نہیں جاسکتا۔ آغا صاحب کا یہ کہا بھی لائق ستائش ہے کہ ''تعلیم دلوں میں گھر کرنے اور دل جیتنے کا سب سے عمدہ ذریعہ ہے'' (صفحہ ۱۹۸)

پروفیسر مجیب کی کتاب The Indian Muslims کا بھی بہت تذکرہ ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر مجیب نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دورِ حکومت کے کارہائے نمایاں کا ذکر کیا ہے۔ پروفیسر سلام ہندوستان آئے مجیب صاحب سے ملے تو احتراماً ان کے ہاتھ

چومے (صفحہ ۲۱۳)

کشمیر میں تعلیمی افراتفری پیدا ہو جانے کے اسباب وعلل پر بھی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک جگہ تو یوں لگتا ہے پاکستان کے جعلی ڈگری یافتہ سیاستدانوں کے بارہ میں لکھ گئے ہیں ''فضا مکدر کرنے میں امیر کاروباری پختہ کار اور سرکاری اہلکار اکٹھے مل گئے تھے۔ پہلے انہوں نے نقل عام کروائی تاکہ عام لوگوں کی عادتیں خراب کی جاسکیں۔۔۔ اور وہ بن کمائے پیسوں کی طرح تعلیم (کی) بھی پڑھنے لکھنے کے بغیر ہی سند حاصل کرسکیں۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ نقلی سند یافتہ لوگ آسانی کے ساتھ چمچے بن جاتے ہیں اور جی حضوری۔ ان کا کردار علیل ہوتا ہے'' (صفحہ ۲۱۶)

احوال الرجال میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مجیب صاحب رشید صدیقی صاحب کے علاوہ علی گڑھ کے بہت سے احباب کا ذکر ہے مگر سب سے طویل، خوشکن اور مفصل ذکر ہمارے دوست ڈاکٹر داؤد رہبر کا ہے۔ ''جب علم وفضل، متانت اور عاجزی کے ساتھ ہمکنار ہوجاتے ہیں تو ایک ایسے شخص کے نقوش سامنے آتے ہیں جن کا نام داؤد رہبر ہے'' (صفحہ ۲۷۳)۔ مجھے داؤد رہبر کے بارہ میں بہت سی باتوں کا علم آغا صاحب کی خودنوشت پڑھنے کے بعد ہوا ہے۔

آغا صاحب نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے دوست حمدال طیب جی سے اپنی سرگزشت انگریزی میں کہنا شروع کی جو ساتھ کے ساتھ ریکارڈ ہوتی رہی۔ ہر روز پینتالیس منٹ کا کیسٹ تیار ہوتا۔ جب انیس کیسٹ صدا بند ہو چکے تو انہی کے ایک شاگرد حبیب صاحب نے انہیں اردو کا جامہ پہنایا اور یہ سرگزشت موجودہ صورت میں چھپی ہے۔ ترجمہ سمجھنے میں کہیں کہیں دقت کا احساس ہوتا ہے مگر وہ الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ یہ خودنوشت ایک منجھے ہوئے ماہر تعلیم کی خودنوشت ہے۔ جن کے تجربات سے ہمارے ہاں کے لوگ فائدہ اٹھانا چاہیں تو اٹھا سکتے ہیں۔ مگر ہم لوگ غنی کاشمیری کی طرح اپنی محرومی کا ماتم ہی کر سکتے ہیں۔۔۔ غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن!

❁

جوئندہ یابندہ

مشہور برطانوی مستشرق ،اردو دان اورلندن سکول آف اورئینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کے پروفیسر رالف رسل نے اپنی خودنوشت تین جلدوں میں لکھی ہے۔پہلی جلد ۱۹۴۶ تک کے واقعات کو محیط ہے دوسری جلد مکمل ہو چکی ہے اور تیسری تکمیل کے مراحل میں ہے۔پہلی جلد کا انگریزی عنوان ہے Findings, Keepings: Life Communism and Everything ۔یہ جلد ۲۰۰۵ میں'' آج'' والوں کے زیر اہتمام کراچی سے چھپی ۔اس کا اردو ترجمہ جواہر لال یونیورسٹی دہلی کی محترمہ ارجمند آراء نے کیا اور پھر لندن جا کر مصنف کے ساتھ ایک مہینہ قیام کر کے ترجمہ پر نظر ثانی بھی کی اور اس کی نوک پلک بھی سنواری۔اردو میں اس کا عنوان جوئندہ یابندہ تجویز ہؤا اور ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے حیات، کمیونزم اور سب کچھ!

رالف رسل کی اردو سے دلچسپی برطانوی فوج کے ایک کارکن اور بعد کو افسر کی حیثیت سے ہندوستان میں قیام کے دوران پیدا ہوئی۔کیمبرج میں تو ان کی دلچسپی لاطینی اور کلاسیکی یوروپین ادب کے ساتھ رہی۔برطانوی معاشرہ کے ناہموار حالات کے تحت انہیں کمیونزم کے ساتھ لگاؤ رہا۔ذہنی طور پر کارل مارکس کے فلسفہ سے بہت متاثر رہے۔برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن رہے اور لینن کے نظریات پر عمل پیرا رہے۔برطانیہ میں انتخابات کے موقعہ پر چرچل کی انتخابی میٹنگ سے پہلے اس جگہ پر ایک نعرہ لکھ دیا Indian workers get 4d a day__ less if Churchill gets his way اس کے ساتھ ہی چرچل کی میٹنگ سے واک آؤٹ کیا ڈیلی ورکر اخبار نے لکھا کہ'' چرچل کے تقریر ختم کرنے سے پہلے برہم مزدور کھڑے ہو گئے اور گروہ بنا کر

ہال سے باہر چلے گئے۔'' (جوئندہ یابندہ صفحہ ۱۲۴) کمیونزم سے متعلقہ سرگرمیوں میں یہ دلچسپی ہندوستان میں فوج کی ملازمت کے دوران بھی قائم رہی اور ان کے اپنے قول کے مطابق ان کے اردو سیکھنے کی وجہ یہ بھی رہی کہ اپنے ماتحتوں سے ان کی زبان میں گفتگو کر کے انہیں کمیونزم کے فلسفہ سے آگاہ کر سکیں۔(صفحہ ۲۸۸)۔ذہنی طور پر لینن سے اتنے متاثر تھے کہ'' درانتی اور ہتھوڑے سے لینن کی اولاد'' (صفحہ ۱۹۸) کہلانے کو محض نعرہ نہیں جانتے تھے اگرچہ ساتھ میں رالف رسل نے یہ فقرہ بھی چست کیا ہے کہ'' میں سوچتا تھا کہ اگر لینن نے ہمیں درانتی اور ہتھوڑے کی مدد سے رحمِ مادر میں رکھا ہوگا تو یہ کافی تکلیف دہ عمل رہا ہوگا۔'' (صفحہ ایضاً) انگریز کی فوج میں رہنے کے باوجود ان کا ارادہ یہ تھا کہ'' بچت کریں گے اور اس طرح بچت کو پارٹی کے مقاصد پر خرچ کریں گے'' (صفحہ ۲۳۳) ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی سے رابطہ میں رہے۔بمبئی میں پی سی جوشی کے ساتھ ان کی ملاقاتیں رہیں اگرچہ اس کمیون کا ذکر ان کے ہاں نہیں جس کا ذکر بڑے رومانوی انداز میں شوکت کیفی نے اپنی کتاب یاد کی رہگزر میں کیا ہے۔

ان کا بچپن انگلستان کے ایک روایتی ورک ہاؤس میں گذرا۔یہ ورک ہاؤس ان لوگوں کے لئے بنائے جاتے تھے جو بیکار تھے۔غالبًا یہ سلسلہ انگلستان کے بعد کے سوشل اسسٹنس سسٹم کا پیشرو رہا ہوگا۔رسل کے والد ایک ورک ہاؤس کے انچارج تھے ان کی والدہ بھی اسی ورک ہاؤس میں کام کرتی تھیں پھر اچانک ان کے والد کو نوکری سے برطرف کر دیا گیا جس کی وجہ رسل نے بہت بعد کو بیان کی ہے کہ ان کو ورک ہاؤس کے سیف سے روپیہ نکالنے کے جرم میں برطرف کیا گیا تھا۔ورک ہاؤس کے غیر منصفانہ نظام اور پھر اپنے سوتیلے نانا کے ہاں قیام کے زمانہ میں کمزوروں غریبوں کے ساتھ ناروا سلوک کی وجہ سے ان کے ذہن میں کمیونزم کے خیالات پختہ ہونے لگے یہاں تک کہ ان کا خیال ہؤا کہ'' کمیونسٹ رشتوں کے سامنے خونی رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے'' (صفحہ ۴۱۳) سکول سے کیمبرج تک کے زمانہ میں ان کا کمیونزم سے رشتہ محض اکیڈیمک نہیں رہا تھا بلکہ باقاعدہ جذبہ کے ساتھ فارغ اوقات میں پارٹی کا کام کرتے اور پارٹی کا اخبار بیچتے تھے۔ان کا یقین تھا کہ'' کمیونسٹ لیڈر اعلیٰ ترین اشتراکی اقدار کی علامت ہوتے ہیں'' (صفحہ ۲۰۸) یہاں پر مجھے امریکہ کے آنجہانی صدر نکسن کی خود

نوشت میں مذکور واقعہ یاد آرہا ہے۔ صدر نکسن نے لکھا ہے کہ روس کے دورہ کے دوران صدر بریزنیف انہیں اپنے ذاتی عالیشان محل (یعنی ڈاچے) میں لے گئے اور اپنی والدہ کا واقعہ سنایا کہ جب ڈاچا مکمل ہو چکا تو انہوں نے اپنی والدہ کو بڑے فخر سے بلایا اور محل کی سیر کروائی۔ کہنے لگے اماں خاموش سی ہو گئیں تو انہوں نے پوچھا اماں آپ کو اپنے بیٹے کا شاندار ڈاچا پسند نہیں آیا؟ اماں نے نہایت معصومیت سے کہا ''بیٹا ڈاچا تو بلاشبہ شاندار ہے مگر کمیونسٹوں کو پتہ چل گیا تو پھر کیا ہوگا؟'' مگر ساتھ میں اس کمیونسٹ جاسوس ۸۷ سالہ بڑھیا کا بیان بھی یاد رکھنا چاہیے جس نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے جاسوسی کا کام پیسے یا دولت کی خاطر نہیں کیا ''میں نے جو کچھ کیا ہے وہ اس نئے نظام کو بچانے کے لئے کیا ہے'' (صفحہ ۲۰۷) مگر جب نظام میں ''ظلم کوئی اور کرے تو قابلِ مذمت اور روس کرے تو قابلِ درگذر'' (صفحہ ۲۰۴) کا رویہ راہ پا جائے تو اس نظام کی شکست یقینی ہو جاتی ہے۔

رالف رسل کو اس کے اساتذہ نے ''بہترین اسلوب رکھنے والا اور صاحبِ فکر'' (صفحہ ۷۶) قرار دیا تھا مگر اس کی رفیق کار عورتیں اسے ''ناگوار حد تک کھلے ذہن والا'' (صفحہ ۱۹۱) سمجھتی تھیں رالف رسل نے بھی اپنے جنسی میلانات و تجربات کو چھپانے یا ان پر لیپا پوتی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انگلستان میں شادی شدہ عورتوں کے ساتھ اپنے جنسی تعلقات پر پردہ نہیں ڈالا اور ہندوستان میں اپنے بیٹ مین کے ساتھ جنسی فعل کرنے پر بھی کوئی ندامت محسوس نہیں کی (صفحہ ۳۱۱) بچپن سے ہی ہم جنسی کے رجحانات ان میں تھے یہاں تک کہ ''اپنے ایک ہم عمر لڑکے سے یہ کہہ دیا کہ ہم بڑے ہو کر آپس میں شادی کر لیں گے'' (صفحہ ۸۶) حالانکہ جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی اس میں انہیں ایک لڑکے اور لڑکی کی جسمانی بناوٹ کا فرق کا بھی علم نہیں تھا۔

انگلستان کے جس سیاسی ماحول میں یہ پلے اور بڑھے اس میں ابھی عورتوں کو رائے دہی کا حق بھی حاصل نہیں تھا اور اس سلسلہ میں چلنے والی تحریک کو بھی غیر مانوس سمجھا جاتا تھا (صفحہ ۳۶) چیمبر لین کی جانب سے ہٹلر کو راضی کرنے کی تحریک کو تباہ کن سمجھا اور اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا (صفحہ ۱۷۱) مگر ہٹلر تو جنگ پر تلا بیٹھا تھا اور یہ اسی جنگ کا ہی شاخسانہ تھا کہ رالف رسل کو فوج میں بھرتی ہونا پڑا۔

رالف رسل نے ہٹلر کی پارلیمنٹ ''رائش تاغ'' کا مضحکہ اڑایا ہے (صفحہ ۱۳۸) مگر ہمیں جمیعت علمائے ہند کی ایک کانفرنس پر عبدالمجید سالک صاحب نے اپنے افکار و حوادث میں جو پھبتی کہی تھی وہ یاد آرہی ہے کہ ''کانفرنس کیا تھی بھانت بھانت کی داڑھیوں کا ایک ''ریش تاغ'' تھا۔

رالف رسل ہندوستان میں آئے تو بمبئی میں اترتے ہی انہیں سڑکوں پر جا بجا خون کے دھبے دیکھ کر بہت پریشانی ہوئی (صفحہ ۲۸۳) مگر جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ پان تھوکنے کے کرشمے ہیں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا رویہ نہایت نامناسب تھا (صفحہ ۳۵۴) مگر آپ نے اپنے ''ہندوستانی ساتھیوں کو بتا دیا کہ آپ انگریزوں کے جبر و استبداد کے خلاف ہیں'' (صفحہ ۳۲۹)۔ ان کی پوسٹنگ کاکول میں ہوئی۔ مانسہرہ میں اورنگ زیب خاں کے گھر بھی گئے (صفحہ ۲۹۹) جو پڑھے لکھے پٹھان تھے۔ مانسہرہ سے الہ آباد تبدیلی ہوئی پھر برما فرنٹ اور بنگال اور دہلی اور حیدرآباد۔ غرض بھانت بھانت کے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا رہا۔ ہندوستانیوں کی زندگی اور زبان میں ان کی دلچسپی کی اصل وجہ یہی رہی کہ لوگوں سے تال میل میں اردو یا ہندی میں گفتگو کر سکتے تھے اس لئے لوگ ان کی جانب کشش ہوتے تھے۔ اینگلو انڈین افسروں کے ساتھ ہمدردی کی بجائے استہزاء کرتے رہے کیونکہ وہ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز بنتے تھے (صفحہ ۳۳۳۔ مکرر ۴۱۷)

غرض اس خودنوشت کا پہلا حصہ انہی امور پر مشتمل ہے اور اس منزل پر اختتام کو پہنچ جاتا ہے جہاں جنگ ختم ہوتی ہے انہیں کسی پر اسرار جلدی بیماری کی وجہ سے فوج سے فارغ کر دیا گیا تو یہ لندن سکول میں اردو کے طالب علم بن کر داخل ہو جاتے ہیں باقی عمر ان کی اسی سکول کے ساتھ وابستگی میں گذری ہے جسکی داستان یقیناً دلچسپ ہوگی۔

خودنوشت کا لہجہ عالمانہ ہے ہلکے پھلکے مزاح کے چھینٹے بھی موجود ہیں۔ رالف رسل نے خود نوشت لکھنے کے محرکات پر بھی بحث کی کہ ''میرا خیال ہے کہ بنی نوع انسان کا ہر فرد اہم ہوتا ہے اپنی سرگزشت لکھ سکتا ہے اور اسے لکھنی چاہیئے'' (صفحہ ۹) مگر یادوں کی مکمل بازآفرینی سے رسل صاحب باز نہیں رہ سکے۔ اگر آپ اس سلسلہ میں طبیعت پر قابو رکھنے کا چھوٹا موٹا کام (بقول ارجمند آرا رسل صاحب کے خودوضع کردہ محاورہ میں little fat work کر لیتے اور غیر ضروری باتوں کی کانٹ

چھانٹ کر لیتے تو کتاب کی دلچسپی بڑھ جاتی۔ بحالت موجودہ رسل صاحب کی اس خودنوشت پر ان کا وہ قول صادق آتا ہے جو انہوں نے موپساں کے بارہ میں لکھا ہے کہ ''موپساں کی عمدہ تحریریں بہت عمدہ ہیں اور خراب تحریریں اتنی خراب ہیں کہ یقین نہیں آتا وہ موپساں کی ہیں'' (صفحہ ۱۱۹)

کتاب کے آخر میں محترمہ ارجمند آرا نے جو نوٹ لکھا ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور رالف رسل کی شخصیت کی بہت سی جہتوں کو اجاگر کرتا ہے اور اس کی موجودگی رالف رسل کو سمجھنے میں ممد ہوتی ہے۔ اس حصہ کو علیحدہ کر دیا جائے تو خودنوشت میں تشنگی کا احساس بہت بڑھ جائے۔ محترمہ ارجمند آرا اس خودنوشت میں باقاعدہ حصہ دار نظر آتی ہیں۔

ماں میں تھک گیا ہوں

''ماں، میں تھک گیا ہوں'' (اپنی کہانی اپنی زبانی) کے عنوان سے معروف افسانہ نگار وقار بن الٰہی کی طول طویل خودنوشت نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد والوں کی جانب سے ۲۰۰۶ میں پہلی بار چھپی۔ اس خودنوشت کا سب سے اچھا پہلو یہ ہے کہ ۶۷۱ صفحے کی اس کتاب کی قیمت صرف ۳۱۰ روپے ہے۔ مہنگائی اور افراط زر کے اس دور میں یہ قیمت ناقابل یقین دکھائی دیتی ہے حالانکہ کتاب کا کاغذ چھپائی جلد بندی نہایت اعلیٰ درجہ کی ہے شاید نیشنل بک فاؤنڈیشن والوں کو حکومت والوں کی جانب سے مالی اعانت حاصل ہوتی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ہمیں تو اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے اورینٹل کالج لاہور کے زمانہ کے ایک استاد بھائی کی خودنوشت بڑے مناسب انداز میں چھپی ہے اور عام عوام کی دسترس میں ہے۔ ہم بڑی دیر سے اس کتاب کی تلاش میں سرگرداں تھے مگر کینیڈا تک کتابوں کا پہنچنا کارے دارد ہے۔ چونکہ وقار بن الٰہی سے اورینٹل کالج سے 1959 سے نکلنے کے بعد کبھی میل ملاقات کا موقعہ نہ ملا اس لئے عدم رابطہ کی وجہ سے بھی ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہے۔

1958 میں ہم اورینٹل کالج میں ایم اے اردو میں داخلہ کے لئے پہنچے۔ وولنر ہاسٹل میں رہنے کو جگہ ملی۔ وہاں پہلی بات یہ نظر آئی کہ اوپر کی منزل پر ہمارے ٹی آئی کالج کے زمانہ کے دوست عابد علی بٹر کھڑے ہیں اور ان کے عین نیچے والے کمرہ کے سامنے ایک صاحب کھڑے ہیں اور دونوں میں شورش کاشمیری کے اسلوب زبان میں بہ آواز بلند ''ایمان افروز'' قسم کا مکالمہ ہو رہا ہے۔ ہمیں مولانا نور الحسن صاحب سپرنٹنڈنٹ نے کمرہ نمبر ۲۳ الاٹ کیا تھا۔ عابد بٹر کمرہ نمبر ۲۲ کے مکین تھے لہذا ہم اوپر پہنچے تو عابد نے ذرا سی دیر کے لئے توپوں کا رخ ہماری جانب پھیر دیا اور اہلاً و سہلاً کے طور پر ہمارے

ساتھ طویل پسلی توڑ معانقہ فرمایا۔ نیچے جو صاحب مکالمہ کا ہدف تھے اوپر آ گئے تو معلوم ہوا مختار احمد نام ہے، افسانہ نگار ہیں ایم اے اردو میں ہمارے سینئر ہیں قلمی نام وقار بن الٰہی ہے اور بڑے کھڑپینچ قسم کے طالبعلم ہیں۔ اس کے بعد ایک سال اورینٹل کالج اور وولنر ہاسٹل میں ان کی رفاقت ہمیں حاصل رہی مگر وہ بے تکلفی جو عابد علی بٹر کے اور ان کے درمیان تھی ہمارے درمیان راہ نہ پا سکی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمیں کالج کا خرچ پورا کرنے کے لئے ٹیوشنوں کی چکی میں پسنا پڑتا تھا اور مختار احمد صاحب دن کو اردو سے اور شام کو صحافت کی کلاسوں سے نپٹتے تھے۔ شاید دو چار بار ہی کالج کی کسی ادبی میٹنگ میں ان سے ملاقات ہوئی ہو۔ وقار نے اپنی جس ڈیبیٹنگ کا ذکر زور شور سے کیا ہے اورینٹل کالج کی حد تک وہ سامنے نہ آئی پھر وہ کالج سے پاس ہو کر چلے گئے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اب پچاس برس کے بعد ان کے شب و روز کا حال پڑھا ہے تو اپنے روز و شب یاد آ رہے ہیں۔ ایک ہمعصر ہم عمر کی سرگزشت اپنی ہی سرگزشت معلوم دیا کرتی ہے۔ ہمارے جاننے والوں میں سمیع اللہ قریشی کا ذکر ہے یا اکبر حمیدی کا۔ ہاں منشا یاد بھی تو ہمارا جانا پہچانا ہے مگر منشا یاد تو جن ہے اسلام آباد سے کوئی ایک آدھ بار بھی گذرنے والا اس سے کیسے بچ سکتا تھا۔

مختار احمد زندگی بھر وزارت تعلیم سے وابستہ رہا وقار بن الٰہی کو تو وزارت تعلیم کی غیر تعلیمی مصروفیت نگل گئی مگر اب اس نے زندگی کا حساب کتاب کیا ہے تو اس کا خیال ہے کہ افسانہ نگاری پس پردہ چلی گئی تھی وہ شاید اس مردہ کو زندہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اللہ اس کی مسیحائی میں برکت دے۔ مگر خودنوشت لکھتے ہوئے اس نے اپنا احوال کم وزارت کا احوال زیادہ لکھا ہے کیونکہ اس کے خیال میں ''سکریٹیریٹ میں آنے جانے والوں پر جو بیتی وہ بیان کرنا ضروری تھا (ماں میں تھک گیا ہوں صفحہ ۶) اسی لئے کتاب کے ٹائیٹل پر مختار کی جو تصویر اواخر عمر کی چھپی ہے اس میں تھکا ہوا اکم اور بیزار زیادہ نظر آتا ہے۔ یہ سکریٹیریٹ بیتی تو وہ اپنے متعدد افسانوں میں بیان کر چکا ہے جن کے حوالے خودنوشت کے ہر دوسرے چوتھے صفحے پر ملتے ہیں۔ یہ خودنوشت اسی لئے اس بیماری کا شکار ہو گئی ہے جسے یادوں کی مکمل باز آفرینی کی بیماری کہتے ہیں۔ اگر وقار بن الٰہی اس مرض کا شکار نہ ہوتا تو یہ خودنوشت قاری کی مالی دسترس کے علاوہ اس کے پڑھنے میں آسانیاں پیدا کرنے کا موجب ہوتی۔ بہ صورت موجودہ اس کو پڑھنے کی نیت کرنے کے لئے بھی دل پر خاصا جبر کرنا پڑتا ہے۔ کسی کو وزارت

تعلیم کے سکریٹیریٹ کے بیچوں بیچ خوار ہونے والوں کے احوال سے کیا اور کتنی دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اسے خود بھی یہ خیال ہے کہ ''آپ بیتی لکھوں گا مگر یہ احساس نہیں تھا کہ یہ کام اتنا پھیل جائے گا''
(صفحہ ۶۴۴)

وقار نے اپنی ملازمت کے دوران دنیا بھر کے سفر کئے اور خود یہ دعویٰ بھی کیا کہ سفرنامے نہیں لکھوں گا'' کیونکہ اگر سارے ہی سفرنامے لکھنے لگ گئے تو مستنصر حسین تارڑ کے پاس کیا رہ جائے گا'' (صفحہ ۱۷۰) مگر حیرت ہوتی ہے کہ وقار بن الٰہی بھی سفرنامہ نگاری سے باز نہیں آیا نہ صرف یہ کہ غیر ضروری سفرناموں کو اپنی خودنوشت کا حصہ بنایا بلکہ کئی جگہوں پر ''مستنصر حسین تارڑیت'' کا مظاہرہ کیا ''one packet and take this woman'' (صفحہ ۲۰۷) چین میں جاپانی لڑکی بن بلائے ان کے کمرہ میں آ گئی (صفحہ ۲۷۱) آسٹریلیا میں ہوٹل کے مینیجر نے فون کیا آپ کی مطلوبہ عورت آ گئی ہے اسے آپ کے کمرے میں بھیج دوں؟ (صفحہ ۳۶۵) انڈونیشیا میں بھی مضمون واحد رہا ''ہم ایک دواداروں کی سیر کرنے کے بعد لوٹ رہے تھے کہ اپنے ہوٹل کے باہر خواتین کا جھرمٹ ہم سے ہمکلام ہونے کے لئے کیسے کیسے گفتہ و ناگفتہ جتن کرتا دکھائی دیا'' (صفحہ ۳۹۲)۔ غرض ''تارڑیت'' ان کے ساتھ رہی۔

ہم بھی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بہت رہے بلکہ بیس سال سے مسلسل رہ رہے ہیں ہمیں تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ اور چین میں جاپانی لڑکی والا قصہ تو خالصتہً گھڑا گھڑایا بلکہ ان کی ناآسودہ خواہشات کا ثبوت ہے کہ جاپانی لڑکیاں اپنے ملک کے اندر ایسی حرکت نہیں کرتیں کہ بن بلائے کسی اجنبی کے کمرہ پر جا دستک دیں وہ ملک سے باہر ایسی حرکت کرنے کا کیسے سوچ سکتی ہیں؟ یہ بات جاپانیوں کے قومی کردار کے خلاف ہے اور ہم وقار بن الٰہی کو بتائے دیتے ہیں کہ جاپانیوں کے ضابطۂ اخلاق میں ایسی کوئی بات بھولے سے بھی راہ نہیں پاتی جس میں جاپان کے نام پر حرف آتا ہو۔ میکار تھر انہیں راہ سے نہیں بھٹکا سکا تو دوسرے کس باغ کی مولی ہیں۔ ہم جاپان میں چار سال وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ جوان لڑکوں لڑکیوں سے قریبی تعلق رہا ان کی زندگی کے بہت سے اچھے برے پہلو دیکھے مگر یہ بات جو وقار نے گھڑی ہے سراسر غلط ہے۔ ایک جگہ انہوں نے جاپان کی بین الاقوامی امداد

باہمی کی ایجنسی JICA کا ذکر کیا ہے (صفحہ ۳۸۳) پاکستان میں اس کے مدار المہام تیتسو یا سوزوکی ہمارے شاگرد تھے ان سے ان کا واسطہ رہا کم از کم ان سے ہی پوچھ لیا ہوتا کہ ایسی بات انہونی تو نہیں؟ سوزوکی تو اچھی خاصی اردو بولنے والے افسر تھے ان سے گفتگو میں تو زبان بھی سد راہ نہ ہوتی۔

وقار نے اس بات کا بہت رونا رویا ہے کہ سکالر باہر جاتے ہیں تو لوٹ کر واپس نہیں آتے ''کیا اخلاقی حدود کوئی معنی نہیں رکھتیں؟'' (صفحہ ۳۳۹) حالانکہ ان کا اپنا بیان ہے کہ واپس آنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو ''چونکی یا بھائی پھیرو بھیج دیا جاتا ہے'' (صفحہ ۳۰۸) کیا اخلاقی حدود کی پاسداری صرف افراد کے لئے رہ گئی ہے؟ حکومت اور اس کے کارندے تمام اخلاقی حدود سے وراء الوراء ہیں؟

وقار نے تو تعریضاً بھائی پھیرو کا نام لیا ہے۔ ہم تو حکومت کے خرچ پر جاپان نہیں گئے تھے اعلیٰ تعلیم خود اپنے خرچ پر اپنے ملک میں حاصل کی تھی۔ پوسٹ گریجوایٹ ادارہ میں پڑھانے کا تجربہ تھا جس کی وجہ سے اس یونیورسٹی نے ہمیں منتخب کیا تھا۔ دنیا کی علوم السنہ کی تیسری بڑی یونیورسٹی میں چار سال کی تدریس کا تجربہ حاصل کرکے واپس آئے تھے۔ نو سال ہمیں انٹرمیڈیٹ کالجوں میں دھکے دیئے گئے؟ ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ حتیٰ کہ ایک ایسے گاؤں میں بھیج دیئے گئے جہاں تعداد کے پیش نظر کسی دوسرے استاد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف اس لئے کہ ہم ایک مختلف مسلک سے وابستہ تھے؟ اگر ہم پہلے موقعہ پر دنیا کی ایک اور یونیورسٹی کی آفر قبول نہ کرتے تو کیا کرتے؟ وقار نے باہر کی ملازمتیں قبول کر لینے والوں کو ملاحیاں سنائی ہیں (صفحہ ۳۳۹) مگر اپنے گریبان میں بھی جھانکا ہے؟ وقار بن الٰہی تو خوش قسمت ہے کہ اس کے کسی شاگرد نے اس کے واجبات ادا کروا دیئے ہمیں تو خود ہمارا جمع کیا ہوا پراویڈنٹ فنڈ بھی نہیں دیا گیا؟ کیا ہمارے لینے کے پیمانے اور اور دینے پیمانے اور نہیں؟ ہم نے کبھی یہ دکھڑا نہیں رویا مگر وقار بن الٰہی نے تعلیم والوں کا احوال بیان کیا ہے تو ہم نے بھی قوم کو آئینہ دکھانے کے لئے اپنی بات کہہ دی ہے۔

ان ناگوار باتوں کو چھوڑیئے۔ اس کتاب میں کئی خوب صورت باتیں بھی ہیں ''چواین لائی نے ایک یادگار کو اپنے نام منسوب کرنے کی بجائے چینی عوام کے نام منسوب کروایا (صفحہ ۱۸۶)'' امریکہ میں کالوں کو صرف دو ہی کام ہیں۔ مانگنا اور گانا بجانا'' (صفحہ ۳۱۹) انہیں شاید معلوم ہو گیا ہو گا کہ

امریکہ کی صدارت بھی اب ان کے کاموں میں شامل ہو گئی ہے۔ وزارت تعلیم کی ملازمت کے ''دوران دوسروں کو نقل کرنے سے روکتے رہے مگر خود اپنی کتاب کا ٹائیٹل پیرس کی ایک پینٹنگ سے نقل کیا چوری کروالیا'' (صفحہ ۶۰۲)

جو بات پڑھنے والے کو بہت کھلتی ہے وہ ان کے ڈومیسائل بلکہ غلط ڈومیسائل کا رونا ہے جو یہ بار بار روتے ہیں۔ یہ رونا (صفحہ ۸) سے شروع ہوتا ہے مگر صفحات ۳۶۳، ۳۸۷، ۳۹۸، ۴۱۶ تک چلتا چلا جاتا ہے؟ کیا ان کی ملازمت کی ساری منزلیں غلط ڈومیسائل کی وجہ سے کھوٹی ہوتی رہیں؟ اے کاش وقار اس بارہ میں افراط و تفریط کا شکار نہ ہوتا۔

پاکستان کے فزکس کے نامور پروفیسر ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کا ذکر بڑے نامناسب انداز میں کیا گیا ہے جو ہر پڑھے لکھے کو برا لگے گا۔ ''ایک ذات شریف ہیں ہد بھائی'' (صفحہ ۴۶۷) کیا ہود بھائی اس لئے تو نفرت کا نشانہ نہیں بن رہے کہ ان کا مسلک بھی عام عوام کے مسلک سے مختلف ہے؟ وقار بن الٰہی جیسے پڑھے لکھے سول سرونٹ سے ایسی زبان اور لہجہ کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔

مگر میں سوچ رہا ہوں ایک ماہر تعلیم کی خود نوشت پر تبصرہ کا اختتام کسی اچھی بات پر ہو تو کتنا اچھا ہو۔ اٹلی کی سیر کے دوران ایک ویٹرس سے واسطہ پڑا ''بل کے پیسے ویٹرس کے حوالے کئے اور دیکھتے رہ گئے یہ بھاگوان یہاں کیا کر رہی ہے؟ پاکستان کیوں نہیں چلی چلتی؟ وارے نیارے ہو جائیں گے'' (صفحہ ۱۸۰) معلوم ہوتا ہے مختار احمد صاحب ظفر علی خاں کی سیسل ہوٹل لاہور کی اطالوی ویٹرس کو بھول گئے ہیں۔ ظفر علی خاں کے دو ہی شعر ہمیں یاد ہیں وہ ان کی نذر کرکے تجزیہ کو سمیٹتے ہیں:

اے کشور اطالیہ کے باغ کی بہار
لاہور کا دامن ہے ترے فیض سے چمن
پیمانۂ نشاط تری ساقِ صندلیں
پروردۂ بہار ترا مرمریں بدن

اگر ہمیں وقار بن الٰہی کی طرح جزئیات کو بیان کرنے کی عادت ہوتی تو اس نظم کے باقی شعر بھی کہیں سے ڈھونڈ نکالتے۔

❁

پردہ سے پارلیمنٹ تک

بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی خودنوشت پردہ سے پارلیمنٹ تک آکسفرڈ والوں کی جانب سے ۱۹۹۸ میں انگریزی میں چھپی پھر اس کا اردو ترجمہ ۲۰۰۲ میں چھاپا گیا۔

بیگم شائستہ بنگال کے ایک معزز اور متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔تحریک پاکستان میں بھر پور حصہ لیا حالانکہ ان کے شوہر جناب اکرام اللہ آئی سی ایس کے رکن تھے اور انگریزوں کے ملازم تھے۔جب ان کی سیاسی سرگرمیوں پر اعتراض ہوا تو اکرام اللہ صاحب نے بڑا اچھا جواب دیا کہ میری بیوی کا تعلق بنگال کے ایک پرانے سیاسی خانوادے سے ہے جہانتک میرا تعلق ہے میں سول سروس کا رکن ہوں اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں اپنی بیوی کی سیاسی سرگرمیوں سے متاثر نہیں ہوتا" اس لئے اسے سیاست میں حصہ لینے سے روک نہیں سکتا" (پردہ سے پارلیمنٹ تک صفحہ ۷۴)

بیگم شائستہ سہروردی کی تعلیم کلکتہ میں ہوئی۔پی ایچ ڈی آپ نے لندن یونیورسٹی سے کیا۔آپ نے اپنی خودنوشت "پردہ سے پارلیمنٹ تک" پہلے انگریزی میں ۱۹۶۳ میں لکھی پھر خود ہی اسے اردو کا جامہ پہنایا۔ترجمہ پڑھتے ہوئے کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔

کتاب کا دیباچہ خواجہ ناظم الدین سابق گورنر جنرل اور وزیراعظم پاکستان نے لکھا ہے" پچھلی چار پشتوں سے ہم دونوں کے خاندانوں میں بہت قریبی تعلقات چلے آرہے ہیں۔بیگم اکرام اللہ کے دادا مولانا عبیداللہ العبیدی سہروردی جو مدرسہ عالیہ کے پرنسپل اور ڈھاکا کے ممتاز شہری تھے میرے پردادا نواب سر عبدالغنی اور میرے نانا نواب سر احسان اللہ کے ذاتی دوست تھے۔ان کے نانا نواب سید محمد کے بھی میرے خاندان سے دوستانہ مراسم تھے ان کا تعلق ڈھاکا کے ایک قدیم خاندان سے تھا وہ

بڑے خوش گفتار اور بذلہ سنج تھے اور اردو قلم کار و مصنف کی حیثیت سے بہت شہرت رکھتے تھے ---بیگم اکرام اللہ کے والد سر حسن سہروردی نے پبلک کیریئر کا آغاز کرنے میں دامے درمے میری مدد کی بیگم اکرام اللہ اپنے شوہر کے سرکاری منصب کے باوجود حصول پاکستان کی جدوجہد میں شریک تھیں۔کتاب پردے سے پارلیمنٹ تک ایک مسلمان خاتون کی دلچسپ داستانِ حیات ہے جس کی پرورش پرانی اسلامی روایات وثقافت کے سائے میں ہوئی۔ساتھ ہی اس نے جدید تعلیم حاصل کی اور رفتہ رفتہ ایک جدید تعلیم یافتہ عورت کی حیثیت میں ابھری جس نے قبل از تقسیم کے ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں نمایاں حصہ لیا---اور آخر وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی رکن بنیں---مجھے یاد ہے کہ مصنفہ اپنے والد کے یہاں سکول کی نوعمر لڑکی کی حیثیت سے میرے سامنے آیا کرتی تھیں کیونکہ ہمارے کنبوں کے درمیان بہت قریبی تعلقات تھے اور اس لئے بھی کہ وہ بہت کم سن تھیں اس طرح میں نے انہیں سچ مچ پردے سے نکل کر پارلیمنٹ میں جاتے دیکھا ہے" (پیش لفظ اول ایڈیشن)۔

بیگم اکرام اللہ نے اپنے نانا کے بارہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے "بدلتی دنیا میں پرانی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کی" (صفحہ ۷) ان کے ابا بھی "جدید خیالات رکھنے کے باوجود اپنی روایات کے سخت پابند تھے" (صفحہ ۲۰) مگر بیٹی کو انگریزی سکول میں داخل کروایا تو بہت جلی کٹی سننا پڑی۔خاندان کے ہر بزرگ نے اعتراض کیا تو ابا نے کہا" میں وہی کر رہا ہوں جو آج سے بیس برس بعد یہ سب لوگ کریں گے" (صفحہ ۲۲) چنانچہ وہی ہوا۔

شادی بھی پرانے رسم ورواج کے مطابق ماں باپ کی مرضی سے طے ہوئی۔اس سلسلہ میں مسز سروجنی نائیڈو کی کیا خوبصورت بات بیگم اکرام اللہ نے لکھی ہے کہ لندن میں ان سے مشرقی لڑکیوں کی شادیوں کے مسائل پر کسی نے سوال کیا" آپ کے ملک کی غیر شادی شدہ عورتوں کا مسئلہ کیا ہے؟" تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا" ہمارے ہاں غیر شادی شدہ عورتوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ہماری عورتیں شادی شدہ پیدا ہوتی ہیں" (صفحہ ۳۶)

مسٹر اکرام اللہ نے ان کو پردہ اتارنے کی اجازت دی انہی کی یہ خوب صورت بات انہی کے

لفظوں میں انتساب میں درج ہے کہ ''میرے شوہر کے نام جنہوں نے میرا پردہ چھڑوایا اور تب سے پچھتا رہے ہیں''۔ شوہر کا آئی سی ایس ہونا ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکا اور یہ سب کچھ دونوں کی وسیع النظری اور وسیع القلبی سے ممکن ہوا۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے عام دستور کو ترک کر کے اپنے نام کے ساتھ مسز کا سابقہ استعمال کرنے کی بجائے بیگم کا سابقہ استعمال کیا اور اس پر ثابت قدمی دکھائی۔

تحریک آزادی میں بیگم اکرام اللہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قائداعظم سے پہلی ملاقات کا حال دلچسپ بھی ہے اور دلگداز بھی۔ ''میرے ابا اکتوبر ۱۹۴۱ میں چند دنوں کے لئے انگلستان آئے۔ وہ میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن صبح ابّا نے کہا ''میں مسٹر جناح سے ملنے جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو''۔

''میں نہیں جاتی سنا ہے کہ وہ بہت مغرور ہیں اور لوگوں سے بدخلقی سے پیش آتے ہیں''

''حماقت کی باتیں نہ کرو۔'' ابا نے کہا ''یہ سب ہندو پروپیگنڈہ ہے میں چاہتا ہوں کہ تم ان سے ملو'' میں کچھ بددلی سے کچھ ڈرتے ہوئے گئی'' (صفحہ ۶۷)

مگر واپس آئیں تو قائداعظم کی شخصیت کے سحر کا شکار ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد سے مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد ہندوستان ٹائمز نے ان کی ذات پر بڑا سخت حملہ کیا تو بہت آزردہ ہو کر قائداعظم کے پاس گئیں۔ شکایت کی تو قائد نے ہندوستان ٹائمز کا وہ پرچہ دیکھا اور ان سے کہا یہ ''پرچہ تو میرے خلاف نہ جانے کیا کیا لکھتا ہے تو کیا میں ان کی پروا کروں؟ تم بھی پروا نہ کرو'' (صفحہ ۹۳)

کلکتہ کے فسادات کے دنوں میں ان کے ہاں بہت سے مہمان مدد طلب کرنے آتے تھے۔ تنگ آکر ابا سے شکایت کی تو ان کے ابا'' کو اس پر بہت ہی تعجب اور رنج ہوا۔ چند لمحوں کے لئے وہ میرے چہرے کو تعجب سے دیکھتے رہے کہ میں نے اس اصول کے خلاف بات کہہ دی ہے جس کی تعلیم انہوں نے اول دن سے مجھے دی تھی۔ پھر آہستہ سے کہا ''بیٹا! دوسروں کی مدد کرنا تمہارے خاندان کی روایت رہی ہے'' اور ایک دھیمی سانس لی اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں'' (صفحہ ۱۱۳)

پاکستان بننے کے بعد بھی قائداعظم کا یوم پیدائش بڑی تزک واحتشام سے منایا گیا مگر ہمیں تو

بیگم شائستہ کی یہ بات بہت خوش آئی ''جب ہماری بری بحری اور فضائی فوج کے نمائندے اپنی شاندار وردیوں میں قائد کو سلامی دیتے ہوئے گذرے تو میرے دل میں فخر وجوش کا جذبہ موجزن تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے اپنی کرسی سے آگے جھک کر چوہدری محمد علی کو مخاطب کر کے کہا' آپ کا کیا خیال ہے ہندوستان کا سفیر کیا سوچ رہا ہوگا؟ یہ کیسی قوم ہے کہ اسے ایک سیٹ نہ دو تو ایک ملک لے لیتی ہے'' (صفحہ ۱۲۵)

بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی رکن تھیں۔ بنگال سے یہ تھیں مغربی پاکستان سے بیگم شاہنواز۔ مگر لمبے عرصہ تک دستور سازی میں ناروا تاخیر روا رکھی گئی تو مستعفی ہو گئیں ''میرا استعفیٰ آئین سازی میں مسلسل تاخیر پر بطور احتجاج تھا'' (صفحہ ۱۳۲) ضمیمہ میں آپ نے قرارداد مقاصد کو موضوع بناتے ہوئے تقریر کی اور کھلے لفظوں میں اسے نامناسب قرار دیا۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کی ۱۲۶ اکتوبر ۱۹۵۳ کی تقریر یاد رکھنے کے قابل ہے'' جناب صدر! جب سے قرارداد مقاصد منظور ہوئی ہے۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ مارچ ۱۹۴۹ کی بات ہے تب سے اب تک ہم نے اخباروں میں متعدد مضامین دیکھے اور درجنوں تقریریں بھی سنی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم ایک عہد نو کی ابتدا کرنے والے ہیں۔ اور ہم کمال کے لوگ ہیں۔ میں جب ایسی تقریریں سنتی ہوں تو مجھے رومی کا شعر یاد آتا ہے۔ ''زنہار از آں قوم نہ باشی کہ فریبند۔ حق را بسجودے و نبی را بدرودے'' یعنی ہم ان لوگوں میں سے نہ ہو جائیں جو نمازیں پڑھ پڑھ کر خدا کو دھوکا دینے اور درود بھیج بھیج کر نبی کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں'' (صفحہ ۱۸۰)۔۔۔ ''ہم نے سوائے مذہب کے متعلق زبانی جمع خرچ کے گزشتہ چھ سالوں میں کچھ اور نہیں کیا اور ہم مذہب کا ذکر اس لئے کرتے ہیں کہ عوام کو اس کا احساس نہ ہو کہ ہم ان کی ضروریات کے متعلق کچھ نہیں کر رہے۔ ہم ان کے کھانے اور کپڑے کی بنیادی ضرورت تک پوری نہ کر سکے۔ نہ ان کے سر پر چھت ہے نہ ان کی بیماری میں ان کی دیکھ بھال کا انتظام ہے۔۔۔۔۔ دینی قوانین کا تقاضا ہے کہ اسلامی ملک میں ایک دولت مند آدمی کے پڑوس میں چالیس گھروں تک کوئی شخص بھوکا نہیں رہیگا۔ مذہب کے اس پہلو پر بھی کچھ کہا کریں'' (صفحہ ۱۸۳) مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تو وہ اپنے ضمیر کی خلش سے نجات حاصل کرنے کو مستعفی ہو گئیں۔

اس ملک کے آغاز ہی سے تعلیم کو بنیادی اہمیت نہ دی گئی۔ وزیر تعلیم ''فضل الرحمن بنگال کے نمائندے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اچھے اور نیک نیت آدمی تھے اور تعلیم کا لائحہ عمل اسلامی اصولوں کے مطابق بنانا چاہتے تھے لیکن وہ بے حد خود رائے تنگ نظر اور لکیر کے فقیر آدمی تھے اور وسیع النظری کو سمجھنے سے قطعی قاصر'' (صفحہ ۱۳۱) ایسا آدمی ملک کو صحیح تعلیم کے رستے پر کیسے ڈال سکتا تھا؟

یہ درست ہے کہ ملک کے حکمران دیانت دار تھے۔ خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل نے برطرف کیا تو ان کے پاس کراچی میں سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔ ''آدم جی نے اپنا فلیٹ ان کو سر چھپانے کو دیا''۔ (صفحہ ۱۵۲)۔

ان کے شوہر کی وفات کے بعد انہیں مراکش میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا جہاں آپ نے اپنی سفارتی ذمہ داریاں بہ طریق احسن نبھائیں۔ مراکش کے بادشاہ کی بیٹی کی شادی ہوئی تو اس کے ساتھ چھ غریب بچیوں کو بھی اسی طرح اور اسی قسم کے جہیز سے رخصت کیا گیا (صفحہ ۱۶۳)۔ عربی انہیں نہیں آتی تھی مگر آپ نے ''لغت قلوب'' (صفحہ ۱۶۴) کے سہارے اپنی سفارتی ذمہ داریاں نبھائیں۔ لغت قلوب اس زبان کو کہتے ہیں جنہیں ہم لوگ عام محاورہ میں اشاروں کنائیوں کی زبان کہتے ہیں۔

غرض بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ کی یہ خودنوشت نہایت صاف ستھری زبان میں لکھی گئی ایک وضع دار رکن اسمبلی، امیر زادی، سفارت کار اور ہمدرد اور دردمند عورت کی داستان ہے اے کاش سفارت کے بعد کے حالات بھی مرتب ہو جاتے تو پڑھنے کی چیز ہوتے۔

سرسری تم جہاں سے گذرے

بزرگ ادیب جناب اکرام بریلوی نے بانوے برس کی عمر کو پہنچ کر اپنی خودنوشت ''سرسری تم جہان سے گذرے'' تصنیف فرمائی ہے جسے بختیار اکیڈمی کراچی نے اگست ۲۰۱۰ میں شائع کیا ہے۔ اکرام صاحب ماشاء اللہ، چشم بد دور، اس عمر میں بھی فعال ہیں، ادبی تقریبات میں شرکت کرتے مضامین پڑھتے اور صدارتی فرائض سے بڑی خوبی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ یعنی اس پیر جواں سال و جواں ہمت نے قلم کو ہاتھ سے رکھ کے نہیں دیا یہ ہمت اور ولولہ بہت کم خوش نصیبوں کو مبداء فیض سے ارزانی ہوتا ہے۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے۔ ان کا اپنا قول کتاب کے پس ورق پر درج ہے جو یوں ہے کہ ''یہ خودنوشت میری ذات کی کئی جہات پر حاوی ہے اور پوری ایک صدی کی حقیقی اور زندہ داستان ہے اور صدی بھی ایسی طوفانی، تلاطم خیز اور ہنگامہ بر سر جس میں ایک دو نہیں کئی انقلاب رونما ہوئے''۔ ایسا شخص جس نے بیسویں صدی کے انقلابات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں اور اکیسویں صدی کے ابتدائی ہنگامہ خیز دور کو بقائمی ہوش و حواس دیکھا اور برتا ہو بذات خود ایک تاریخ بن جاتا ہے۔

بہت دوستوں کا اکرام صاحب سے مطالبہ تھا کہ اب ناول لکھنا چھوڑیئے اور اپنی خودنوشت لکھیے کہ خدانہ کردہ آپ کی آنکھیں مند گئیں تو ایک پورا دور پردہء اخفاء میں چلا جائے گا مگر وہ کسی کی بات پر کان نہیں دھرتے تھے جانے اس ہیچ مدان ''الٹے پڑھے لکھے'' (سرسری تم جہان سے گذرے صفحہ ۳۹۴) آدمی کی بات کس مبارک لمحہ میں منہ سے نکلی کہ اکرام صاحب اپنی خودنوشت لکھنے پر راضی ہو گئے اور چند مہینوں ہی میں اپنی چار سو صفحوں کی خودنوشت لکھ ڈالی اور دیباچہ میں اس کا ذکر بھی کر دیا۔

اکرام بریلوی بنیادی طور پر ناول نگار ہیں اس لئے ان کی خودنوشت کا اسلوب بھی باوجود ان کی شعوری کوششوں کے ناول ہی کا اسلوب معلوم دیتا ہے۔ وہی لمبے لمبے مکالمے اور لمبی لمبی تفصیلات جو ناولوں کا جزولاینفک ہیں ان کا دامن نہیں چھوڑتے اور تو اور خودنوشت کی ابتدا ہی ایک طول طویل مکالمے سے ہوتی ہے جو ان کی امی جان اور ان کے ابا جان کی مخبر ڈیرے دار طوائف کے مابین عین ان کے اپنے صحن میں ہوتا ہے۔ ''میرے والد اقبال حسین کاظمی بڑے دبدبے اور کروفر کے شہر کوتوال تھے۔ ایک ڈیرے دار طوائف لکشمی بائی کا گھر میں روز کا آنا جانا تھا جسے وہ اپنا خبر رساں یا مخبر کہا کرتے تھے۔ امی جان کو اس طوائف کی حاضری اس لئے گوارا تھی کہ اس کا گانا سننے کو مل جاتا تھا آواز بھی اس نے بلا کی پاٹ دار پائی تھی کوئل سی کوکتی تھی اکثر اس کی سب سے چھوٹی بہن موہنی بھی اس کے ساتھ آجاتی تھی اور دن بھر آنگن میں ہمارے ساتھ دھما چوکڑی مچایا کرتی۔ میں سات سال کا تھا موہنی مجھ سے دو ایک سال بڑی ہوگی۔ ایک دن نہ جانے کیا اس کے جی میں آئی چٹ سے ہمیں پیار کرلیا اس کا پیار کرنا ہمیں اتنا پیارا لگا کہ ہم نے بھی گلے لگا کر اسے چوم چوم لیا لکشمی کام کاج میں مشغول تھی۔ امی جان بجی سجائی مسہری کی پشت سے ٹیک لگائے سامنے بیٹھیں تھیں۔ یہ سماں دیکھتے ہی ان کے سر سے لگی پاؤں تک پہنچی۔ اور بلند آواز میں بولیں:

''غضب خدا کا دیکھا تو نے؟''

لکشمی امی جان کی آواز پر متوجہ ہو کر بولی

''جی کیا ہوا؟''

''تو نے دیکھا نہیں؟''

''جی نہیں''

''موہنی نے چٹاخ چٹاخ چنے میاں (ہماری عرفیت) کو پیار کرلیا اور اس نے بھی'' آگے وہ کچھ نہ کہہ سکیں

''کیا ہوا بچے ہی تو ہیں''، لکشمی نے دبی زبان سے کہا

''ہم اسے برا شگون سمجھتے ہیں، سنا ہے تم نے''

''جی کیا؟''

''آنے والے پل کا سایہ پہلے آتا ہے'' امی جان غصہ سے بولیں۔

''بہت ہوئی اب یہ یہاں نہیں رہے گا''

''پھر اس ننھی سی عمر میں کہاں جائے گا''، لکشمی بائی نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

''اپنی پھپّی اماں حسینی بیگم کے پاس بریلی'' امی جان نے غصے کو دباتے ہوئے جملے کے ٹکڑے کرتے ہوئے کہا۔'' (صفحہ ۷۔۸)

یہ سارا مکالمہ چار سطروں میں سما سکتا تھا مگر ناول کا اسلوب ان کا دامن کیسے چھوڑتا۔ ساری خودنوشت میں جہاں جہاں کسی مکالمے کا موقع آیا ہے اکرام صاحب نے پوری تفصیل سے وہ مکالمات درج کئے ہیں۔ ناول تفصیل کا متقاضی ہوتا ہے خودنوشت اختصار واجمال طلب کرتی ہے۔ اسی تفصیل طلبی کا شاخسانہ ہے کہ کرکٹ میچ کا ذکر آگیا ہے تو پوری کمنٹری کر ڈالی ہے ''پہلے ہمیں کھیلنا تھا حسب سابق ہم بلا ہوا میں لہراتے ہوئے پچ پر آئے کریز پر جم کر کھڑے ہوئے اور پہلی ہی بال پر کس کر لیگ سکوائر پر چوکا لگا دیا۔۔۔'' (صفحہ ۱۹۔۲۰) یہ کمنٹری پورے ڈیڑھ صفحے پر محیط ہے اور پھر لمبا مکالمہ! مشاعرہ کی روداد ہے تو ۶۷ سے ۸۶ صفحے تک یعنی پورے انیس صفحات تک وہی چلی جارہی ہے۔ آپ خود اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں۔ اختری بائی فیض آبادی کے مجرے کا ذکر ہے تو ان کی گائی ہوئی غزلوں سمیت پانچ صفحے کی پوری رپورٹ لکھ دی ہے (۲۰۷ تا ۲۱۲) غرض ان کی خودنوشت مکالماتی خودنوشت ہے جس کو موزوں انداز میں ڈھال کر مختصر کیا جاسکتا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ آپ نے ابا جان کے خوف سے گھر چھوڑ دینے کے نتیجہ میں جو سفر کئے ان کی تعداد کم تر اور تفصیل مختصر ہو جاتی۔ میں نے اکرام صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنی خودنوشت میں چھلانگیں بہت لگائی ہیں آج یہاں کل وہاں اب ادھر تب ادھر۔ ایک مقام کا ذکر ہو نہیں پاتا کہ آپ دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ ابھی آپ لاہور میں اختر شیرانی اور الطاف مشہدی کے ساتھ بیٹھے ہیں تو ایک ہی زقند میں بغیر ٹکٹ لئے کلکتہ پہنچ جاتے ہیں (صفحہ ۴۱۱) اکرام صاحب نے اس کا جواز یہ پیش کیا اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ناول نگار نہ بن سکتا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں ناول نگاری ان کے گھٹ میں اتر گئی ہے۔ جس کا رنگ چھٹائے نہیں

چھتا۔

اردو زبان کے آغاز کے بارہ میں ساغر نظامی کے ایک مبتدیانہ انٹرویو کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔ ان کی کم علمی یا تعلّی سے زچ آکر انٹرویو کرنے والے نے سوال کر دیا کہ آپ کن یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل ہیں تو ساغر نظامی کا جواب یہ تھا کہ ''ایک یونیورسٹی کا نام جواہر لال نہرو دوسری کا سروجنی نائیڈو اور تیسری یونیورسٹی کو ابوالکلام آزاد کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے'' (صفحہ ۱۵۷)

دلی میں ان کی بہت لوگوں سے ملاقات رہی۔ اعجاز بٹالوی ضیا جالندھری، مختار صدیقی، پھر دیوندر ستیارتھی اور ان کے ساتھ ابن انشاء، سید محمد جعفری، ماجد علی اور شاہد احمد دہلوی ان لوگوں کے نیم رخ کتاب میں موجود ہیں۔ عصمت چغتائی اور شاہد لطیف کی شادی پر شاہد احمد دہلوی کی پھبتی ہم نے پہلی بار ان کے ہاں پڑھی کہ ''شادی نہ ہوئی ن م راشد کی شاعری ہوگئی۔ ایک مصرعہ زرافہ کی گردن کی طرح بے اندازہ لمبا دوسرا اشتر کی دم'' (صفحہ ۱۴۱) ماجد صاحب جو بعد کو پاکستان کے فنانس سکرٹری کے عہدہء جلیلہ اور محترمہ زہرہ نگاہ کے شوہر نامدار کی حیثیت سے بہت نامور ہوئے کے باب میں لکھا ہے کہ ''ماجد علی کی عادت چٹکلے چھوڑنے کی تھی مگر ان کے چٹکلوں میں سنجیدگی کے ساتھ طنز کے زہر آگیں نشتر دبے ہوئے تھے'' (صفحہ ۲۲۷) اکرام صاحب نے تو ان کے کسی چٹکلہ کا حوالہ نہیں دیا۔ اپنے مشتاق احمد یوسفی نے ان کا ایک شہرہء آفاق چٹکلہ لکھ دیا ہے کہ ماجد صاحب اپنے وزیر کے پاس موجود تھے کچھ دور پر لوگ ایوب خاں کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے اور وزیر موصوف کا نام لے کر انہیں ایوب خاں کا چمچہ کہہ کہہ کر ان کی عزت افزائی کر رہے تھے۔ وزیر موصوف نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا ماجد صاحب یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ ماجد صاحب نے جواب دیا ''سر کچھ نہیں کچھ کٹلری کا ذکر کر رہے ہیں''۔

ریڈیو سے ناول نگاری کے کسی موضوع پر ان کے مضامین نشر کرنے کے فیصلے پر ان کے قول کے مطابق عبادت بریلوی اور وقار عظیم بہت ناراض ہوئے۔ یہ دونوں حضرات میرے محترم استاد ہیں اسی لئے اکرام صاحب کی بات کاٹنے کی جرات کر رہا ہوں۔ عبادت بریلوی صاحب نے اپنی خودنوشت میں صاف لکھا ہے کہ بخاری صاحب نے انہیں ریڈیو میں اس عذر کی بنا پر نہیں لیا تھا کہ آپ کی جگہ

یونیورسٹی ہے ریڈیو نہیں۔ آپ ریڈیو میں آگئے تو آپ کی تخلیقی تنقیدی صلاحیتیں ضائع ہو جائیں گی اس لئے وہ محض تبصرہ لکھنے کی خدمت کسی اور کو دے دینے پر اتنے سیخ پا کیوں ہوتے؟ پھر فکشن ان کا میدان نہیں رہا وہ شاید ایسی خدمت کے لئے راضی بھی نہ ہوتے۔ اکرام صاحب نے ضیاء جالندھری پر دھر کر استاذی المحترم سید وقار عظیم پر یہ فقرہ چست کیا ہے کہ ''وقار عظیم تو حد سے گذر گئے ہیں''۔

''یعنی''، ہم نے پوچھا

''کہتے ہیں''

''کیا؟''

''یہ بابوؤں کو کب سے ادیبوں میں شامل کیا جانے لگا ہے'' (صفحہ ۲۰۱)

یہ فقرے خود بول رہے ہیں کہ یہ بات وقار عظیم جیسے عظیم آدمی کے منہ سے سرزد نہیں ہو سکتی۔ وقار عظیم ادب کے استاد تھے۔ ریڈیو پر ٹاک دینا ان کے لئے نہیں ریڈیو کے لئے باعث عزت افزائی ہوتا۔ اے کاش اکرام صاحب اپنی یادداشت پر اتنا اعتماد نہ کرتے کیونکہ ان کی یادداشت اس ارزل العمر میں ویسی نہیں رہی کہ وہ وثوق سے کوئی بات کہہ سکیں۔ اس کی ادنیٰ سی مثال تو ان کے کالج کے زمانہ کی ایک یاد ہے اپنے دوست کی دکان پر رکے ہیں اور اس سے سائیکل خریدی ہے پھر اس سے کہا ہے یار ''کوک'' تو پلا دے۔ اس نے برف سے لگی ہوئی بوتل ڈبے سے نکالی اور ہمارے منہ سے لگا دی'' (صفحہ ۴۲) اس زمانہ میں ''کوک'' کا تو نام ہی ہندوستان میں کسی نے سنا نہیں ہوگا۔ پھر یہ بھی غضب آپ نے کیا ہے کہ ۱۹۴۴ میں ن م راشد سے بحث کرتے ہوئے فیض کی حبسیہ شاعری کے مجموعے ''دست صبا'' کا حوالہ دے دیا ہے (صفحہ ۲۲۲)۔ معلوم دیتا ہے کہ اکرام صاحب کے اندر بیٹھا ہوا چوکس ناول نویس بعض مقامات پر حسب حال مکالمے تصنیف کرنے سے نہیں چوکتا۔

انتظار حسین نے حلقہء ارباب ذوق کے دلی کے آخری اجلاس کی روداد عبادت بریلوی کے حوالے سے لکھی ہے جو ہم نے عبادت صاحب کے منہ سے سنی ہوئی ہے اور انتظار حسین نے پورے توثق سے اسے درج کیا ہے کہ

''۴۷ میں ۳ جون کے اعلان کے بعد کتنے یار جو دلی کے حلقہ میں شریک ہوا کرتے تھے

پاکستان چلے گئے۔ غلام عباس ابھی موجود تھے شہر میں حالات بہت خراب تھے کرفیو لگا ہوا تھا۔ آ گیا اتوار۔ غلام عباس کا گھر میرے گھر سے قریب ہی تھا۔ ان کا پیغام آیا میں ان کے ہاں پہنچ گیا کہنے لگے آج اتوار ہے حلقہ کا جلسہ نہیں ہوگا؟۔ میں نے کہا کیسے ہوسکتا ہے کرفیو میں کون آئے گا کہنے لگے ہم اپنے گھر یہ جلسہ کئے لیتے ہیں۔ میں نے کہا مگر لوگ کہاں ہیں؟ بولے کہ دیکھئے میرے پاس نیا افسانہ پڑھنے کے لئے موجود ہے آپ صدر بن جائیں گے۔ میں نے کہا اور سامعین کہاں سے آئیں گے؟ اس پر عباس صاحب نے تھوڑا سوچا پھر اندر گئے اور اپنے کتے کو پکڑ لائے بولے لیجئے سامعین کا انتظام بھی ہو گیا ہمارا ٹامی ہمارا افسانہ سنے گا۔۔۔ سو میں صدر بنا غلام عباس نے افسانہ پڑھا ٹامی نے افسانہ سنا'' (چراغوں کا دھواں صفحہ ۳۲۹) اکرام بریلوی صاحب نے بھی یہ روداد لکھی ہے ''شام چار بجے حلقہ ارباب ذوق کی ماہانہ میٹنگ ہونا تھی۔ ہم سیاسی ماحول کی ناسازگاری کے باوجود بروقت گھر سے نکلے۔ پہاڑ گنج کا پل پار کر کے عربیک کالج کے گیٹ کے قریب پہنچے تو غلام عباس مل گئے ایک سے دو ہوئے انہوں نے بتایا

''اعجاز بٹالوی کا فون ریڈیو سے آیا تھا''

''کیا؟''

''تم چلو ہم بھی پہنچتے ہیں حلقہ کا اجلاس ضرور ہوگا''

''لیکن حالات کے پیش نظر دفعہ ایک سو چوالیس لگی ہوئی ہے''

ہم نے جواباً کہا کوئی مضائقہ نہیں اجلاس تو عربیک کالج کے اندر ہوگا وہاں اس دفعہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ اعجاز بٹالوی کا کہنا تھا کہ ہم گھر سے چل پڑے۔ چار بجے کے قریب اعجاز بٹالوی بھی آ گئے۔۔۔ ہم تینوں عبادت بریلوی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر دوسرے آنے والوں کا انتظار کیا جب ساڑھے چار تک کوئی نہیں آیا تو اعجاز بٹالوی نے کہا

''کارروائی شروع ہونا چاہیئے''

۔۔۔ ہم لوگ یعنی غلام عباس اعجاز، عبادت بریلوی اور ہم عبادت صاحب کے کمرے سے نکل کر باہر آئے اور عربیک کالج کے کھلے سبزہ زار میں بیٹھ گئے۔ عبادت بریلوی نے صدارت سنبھالی

غلام عباس نے اپنا تازہ افسانہ تنقید کے لئے پیش کیا جس پر اعجاز بٹالوی اور ہم نے گرما گرم بحث کی آخر میں صاحبِ صدر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس ہنگامی اجلاس میں صاحب صدر کے علاوہ غلام عباس اعجاز بٹالوی اور ہمارے علاوہ ایک کتا بھی سارے وقت موجود رہا۔ اور اجلاس ختم ہوا تو دم ہلاتا ایک طرف چلا گیا'' (صفحہ ۲۳۸) اس واقعہ کے راویان شیوہ بیان میں اب انتظار حسین حیات ہیں یا اکرام بریلوی۔ دونوں کے بیان میں ''کتا'' مشترک ہے باقی جو کچھ ہے وہ یادداشت کے اختلاف کے زمرہ میں آتا ہے یہی کیا کم ہے کہ حلقہ کے دلی کے آخری اجلاس میں شامل ہونے والا کتا دو خودنوشتوں میں اپنے ''ادبی ذوق'' کے ساتھ موجود ہے۔

جعفر طاہر کو ہفت کشور پر آدم جی انعام ملا۔ اکرام صاحب نے سنی سنائی لکھ دی ہے کہ ''جعفر طاہر فیلڈ مارشل ایوب خاں سے انعام لینے گئے تو انعام لیتے ہوئے غش کھا گئے'' (صفحہ ۳۸۵) بہت سے راویان نے جن میں ضمیر جعفری جیسا معتبر راوی بھی شامل ہے ہمیں یہ بتایا تھا کہ جعفر طاہر فوج میں صوبیدار میجر تھے جب ان کا صوبیدار میجر جعفر طاہر کہہ کے نام پکارا گیا تو ایوب خاں نے بڑے فخر سے کہا دیکھا فوج میں بھی پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔ جعفر طاہر نے فوجی سیلیوٹ کیا اور کہا جی سر مگر نان کمشنڈ ہی رہتے ہیں۔

عسکری بیگم ان کی اہلیہ محترمہ تھیں ان سے عشق کی حد تک پیار کرتے تھے۔ ان کی ذرا سی رنجش سے اتنے دلبرداشتہ ہوئے کہ خودکشی کرنے کی ٹھان لی اور گھر سے نکل گئے اگر ان کے ایک عزیز بروقت نہ پہنچ گئے ہوتے تو قصہ تمام ہو گیا ہوتا (صفحہ ۲۳۵) انہی عسکری بیگم کے ذکر سے خودنوشت شروع ہوتی ہے کہ وہ ٹنڈل نرسنگ ہوم میں (تین سال کے عرصہ سے) یاد سے عاری معذوری کی زندگی گذار رہی ہیں (صفحہ ۷) اور انہی کے ذکر پر یہ خودنوشت ختم ہوتی ہے کہ ''ہم عسکری بیگم کے خیال سے غافل نہیں رہے۔۔۔ میں سوچنے لگتا جیسے طے کر چکی سفر مرے حصے کی روشنی اور یہی سوچتے سوچتے دور تک جلتے بجھتے چراغوں کا دھواں سا میری آنکھوں میں بھر جاتا'' (صفحہ ۴۰۴) اور یہ تو یہاں کے سب احباب جانتے ہیں کہ اکرام صاحب ہر روز جی ہاں ہر روز سردی ہو، یا گرمی، مینہ پڑے یا برف۔ یخ بستہ ہوا چل رہی ہو یا حبس آلود فضا میں گھر سے باہر نہ نکلنے کے انتباہ تواتر سے نشر ہو رہے ہوں، ٹنڈل نرسنگ

ہوم جانے اور خلاء میں خالی خالی نگاہوں سے گھورتی اپنی عسکری بیگم کے پاس جانے میں کبھی ناغہ نہ کرتے اور یہ بات بھی ہم سب کو معلوم ہے کہ یہ سارا سفر بس پر طے ہوتا کہ انہیں گاڑی چلانے کی اجازت نہیں۔ ایسا پیار بھی کم ہی دیکھنے سننے میں آتا ہے۔ حیف کہ اب عسکری بیگم مٹی میں جا سوئی ہیں اور اکرام بریلوی اپنی ذات اور گھر میں تنہا رہ گئے ہیں۔

غرض یہ خودنوشت عسکری بیگم مرحومہ سے اور ادب سے ان کی بے غرضانہ اور پرخلوص محبت کی گواہی دیتی رہے گی۔

❁

میرا افسانہ

ادیبِ شہیر مُلا واحدی دہلوی کی ناتمام خودنوشت ''میرا افسانہ'' نشریات اردو بازار لاہور والوں کی جانب سے ۲۰۰۹ میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ جناب مالک رام مرحوم ومغفور نے ''ملاحظات'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا اور لکھا تھا کہ ''قبل تقسیم کی دلی میں مُلا واحدی کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔ خاندانی وجاہت اور سماجی خدمت کے باعث ان کی خاصی شہرت تھی انہوں نے جو کچھ کیا ہو وہ اپنی جگہ لیکن اردو صحافت میں بھی ان کے کارنامے کچھ کم اہم نہیں۔ وہ اردو کے اچھے ادیب تھے ان کی زبان سادہ سلیس دلی کی مستند زبان ہے۔ اگر وہ اپنے پیر و مرشد خواجہ حسن نظامی کی طرح اردو انشائیے کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے تو ان کا نام تاریخ ادب میں کسی کے مٹائے نہ مٹتا۔ اب بھی وہ جو کچھ چھوڑ گئے ہیں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میرا افسانہ کے عنوان سے لکھنا شروع کی افسوس کہ وہ اسے مکمل نہ کر سکے ۲۱ فروری ۱۹۶۶ کو ان پر فالج کا حملہ ہوا اور لکھنے کا کام رک گیا۔ سال ڈیڑھ سال تک وہ اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے مزید ایک باب قلمبند کیا اور اسی پر یہ افسانہ ختم کر دیا۔ ۲۲ اگست ۱۹۷۶ کو وہ اپنے خالق حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ جتنے صفحات انہوں نے لکھے تھے ان کے پوتے سید محمد علی واحدی نے سائیکلو سٹائل کر کے دوست احباب میں تقسیم کر دیئے تھے اندیشہ تھا کہ یہ تحریر کہیں ضائع نہ ہو جائے اس لئے ہم نے تحریر کی ایک اشاعت وقف کرنے کا فیصلہ کیا۔ نام نیک رفتگاں ضائع مکن۔ تا بماند نام نیکت برقرار۔'' (میرا افسانہ صفحہ ۵-۶)

یہ مختصر مگر ہمہ صفت موصوف خودنوشت جو محض ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۱۴ ستمبر ۱۹۶۹ کو واحدی

صاحب کے اس فرمودہ پر اختتام پذیر ہوتی ہے کہ ''اپنے حالات لکھنے میں خرابی یہ ہے کہ طوطے کی طرح اپنے منہ سے اپنے تئیں ''میاں مٹھو'' کہنا پڑتا ہے۔ کچھ نہ کچھ خودنمائی ضرور کرنا پڑتی ہے'' (صفحہ ۱۴۴)۔ حالانکہ کتاب کے پیش لفظ میں کہہ چکے ہیں ''بڑا آدمی ہونے کی قید نہیں ہے۔ ہر ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی زندگی میں ایسے واقعات گذرتے ہیں کہ آدمی کو تولنا اور بیان کرنا آتا ہو تو ان واقعات سے دنیا سبق سیکھ سکتی ہے اور فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ مجھے اپنی حیثیت کا الحمدللہ احساس ہے میں واقف ہوں کہ میرے حالات پڑھنے کا کسے شوق ہو سکتا ہے یہ حالات اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے گئے ہیں یہ صرف اولاد کے لئے ہیں'' (صفحہ ۷) ساتھ میں یہ ارشاد بھی درج ہے کہ ''میں اگر بیان کرسکنے کے دعوے میں تکلف برتوں تو اس کے معنیٰ ہیں کہ اپنی حیثیت کے احساس کے متعلق جو کچھ اوپر کہا ہے وہ بھی تکلف ہے اور جتنا حال اس کتاب میں درج ہے وہ بھی مبالغے سے پاک نہیں ہے۔ حیثیت کے گھٹانے سے بھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے مرنے کے بعد اللہ کے سایہء رحمت میں جگہ مل گئی تو پھر حیثیت ہی حیثیت ہے۔ ایک شاعر صاحب فرماتے ہیں ''ماز آغاز وانجام جہاں بے خبریم۔ اول وآخر ایک کہنہ کتاب افتادست'' یعنی شاعر کائنات کے آغاز وانجام سے بے خبر ہے اس کے سامنے کتاب کائنات کے سارے اوراق موجود ہیں مگر کتاب کا پہلا اور آخری ورق گم ہو گیا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ دونوں ورق مجھے مل گئے ہیں۔ کائنات کے سارے ورق میرے پاس سامنے نہ سہی لیکن کائنات کے یہ گمشدہ ورق میرے پاس ہیں'' (صفحہ ۸) ''میرا افسانہ'' انہی دو اوراق گم گشتہ کی مجمل سی تفسیر وتشریح پر مشتمل ہے اور خود ان کے قول کے مطابق ''میری موت سر پر منڈلا رہی ہے اس تحریر کو Dying Declaration (مرتے وقت کی وصیت) سمجھنا چاہیئے'' (صفحہ ۹۸)

سید محمد ارتضیٰ واحدی صاحب خواجہ حسن نظامی دہلوی سے بیعت تھے اور انہیں اپنا ادبی اور روحانی مرشد جانتے تھے۔ انہی کے ارشاد پر رسالہ ''نظام المشائخ'' نکالا۔ ''نظام المشائخ'' جاری ہوا تو ''لوگوں نے واحدی کے ساتھ مولوی اور مولانا لکھنا شروع کیا اس سے طبیعت گھبراتی تھی کہ ہوں خاک نہیں اور کہلاؤں مولوی مولانا۔ لہذا سوچا کہ لفظ کوئی لگانا ہی ہے تو مُلا کا لفظ لگایا جائے میرا خیال تھا کہ مولوی مولانا کہلانے سے بہتر ہے کہ ملا کہلاؤں' اور اب تو میری شناخت ہی لفظ مُلا سے ہوتی

ہے'' (صفحہ ۱۰)۔ اور اللہ کی شان کیا زمانہ آن لگا ہے کہ اب ہر ان پڑھ ان گھڑ ملا جو الف کے نام ب نہیں جانتا، اپنے آپ کو مولوی تو مولوی مولانا سے کمتر کہلانے پر راضی نہیں!

واحدی صاحب نے اپنی حیثیت کو گھٹا کر بیان کرنے کا جو قرینہ بیان کیا ہے اس کا ایک معمولی ساذکر جناب مشتاق احمد وجدی صاحب کی خودنوشت میں ہے ''دلی میں ان دونوں کی شان وشوکت دیکھنے کے بعد دونوں سے پاکستان میں ملتا رہا جتنی مرتبہ ملا گردش آسمان کے کرشموں سے انگشت بدنداں رہا دونوں کو یا تو محلوں میں دیکھا تھا یا اب جھونپڑوں میں عسرت کی زندگی بسر کرتے دیکھا'' (ہنگاموں میں زندگی صفحہ ۵۴) جناب مالک رام نے اردو صحافت کے ساتھ ان کی وابستگی کا جوذکر کیا ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ ایک وقت تھا کہ واحدی صاحب کے قول کے مطابق ''ہفتہ وار طبیب، ہفتہ وار خطیب، ہفتہ وار انقلاب، ہفتہ وار درویش، ماہنامہ نظام المشائخ، ماہنامہ استانی، ماہنامہ گل چیں، ماہنامہ بیداری، روزنامہ رعیت، نو پرچے میرے اہتمام میں شائع ہوتے تھے۔ کتابوں کا کاروبار الگ تھا یہی دور تھا کہ میں شام کو آمدنی کا بچا ہوا روپیہ لے کر مردانے سے زنانے میں جاتا تھا تو روپوں کی تھیلی بوجھل معلوم دیتی تھی'' (صفحہ ۹۲)

ان کے لکھنے کا آغاز تو سکول کے زمانہ سے ہی ہو گیا تھا۔ برصغیر کے مشہور پرچوں وکیل امرتسر، دلی کے ماہنامے زبان لاہور کے اخبار، وطن اور روزنامہ پیسہ اخبار میں ان کے مضامین چھپنا شروع ہو گئے تھے۔ مگر ان کے کسی بزرگ نے ان کے استاد سے ان کی پڑھائی کی رفتار کے متعلق پوچھا تو استاد نے جواب دیا ''ان کی آوارگی روز افزوں ترقی پر ہے۔ یہ کہہ کر مجھے دیکھا میرے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ کیوں کہ میں کیسا بھی رہا ہوں مگر آوارہ عمر کے کسی حصے میں نہیں رہا۔ آوارگی سے مجھے مناسبت نہیں ہے۔ میرا چہرہ متغیر دیکھا تو مولوی فضل الدین صاحب نے وضاحت فرمائی کہ طالب علمی کے زمانے میں مضمون نگاری کرنا بھی آوارگی ہے۔'' (صفحہ ۴۳)

احوال الرجال میں اقبال، علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، نواب بہادر یار جنگ، سر شیخ عبدالقادر، ظفر علی خاں، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالماجد دریابادی، اکبر الہ آبادی سردار دیوان سنگھ مفتون جیسے اکابر کا سرسری ذکر ہے۔ اقبال کے بارہ میں یہ بات نئی معلوم دی

کہ انہیں ان کا نام واحدی بہت خوش آیا فرمانے لگے "اقبال کا نام مشہور ہو چکا ہے ورنہ میں تم سے
تمہارا عرف چھین لیتا" (صفحہ ۹) اقبال سے ان کا اپنا "بیگانہ اور گستاخانہ" مکالمہ بھی درج ہے۔
اقبال سے کہا "آپ جیسا لکھتے ہیں ویسا بولتے نہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے اس سوال پر منہ نہیں بگاڑا
میری طرف سے رخ نہیں پھیرا بلکہ ہنس کر فرمایا جتنی محنت لکھنے میں کرنی پڑتی ہے اتنی بولنے میں بھی
کرنے لگوں تو دیوانہ ہو جاؤں بولتا میں انگریزی بھی بے پروائی سے ہوں مگر لکھتے وقت انگریزی اور
اردو دونوں کے الفاظ کو اس طرح تراشتا ہوں جس طرح شیشے سے نگینہ تراشا جاتا ہے" (صفحہ ۷۷)۔
اقبال کے لہجے پر تو رشید احمد صدیقی نے یہ تک لکھ دیا تھا کہ "سر اقبال سے پہلے پہل شرف نیاز حاصل
کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اردو لہجہ اور تلفظ سن کر دم بخود رہ گیا تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی
غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے" (آشفتہ بیانی میری صفحہ ۵۴) راقم الحروف نے صدیقی صاحب کے اس
ارشاد پر صرف اتنا تبصرہ کیا تھا کہ "رشید احمد صدیقی خود جونپور کے رہنے والے تھے" (پس نوشت
صفحہ ۹۴)۔ ملا واحدی تو پھر دلی کے روڑے تھے۔

مولانا شبلی کچھ عرصے کے لئے ان کے مکان پر ٹھہرے تو اپنا باورچی ساتھ لائے مگر اس سے
سالن نہیں پکواتے تھے خود پکاتے تھے اس سے صرف چپاتیاں بنواتے تھے۔ (صفحہ ۷۳)

مولانا محمد علی جوہر اور خواجہ حسن نظامی میں ٹھن گئی تو باوجود خواجہ صاحب کی بیعت میں ہونے
کے غیر جانبدار رہے (صفحہ ۸۶)۔ مرزا غلام احمد قادیانی بانیء سلسلہء احمدیہ دہلی تشریف لے گئے تو
"اپنے ساتھیوں آصف علی، رؤف علی، حیدر رضا سمیت مرزا صاحب کے دیدار کرنے گئے۔ مرزا
صاحب مکان کے بڑے ہال میں تشریف فرما تھے ان سے پانچ گز پرے حکیم نورالدین الگ بیٹھے
تھے۔ حیدر رضا نے مرزا صاحب سے چند سوال کئے مرزا صاحب نے حکیم نورالدین سے کہا بھئی تم
جواب دو میں تو اندر جا رہا ہوں۔ حیدر رضا بولے "حضرت ہم تو آپ کے جواب کے مشتاق ہیں اور
سے ہمیں بات نہیں کرنی چاہیئے"۔ مرزا صاحب نے التفات نہیں فرمایا اور زنان خانے میں چلے گئے"
(صفحہ ۵۴۔۵۵) اس مخالفانہ تحریر میں بھی ان کی شرافت بول رہی ہے وہی دلی والوں کی مہذب
اور شریفانہ گفتگو۔

ماسٹر احمد حسین فرید آبادی سابق ایڈیٹر اخبار وکیل امرتسر مخلص "احمدی تھے مرزا غلام احمد قادیانی
کے عاشق۔ جب کام کا وقت گذر جاتا تو ماسٹر احمد حسین مجھے احمدی ہونے کی دعوت دیا کرتے تھے میں
نے ایک دن کہا ماسٹر صاحب! میں خواجہ حسن نظامی کا مرید نہ ہو گیا ہوتا تو آپ کا مرید ہو جاتا۔ مرزا
غلام احمد کی طرف میری طبیعت نہیں کھنچتی۔ ماسٹر صاحب بے حد نیک انسان تھے" (صفحہ ۸۵)

سر عبدالقادر کے ذکر میں ان سے تسامح ہوا۔ لکھتے ہیں "شیخ عبدالقادر وائسرائے کی ایگزیکٹو
کونسل کے ممبر ہو کر دلی پہنچے۔ کونسل کی ممبری کے دور میں بھی میرا ان سے ملنا جلنا رہا اب وہ سر عبدالقادر
تھے" (صفحہ ۷۶) سر عبدالقادر پنجاب میں وزیر رہے۔ گورنر کی عاملہ کے رکن رہے۔ ہائی کورٹ کے
جج رہے۔ کونسل کے صدر رہے لندن میں وزیر ہند کی مشاورتی کونسل کے رکن رہے (تحدیث نعمت
صفحہ ۳۹۵) جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر کبھی نہیں
رہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

غرض ملا واحدی کی یہ مختصر خودنوشت اپنی صدق گوئی اور خلوص نیت کی وجہ سے اردو کی خود
نوشتوں میں ہمیشہ ممتاز رہے گی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ایک سفارت کار کی سرگذشت

''ایک سفارت کار کی سرگزشت'' ہندوستان کے ایک سابق سفارت کار جناب سید مظہر حسین ایم اے علیگ کی خودنوشت ہے جو شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ سن اشاعت درج نہیں مگر ان کے برادر اصغر سید اظہر حسین سابق ڈپٹی کنٹرولر ریڈیو پاکستان کے تعارفیہ پر دسمبر ۲۰۰۲ کی تاریخ درج ہے۔

سید مظہر حسین علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۵۲ میں ہندوستان کی وزارت خارجہ سے منسلک ہوئے اور چھ ملکوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کی۔ ملازمت کا آغاز ہی سعودی عرب سے ہوا یوں حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے مواقع بھی انہیں نصیب ہوئے۔

کتاب کے فلیپ پر ناشرین نے لکھا ہے کہ ''بحیثیت ایک سفارت کار چھ ملکوں میں سفارتی خدمات کا اعلیٰ معیار قائم کیا آخر میں واشنگٹن امریکہ میں پوسٹنگ ہوئی وہیں سے ریٹائرمنٹ کے بعد اقوام متحدہ سے رابطہء عالم اسلامی کے نمائندہ کی حیثیت سے ایک عرصہ تک خدمات انجام دیتے رہے عالمی شہرت کے مدبرین اور سربراہان مملکت سے بخوبی متعارف تھے اپنی سرگزشت میں ملک ملک کے حالات اور کوائف اس طرح تحریر میں لائے کہ قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک حقیقت پر مبنی ناول پڑھ رہا ہے یہ کتاب مصنف کی گرانقدر شخصیت کی نہ صرف آئینہ دار ہے بلکہ ایک یادگار اثاثہ بھی ہے'' اگر صرف ادارہ کے لکھے ہوئے تعارف پر انحصار کیا جائے تو اس سے زیادہ مغالطہ انگیز تعارفیہ کم از کم اس سے قبل میری نظر سے نہیں گذرا۔ مصنف سفارت کاری کے پیشہ سے منسلک رہے مگر جو اعلیٰ سفارتی خدمات کے معیار آپ نے قائم کئے ان کا شمہ بھر ذکر بھی اس کتاب میں موجود نہیں۔ دوسرا دعویٰ یہ

ہے کہ آپ عالمی شہرت کے مدبرین اور سربراہان مملکت سے بخوبی متعارف رہے۔ سوائے ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہء ہند کسی سے ان کی کسی شناسائی کا ذکر نہیں نہ کسی عالمی مدبر سے ان کے تعلقات کا ذکر درمیان میں آیا ہے۔ اب رہا یہ دعویٰ کہ یہ سرگزشت حقیقت پر مبنی کوئی ناول لگتی ہے تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ لکھنے والے نے ناول کا محض لفظ ہی سنا ہے کسی ناول کو پڑھنے کا بھی انہیں اتفاق نہیں ہوا ورنہ وہ اس سرگزشت کو ناول کا نام نہ دیتے۔

راقم الحروف نے پہلی بار بڑے چاؤ سے ایک ہندوستانی سفارت کار کی سرگزشت کا مطالعہ شروع کیا تھا اور اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کی تھیں کہ ہمارے اس ہم عصر سفارت کار کی سرگزشت خاصے کی چیز ہوگی لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدے۔ اس سرگزشت میں سفارتی معاملات و امور کا ذکر اذکار تو کیا درمیان میں آتا۔ مصنف کو اپنے خاندان اور اعیال و احفاد کے ذکر سے ہی فرصت نہیں ملی۔ ابتدا میں علی گڑھ کا ذکر ہے مگر وہ بھی اس لئے کہ کسی علیگ کو اس سے مفر نہیں۔ ان کے بھائی آئی اے ایس کے رکن تھے۔ کمشنر ہوئے۔ ان کی نیک شعاری کا ذکر ہمیں بہت خوش آیا کہ نمازی پرہیزگار آدمی تھے سفر میں ہوتے تو سرراہ گاڑی رکوا کر اذان دلواتے اور نماز ادا کرتے پھر آگے روانہ ہوتے (ایک سفارت کار کی سرگزشت صفحہ ۲۳) ایسے ملک میں جہاں غیر مسلموں کی اکثریت تھی ایسی جرات جرات مومنانہ کے زمرہ میں شمار کی جائے گی۔ ان کے والد گرامی کا یہ اسوہ بھی قابل تقلید ہے کہ بچوں کو نصیحت کرنا چاہتے تو بجائے انہیں کہنے سننے کے دیوار پر لکھ دیتے ''بے ادب بے نصیب باادب بانصیب'' (صفحہ ۳۴) فارسی والوں کی بات کیا خوب ہے مرد باید کہ گیرد اندر گوش۔ ورنوشت است پند بردیوار۔

باقی کتاب غیر ضروری افادات سے بھری پڑی ہے اور ایسی معلومات درج ہیں جو سیر کرنے کے لئے جانے والے دکانوں سے خرید کران سے مستفید ہوتے ہیں۔

❁

رقصِ شرر

ملک زادہ منظور احمد کی طول طویل خودنوشت رقصِ شرر کے عنوان سے ۲۰۰۴ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ آخری فقرہ یوں ہے کہ ”بحمد اللہ سفر ابھی جاری ہے آگے کے ماہ وسال جاننے کے لئے پڑھیں رقصِ شرر (خودنوشت) کا دوسرا حصہ جو زیر ترتیب ہے اور انشاء اللہ بہت جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوگا“ (رقصِ شرر صفحہ ۵۷۶)۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک زادہ صاحب کا مطلب ہے کہ ابھی مشاعرے جاری ہیں جب تک لوگ مشاعروں کی نظامت کے لئے انہیں تکلیف دیتے رہیں گے ان کا سفر جاری رہے گا۔ ہمیں تو ان کی نظامت میں ہونے والے کسی مشاعرہ کو سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خدا معلوم جن مشاعروں کی نظامت ”یہ اپنی آواز کے جادو“

(صفحہ ۵۲۷) کے زور پر کرتے رہے ان کا کیا عالم رہا ہوگا۔ امجد اسلام امجد کی رائے آپ نے بڑے فخر سے درج کی ہے کہ ”پاکستان میں ملک زادہ منظور احمد جیسی کوئی شخصیت نہیں پائی جاتی اگر خواجہ محمد شفیع، افتخار عارف اور راغب مرادآبادی کو جوڑ دیا جائے تو حاصل جمع ملک زادہ منظور احمد بنیں گے۔ یہ جملہ پڑھ کو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے اپنی ساری دوڑ دھوپ کا صلہ مل گیا یا ایک پاکستانی رسالہ ”دنیائے ادب“ میں جب یہ شائع ہوا کہ پاکستان کے نظامت کرنے والوں کو یہ فن ملک زادہ منظور احمد سے سیکھنا چاہیئے تو مجھے یہ لگا کہ میں نے واقعی مشاعرہ کی نظامت کو ایک فن کا درجہ عطا کر دیا ہے“ (صفحہ ۵۶۳) امجد اسلام امجد کی تعریف کا تجزیہ کریں تو بات یوں بنتی ہے کہ خواجہ محمد شفیع دہلوی کا تو امجد نے صرف نام ہی سنا تھا کیونکہ امجد کے سن شعور تک پہنچتے پہنچتے خواجہ صاحب اتنے ضعیف ہو چکے تھے کہ انہوں نے مشاعروں کی نظامت ترک کر دی تھی۔ افتخار عارف نے کبھی مشاعروں کی نظامت

کے فن میں یکتا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اب رہے راغب مرادآبادی تو ان کی فی البدیہہ تک بندیوں والے تعارف کو اہلِ ذوق نے ہمیشہ زہرخند سے سنا ہے ملک سے دور رہنے والے امارات کے باسی ان کی تک بندیوں سے محظوظ ہوتے ہوں تو یہ ان کا اپنا ”حسنِ ذوق“ ہے۔ رہی سہی کسر حکیم راغب مرادآبادی نے کم ذوقی یا بدذوقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جوش ملیح آبادی کے برہنہ گفتاری سے مزین خطوط چھپوا کر نکال دی ہے جس سے ”مس راغب مرادآبادی“ کا تصور اور بھیانک ہو گیا ہے۔ ملک زادہ منظور کو تو اپنی نظامت پر اتنا ناز ہے کہ ایسے حوالے بھی درج کرنے سے نہیں رکتے جن کو درج کرنا اہلِ ذوق کے نزدیک کم ذوقی سمجھا جاتا ہے۔ بحرین کے ایک امیر البحر کا قول آپ نے درج کیا ہے کہ ”آپ نے بحرین کی خواتین پر کیا جادو کر دیا ہے کل شام سے جب سے میں آیا ہوں سبھی خواتین آپ ہی کا تذکرہ کر رہی ہیں“ (صفحہ ۳۱۴) حالانکہ اس مشاعرہ میں حمایت علی شاعر، بشیر بدر، جگن ناتھ آزاد، خمار بارہ بنکوی، کرار نوری اور احمد فراز اور جون ایلیا نے اپنے کلام سے لوگوں کو نوازا تھا گویا یہ سب لوگ محض ضمنی حیثیت رکھتے تھے اور مشاعرہ اس لئے چمک گیا تھا کہ مشاعرہ کی نظامت ملک زادہ صاحب نے کی تھی۔ انہیں ذرا ذرا سی باتیں یاد ہیں اپنے امتحانوں کے رولنمبر اور حاصل کردہ نمبروں تک کی تفصیل انہیں یاد ہے (صفحہ ۳۸) ان کے ایک دوست کی کتاب پر فراق نے دیباچہ لکھا تھا وہ بھی لفظ بہ لفظ انہیں یاد ہے۔ (صفحہ ۱۱۶) تو اپنی تعریف میں کہی گئی باتیں کیسے انہیں بھول جاتیں؟

ان کی خودستائیوں سے صرف نظر کریں تو ہندوستان کے شعراء کے بارہ میں عموماً اور رہنماؤں کے بارہ میں خصوصاً بڑی نئی اور کام کی باتیں سامنے آتی ہیں۔ مثلاً ایک کانگریسی رہنما کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا ”کیا بات ہے آج کل کانگریس کی نگاہ کرم بریلوی مولویوں پر ہے۔ پالیمنٹ اور اسمبلی میں دونوں جگہوں پر انہیں کا بول بالا ہے۔ حالانکہ جنگ آزادی میں دیوبندی مولویوں نے آپ کا ساتھ دیا تھا۔ کہنے لگے ملک زادہ! تم اس راز کو نہیں سمجھو گے۔ ہم لوگ سیاست دان ہیں ہمیں ایسے آدمیوں کی ہر جگہ ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ مجمع ہو اور جو مجمع لگانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ دیوبندی مولوی ہر اس چیز کو ناجائز کہتا ہے جو بھیڑ اکٹھا کرتی ہے جلوس ناجائز ہے میلاد درست نہیں۔ عرس بدعت ہے۔ اس کے برخلاف بریلوی مولوی جلسہ جلوس عرس قوالی اور

حلوے مانڈے جیسی چیزوں کو حدِ شریعت میں لاکر مجمع لگالیتا ہے اور ظاہر ہے جمہوریت میں بھیڑ بہت اہمیت رکھتی ہے۔'' (صفحہ ۲۷۶)

ایک مشاعرہ میں نظامت کے لئے بلائے گئے تو کسی دوست سے قرض لے کر ایک نئی نفیس کپڑے کی شیروانی سلوائی اور پہن کر گئے۔ اس مشاعرہ میں جو وزیر حافظ محمد ابراہیم مہمان خصوصی کے طور پر آئے تھے آپ نے دیکھا کہ ''ان کی کھدر کی شیروانی پر پیوند لگے ہوئے ہیں'' (صفحہ ۱۳۴) انہی حافظ محمد ابراہیم کے صاحبزادے بھی وزیر ہوئے انہیں ایک مشاعرہ والوں نے مدعو کیا۔ وزیر موصوف ایک گھنٹہ دیر کر کے پہنچے۔ مشاعرہ کے منتظم مولانا خیر بہوروی تھے آپ نے فرمایا ''وزیر صاحب محترم لکھنؤ کے بہت سے شرفا کو میں نے اس جلسہ میں مدعو کیا تھا وہ لوگ آپ کا انتظار ایک گھنٹے تک کر کے چلے گئے۔ اور جو موجود ہیں وہ بھی اپنی مصروفیات کی وجہ سے جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کے والد محترم حافظ محمد ابراہیم صاحب ہوتے تو میں ان سے شکایت کرتا۔ آپ سے صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ اب آپ ہی اس جلسے کی صدارت کیجئے اور افتتاح کیجئے اور سامعین کو اپنی تقریر سے نوازیئے۔ میں چلا'' یہ کہہ کر مولانا نے بیگ اٹھایا اور روانہ ہو گئے۔ وزیر محترم ہکا بکا رہ گئے اور جلسہ درہم برہم ہو گیا'' (صفحہ ۶۳) یہ وہی حافظ محمد ابراہیم ہیں جو بعد کو گورنر ہوئے اور جن کا ذکر جلیل عباسی نے اپنی خودنوشت ''کیا دن تھے'' میں کیا ہے کہ ''مرے تو ان کی قبر پر کتے لوٹتے تھے کیونکہ ان کے لواحقین ان کی قبر کو پختہ کروانے کی مقدرت نہیں رکھتے تھے۔'' (کیا دن تھے۔ صفحہ ۱۶۱)

مولانا اشرف علی تھانوی کے ذکر میں لکھا ہے کہ شوکت تھانوی کو قادیان سے مشاعرہ کی دعوت ملی۔ شوکت کے والد نے جانے سے روک دیا مگر مولانا اشرف علی تھانوی نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ شوکت تھانوی نے پوچھا مولانا آپ نے کیوں اجازت دے دی۔ مولانا نے فرمایا میاں تمہیں اپنے مذہب سے ہی جب دلچسپی نہیں تو تم دوسروں کے مذہب میں کیا دلچسپی لو گے۔ تمہارا جہاں جی چاہے گھومتے رہو تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا'' (صفحہ ۱۵۸)۔

سلام مچھلی شہری پر مجاز کا یہ لطیفہ ہم نے پہلی بار ان کے ہاں پڑھا ہے کہ ''نام عبدالسلام، تخلص سلام اور شاعری وعلیکم السلام'' (صفحہ ۱۳۶) اس کے بعد آپ نے سلام مچھلی شہری کے اپنے نام خطوط

درج کئے ہیں اور یہ فرمایا ہے کہ ''کاش سلام مچھلی شہری کے خطوط اکٹھا کر کے شائع کر دیئے جاتے تو مکتوب نگاری میں ایک بے تکلف فضا اور اپنائیت کا اضافہ ہوتا'' (صفحہ ایضاً) ملک زادہ صاحب ان کی شاعری کی ''وعلیکم السلامیت'' پر رائے دینے سے بوجوہ احتراز فرمایا ہے۔

یہ خودنوشت احوال الرجال کے پیرائے میں نہیں اسماء الرجال کے پیرائے میں ہے۔ جس جس مشاعرہ میں گئے ہیں جس جس سے ملے ہیں جس کو ذرا سا بھی جانا ہے ان کے اسماء کی فہرست مرتب کر دی ہے۔ شمالی امریکہ اور کینیڈا آئے ہیں تو بھی یہاں کے افراد کی مکمل فہرست کتاب میں موجود ہے۔ امارات اور مشرق وسطی میں جن لوگوں سے ملے ہیں وہ بھی ان کی خودنوشت میں مذکور ہیں اور جس کے منہ سے ان کی توصیف میں کچھ سرزد ہوا ہے وہ تو لازمی طور پر نمایاں طور سے مذکور ہیں۔ تس پر ان کا عالم یہ ہے دوسروں کی خود پسندی اور خودستائی پر گرفت کرتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد کے بارہ میں لکھتے ہیں ''وہ اپنی پبلسٹی سے خوش ہی نہیں ہوتے بلکہ اخبارات میں کی گئی پبلسٹی کی خود بھی باضابطگی کے ساتھ اپنے احباب میں پبلسٹی کرتے ہیں اور اس کی زیراکس نقلیں اپنے دوستوں کے پاس بھیجتے رہتے ہیں'' (صفحہ ۴۸۶) انہیں اس بات پر تو اعتراض ہے کہ ''فہمیدہ ریاض پر مقالہ پڑھتے ہوئے مشکور حسین یاد اپنی مردانگی کے قصے لے بیٹھے'' (صفحہ ۴۲۸) مگر یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دوست کے کہنے پر اپنے کچھ جوش ملیح آبادی جیسے رومانوی واقعات بھی لکھ دیئے ہیں (صفحہ ۵۱۶) ان واقعات کو پڑھ کر قاری کا ردعمل وہی ہوتا ہے جو جوش صاحب کے خیالی ''معاشقہ ء آخرالزماں'' کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ البتہ ایک خاتون شاعرہ شاہجہان بانو یاد کی بار بار کی یاد آوری قاری (صفحات ۲۲۳۔ ۲۲۹ اور ۲۸۳) کو ضرور چونکاتی ہے کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

ہمارے ہاں رئیس امروہوی کا تصور ایک بزرگ اور صاف ستھرے شاعر کا ہے مگر ملک زادہ صاحب نے امارات کے ایک مشاعرہ کے بعد ''رئیس امروہوی کو۔۔۔ میں نے بے حد مستی اور سرخوشی کے عالم میں ایک شخص کے کاندھے پر آدھا دھڑ آگے اور آدھا پیچھے لٹکائے ہوئے العین میں دیکھا ۔۔۔ میں نے ان کو سلام کیا وہ بولے ''میں اس وقت سرخوشی کے عالم میں ہوں صبح ملاقات ہوگی'' (صفحہ ۳۲۱)۔ جون ایلیا کی کیفیتیں تو سارے عالم پر عیاں ہیں مگر رئیس صاحب کی یہ کیفیت میں نے

پہلی بار پڑھی ہے۔

اس خودنوشت میں ازبسکہ ان کے اپنے حالات کم کم ہیں دوسروں کے احوال کی وجہ سے بیان طویل ہورہا ہے۔ دو باتیں بیان کر کے قصہ مختصر کرتا ہوں۔ گرور جنیش کے آشرم میں گئے تو جانے سے پہلے انہیں بتایا گیا کہ اندر جانے سے قبل ''خون کا معائنہ کروانا ضروری ہے'' (صفحہ ۳۸۲)

حکیم محمد سعید صاحب کی دو شہرۂ آفاق تقریروں کا ذکر آپ نے اپنے حوالہ سے کیا ہے جو دوحہ کے جشن علی سردار جعفری میں حکیم صاحب نے فرمائیں ''حضرات وخواتین ابھی مجھے دو تقریریں کرنی ہیں ایک تقریر حکیم سعید کی ہوگی۔ اور دوسری صدر جلسہ حکیم سعید کی۔ ایک تقریر بے حد چھوٹی ہوگی اور دوسری بے حد بڑی۔ چھوٹی تقریر یہ ہے کہ آپ حضرات کا شکریہ اور بڑی تقریر یہ ہے آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ'' (صفحہ ۵۲۳) اگرچہ یہ تقریریں مارک ٹوین کئی برس قبل کر چکا تھا ملک زادہ صاحب نے حکیم صاحب کے حوالے سے انہیں دہرا دیا۔

اور تجزیہ کے اختتام سے قبل ایک کانگریسی وزیر اعلیٰ کی ایک مختصر نظم آب زر سے بلکہ یوسفی صاحب کے قول کے مطابق ''آب رز'' سے لکھ رکھنے کے لائق ہے کہ

''کرسی کے پیر ہوتے ہیں
سر نہیں ہوتا۔
مگر جب کوئی اس پر بیٹھ جاتا ہے
تو سر ہو جاتا ہے''

یہ مختصر نظم اس سے بھی زیادہ مختصر صورت میں ہم پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اقبال کو سر کا خطاب ملا تھا تو ظفر علی خاں نے پھبتی کہی تھی ''سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال''۔

میرے شب و روز

بزرگ شاعر، عالم اور ماہر تعلیم پروفیسر سید عابد علی عابد کے ریٹائرڈ بیوروکریٹ بیٹے سید مینو چہر کی خودنوشت سنگ میل لاہور والوں کی جانب سے ۲۰۰۹ میں ''میرے شب و روز'' کے عنوان سے چھپی ہے۔ سید مینو چہر عابد صاحب کے اکلوتے بیٹے ہیں اور غالباً چاروں بہنوں میں سب سے چھوٹے بھی ہیں۔ شبنم عابد علی جو بعد کو شبنم شکیل کے نام سے جانی پہچانی گئیں ہمارے ساتھ یونیورسٹی اورئینٹل کالج میں پڑھتی تھیں۔ نہ صرف پڑھتی تھیں بلکہ ہماری انجمن اردو کی سکرٹری بھی تھیں اور ہم اس انجمن کے صدر تھے۔ شبنم انٹر کالجیئٹ مشاعروں میں بہت مقبول شاعرہ تھیں۔ ہمیں تو شبنم کے ساتھ صرف ایک مشاعرہ میں بہ حیثیت ٹیم شریک ہونے کا موقع ملا جس میں شبنم نے بڑا انعام حاصل کیا ہمارا حصہ صرف اتنا رہا کہ ٹرافی ہمارے کالج کے حصہ میں آئی۔ اللہ بخشے ہمارے مرحوم دوست ارشاد حسین کاظمی نے پھبتی کہی تھی کہ تم ''شبنم کے ''تابعِ مُہمل'' ہو یا ''تابعِ مُحمِل''؟'' اب نہ پھبتی کہنے والا رہا نہ ہمارا شبنم سے رابطہ قائم رہا۔ وقت گذر جاتا ہے یادیں رہ جاتی ہیں۔

سویڈن میں ایک بار سویڈش اکیڈمی والوں نے پاکستان کی تین شاعرات پر ہمیں تعارفیہ لکھنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ ہم نے شبنم کو اس کے اسلام آباد کے پتے پر خط لکھا۔ جواب آیا میں وہی ۱۹۶۰ والی بے چین روح ہوں۔ ہم نے جواب میں اسے لکھا کہ ''لڑکی! تمہارے مجموعہ کا پہلا شعر پڑھتے ہی مجھے تمہاری بات کا یقین آ گیا تھا۔ ''آپ اپنے درپئے آزار ہو جاتے ہیں ہم۔ سوچتے ہیں اس قدر بیمار ہو جاتے ہیں ہم''۔ میری بیوی نے یہ خط پڑھا تو کہا کہ آپ شبنم کو لڑکی لکھ رہے ہیں حالانکہ وہ تو نانی اماں بن چکی ہے۔'' ہم نے کہا تھا ''اورئینٹل کالج والی تیز طرار، ذہین، خوش لباس خوش شکل وضع دار لڑکی کا

تصور قائم رکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟'' اب شبنم کے بھائی کی خودنوشت پڑھی ہے تو ہمیں وہ نوجوان لڑکا مینوشاہ یاد آرہا ہے جس سے ہم صرف ایک بار عابد صاحب کے صدر والے گھر میں ملے تھے۔ عابد صاحب ان دنوں دل کے شدید دورے سے جانبر ہوئے تھے اور ابھی بیماری کے اثرات سے نپٹ رہے تھے۔ مینو چہر کی خودنوشت پڑھنے کے بعد بھی ایک لاڈلے بیوروکریٹ کا تصور ابھرتا ہے جس نے لڑکپن ابا کی محبت سے محرومی میں گذارا مگر زندگی بھر ایسے افسروں سے اس کا واسطہ رہا جو اس کے ابا کی علمیت اور بزرگی کے معترف تھے۔ حنیف رامے چیف منسٹر تھے تو ان کے علاقہ میں دورہ پر گئے یہ ان کا اپنا گھر کا علاقہ تھا اس لئے بڑے کروفر کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ ڈی سی نے ان کا تعارف کروایا کہ ہمارے اے سی عابد صاحب کے بیٹے ہیں۔ فرمایا ''عابد صاحب تو میرے مرشد ہیں'' (میرے شب وروز صفحہ ۱۸۳)۔ اسی طرح شیخ منظور الٰہی سے ان کا تعلق رہا (صفحہ ۲۵۹) شیخ منظور الٰہی نے عابد علی عابد کی علمیت کا جس توصیفی انداز میں ذکر کیا ہے وہ تو ان کی خودنوشت کے چھپنے پر مینو چہر کے سامنے آئے گا میں چونکہ اس مسودہ کو دیکھ چکا ہوں اس لئے علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہوں کہ شیخ منظور الٰہی سے بڑھ کر میں نے عابد علی عابد کا کوئی عقیدت مند نہیں دیکھا۔ مینو چہر ''قسمت کے بہت قائل ہیں'' (صفحہ ۱۲) اسلئے ان کے ابا کی علمیت اور شخصیت ان کی قسمت بنانے میں ان کی ممد ومعاون رہی اور انہیں اس کا اعتراف بھی ہے ورنہ ہمارے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کو مجید نظامی کے قول کے مطابق ''علامہ اقبال کے گھر پیدا ہونے پر ہی بڑا غصہ ہے نیز وہ علامہ اقبال سے آگے نکل جانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں (اپنا گریباں چاک صفحہ ۲۶۶)۔

عابد صاحب کی فارسی زبان کی علمیت کا جو واقعہ شاداں بلگرامی کے حوالہ سے مینو چہر نے لکھا ہے وہ ان کا سنا سنایا ہے۔ (صفحہ ۱۳) مگر ہم عابد صاحب کی علمیت کے عینی گواہ ہیں۔ ہمارے ہاں تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں دوسری کل پاکستان اردو کانفرنس منعقدہ ۱۹۶۷ میں قبلہ عابد صاحب شریک تھے اور ایک سیشن کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس سیشن میں ہمارے ایک مرحوم عالم دوست علامہ یعقوب امجد نے یہ نکتہ اٹھایا کہ اردو میں جو الفاظ عربی زبان سے آئے ہیں ان کا تلفظ لازماً عربی ہی کا رہنا چاہئیے ورنہ ان کی معنویت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ عابد صاحب قبلہ نے اپنے خطبہ ء

صدارت میں اتنے عالمانہ انداز میں اس مغالطہ انگیز مفروضہ کی تردید کی اور اساتذہ اردو کے بے شمار اشعار اپنے حافظہ کی مدد سے سامعین کے سامنے اپنے موقف کی تائید میں پیش کئے کہ لوگ عش عش کر اٹھے اور مدتوں عابد صاحب کے حافظے کی داد دیتے رہے۔ عابد صاحب کا استدلال یہ تھا کہ اردو والوں نے جو الفاظ عربی سے لئے ہیں انہیں اپنا لیا ہے اس لئے وہ اسی صورت میں مستعمل ہونگے جس صورت میں اساتذہ شعرائے اردو غالب، ذوق، سودا اور میر نے انہیں باندھا ہے۔ عربی والے لاکھ کافِر کو کافَر باندھتے رہیں ہم غالب اور ذوق کے تتبع میں اسے کافَر ہی باندھیں گے۔ ہے ولی پوشیدہ اور کافَر کھلا یا چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافَر لگی ہوئی۔

مینو چہر نے نواب بہاولپور کی اولاد میں جائیداد کے تقاسمہ پر جھگڑوں کا ذکر کیا ہے (صفحہ ۲۰۰) تو ہمیں شیخ منظور الٰہی کی سلسلہء روز وشب یاد آرہی ہے۔ شیخ صاحب بہاولپور کے کمشنر تھے۔ گورنر کی بلائی ہوئی کمشنرز کانفرنس میں شرکت کو گئے تو ہز ہائینس نواب بہاولپور نے نواب کالاباغ کے نام یہ پیغام بھجوایا کہ ''میری زندگی میں ہمارے خاندان کی زرعی جائیداد پر زرعی اصلاحات کا نفاذ نہ ہو۔ بچوں کے مفادات کی نگہداشت میں بہتر طریق سے کر سکتا ہوں'' ۔۔۔۔ میں نے عرض مدعا کیا تو ''گورنر صاحب کا ردعمل فوری تھا اور حیران کن۔ نواب صاحب کو میری طرف سے عرض کریں کہ وہ اس جھمیلے میں نہ پڑیں۔ ماں باپ بچوں کے لئے کچھ بھی کریں وہ کبھی شکر گذار نہیں ہوتے'' (سلسلہء روز وشب صفحہ ۶۳) اس کے بعد شیخ صاحب نے بڑے مزے کا فقرہ لکھا ہے کہ مستقبل کا علم تو صرف خدا کو ہے اور انسان پیش آنے والے حادثہ سے بے خبر ہوتا ہے مگر قدرت ان کی زبان سے کیا کہلوا رہی تھی!

پیش لفظ میں مینو چہر کا کہنا ہے کہ ''یہ خودنوشت ایک طویل عرصے کے بیشتر واقعات کی شیرازہ بندی ہے'' مگر بیشتر واقعات مینو چہر کے اپنے دیکھے ہوئے نہیں۔ بخاری صاحب کے لطائف مستعار، صوفی صاحب کے ارشادات دوسروں کے حوالہ سے، فیروز خاں نون کی بات الطاف گوہر کی زبان سے، دیوان سنگھ مفتون کی ناقابل فراموش میں بیان کردہ بات بغیر حوالہ کے۔ اور تو اور آپ نے رئیس امروہوی کے ''بیگمات آیند بہ رکشا، داشتہ آید بکار'' والے شہرہء عالم قطعہ کو چراغ حسن حسرت سے

منسوب کر دیا ہے۔ (صفحہ ۹۹) غرض یہ شیرازہ بندی محض مینو چہر کے قلم کی رہین منت ہے اور خود نوشت دوسروں کی باتوں پر انحصار کرنے کا نام نہیں اسی لئے آپ بیتی کو آپ بیتی کہا جاتا ہے۔

پروفیسر کے کے عزیز نے اپنی کافی ہاؤس والی یادداشتوں میں عابد علی عابد کو موسیقی کا عاشق قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو موسیقی کی باقاعدہ تعلیم دلواتے تھے۔ مینو چہر نے اپنے ابا کے موسیقی سے شغف کا ذکر تو کیا ہے (صفحہ ۱۱) مگر اپنے گھر میں موسیقی کے کسی استاد کی آمد و رفت کا ذکر نہیں کیا۔ شاید یہ مینو چہر کے ہوش کے زمانہ سے پہلے کی بات ہو!

ہمارے جاننے والوں میں پیر صلاح الدین مرحوم کا ذکر ہے (صفحہ ۱۴۳) پیر صاحب کو قرآن پاک سے عشق تھا اور آپ نے قرآن کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا ان کی فرصت کے اوقات اسی مبارک کام میں گذرتے تھے۔ مگر مینو چہر نے ضیاء الحق کے اس ظلم کا ذکر نہیں کیا جو اس عاشق قرآن سے ساتھ روا رکھا گیا اور جسے ناکردہ جرم کی پاداش میں مارشل لاء قوانین کے تحت سر عام منہ کالا کرنے کی سزا دی گئی۔ ڈاکٹر محمد عارف کا ذکر ہے کہ وہ ورلڈ بنک میں ملازم رہے (صفحہ ۲۶۳) مگر جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ڈاکٹر محمد عارف امریکہ میں پی ایچ ڈی کرنے تو ضرور گئے یا ایک دو بار علاج کے لئے گئے مگر ورلڈ بنک میں ملازم نہیں رہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ پھر ملک محمد افضل کا ذکر ہے "جو بڑے دیانت دار اور خلیق جوڈیشل افسر تھے بڑی اچھی شہرت کے مالک۔ ہائی کورٹ کی ججی کے لئے نہایت موزوں مگر چونکہ عقیدے کے لحاظ سے قادیانی تھے اس لئے کچھ رخنہ پڑ گیا۔ بہر حال خدا تعالیٰ کی ذات نے انہیں پوری طرح خوش و خرم رکھا" (صفحہ ۲۳۱) ڈاکٹر سلام کا ذکر ہے اور ان کی ان کوششوں کا کہ وہ پاکستان میں اپنا سائنسی ادارہ بنانا چاہتے تھے (صفحہ ۴۴) جو ہمارے بدقسمت ملک کو نصیب نہ ہوا اور اٹلی میں ٹریسٹ کے مقام پر بنا۔

ریڈیو کے حمید نسیم کا ذکر ہے مگر مینو چہر نے ان کی خود نوشت ناممکن کی جستجو نہیں پڑھی ورنہ وہ یہ نہ لکھتے کہ "ریجنل ڈائریکٹر بننے کے بعد فل سٹاپ لگ گیا" (صفحہ ۱۰۸) حمید نسیم ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھے کہ پی آئی اے کی آرٹس اکیڈمی کے ڈائریکٹر بنے اور عمر بھر فن اور پی آر سے وابستہ رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ مذہب کی طرف رجوع ہوئے۔

سید مینو چہر کی اس خود نوشت میں مافوق الفطرت واقعات کا ذکر بھی ہے اور یہ کالے جادو سے خوف زدہ نظر آتے ہیں کیونکہ ان کے ابا کا گھر کالے جادو کی وجہ سے اجڑا تھا۔ خدا جانے اب ان کا کیا عالم ہے؟

شہرت بخاری صاحب کی خود نوشت "کھوئے ہوؤں کی جستجو" تو ویسے ہی کمزور خود نوشت سمجھی جاتی ہے اس کے مندرجات کی تردید کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

عابد صاحب شدید علیل ہوئے تو محمود نظامی نے عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت سے ان کے بارہ میں تعزیتی شذرے تیار کروالئے کہ خدانخواستہ ان کی وفات کا حادثہ ہو جائے تو ریڈیو کے پاس تعزیتی مواد تیار ہو اور یہی نشریات والوں کا بنیادی اصول ہے۔ مگر عابد صاحب تو ٹھیک ہو گئے محمود نظامی کراچی گئے تو اچانک دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہو گئے۔ دوسرے دو حضرات بھی عابد صاحب سے پہلے رہگزائے قضا ہوئے ان کی وفات پر تعزیتی شذرات عابد صاحب نے نشر کئے۔ (صفحہ ۷۷) یہ کوئی انوکھی بات نہیں کون جانتا ہے کہ کون کب اور کہاں جاں بحق ہو گا اس کا علم صرف ذات باری تعالیٰ کو ہے۔

"میرے شب و روز" سنگ میل والے نیاز احمد نے لکھوائی اور انہی کے نام معنون ہے۔ خود نوشت ہونے کے ناطے اس میں کئی ایسی باتیں ہیں جو بیان نہ ہوتیں تو مصنف کی باتوں پر دوسروں کو انگشت نمائی کا موقعہ نہ ملتا۔ قرۃ العین حیدر پر ان کی ناپختہ تنقیدی باتیں انہیں زیب نہیں دیتیں انہیں حذف کیا جا سکتا تھا ویسے بھی ان باتوں کا ان کی سوانح سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔

مینو چہر سید کی یہ خود نوشت اپنے مندرجات کی وجہ سے چونکانے یا کوئی نئی بات بیان کرنے والی خود نوشت نہیں کہلا سکے گی۔

عمرِ رفتہ

خانوادہ فرنگی محل کے پروفیسر غوث انصاری صاحب کی خودنوشت ''عمر رفتہ'' کے عنوان سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی والوں کی جانب سے ۲۰۰۲ میں چھپی۔ میرے پاس جو نسخہ پہنچا ہے وہ ان کے لندن پہنچنے تک کا ہے اور اس پر جلد اول لکھا ہے۔ ظاہر ہے پروفیسر صاحب لندن اور وی آنا میں تکمیل تعلیم کے بعد تعلیم و تعلم کے پیشہ سے وابستگی کے سبب دنیا بھر میں گھومتے اور تعلیم دیتے رہے کیونکہ '' جانے سے قبل واپس نہ آنے کا عہد کر کے گئے تھے'' (عمر رفتہ۔ صفحہ ۲۲۵) اب وظیفہ یاب ہونے کے بعد وی آنا اور سپین کے ساحلی شہر کالپے میں سکونت پذیر ہیں۔ پیش رفت یعنی دیباچہ میں مذکور ہے کہ پچھلے پچاس برس میں ان کا لکھنا پڑھنا انگریزی میں رہا اس لئے اب انہیں اردو لکھنے میں دقت پیش آ رہی ہے مگر جس نے لکھنؤ کا پانی پیا ہے اس کے رگ و پے سے لکھنوی زبان کی بو باس کیسے محو ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کی زبان فی الواقعہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان نہیں مگر بیان کی روانی میں کہیں رخنہ بھی محسوس نہیں ہوتا نہ ہی کہیں انگریزی کے الفاظ غیر ضروری طور پر استعمال میں آئے ہیں۔

پروفیسر غوث انصاری از بس کہ خانوادہ فرنگی محل کے ممتاز فرد ہیں اور ان کے والد گرامی سجادہ نشین کے مرتبہ پر فائز ہیں مگر ان کے اپنے بیان کے مطابق ان کے ہاں فارغ البالی نہیں تنگدستی کا احساس نمایاں ہے۔ سکول میں ان کی تعلیم کا سلسلہ تسلسل سے جاری نہیں رہا اس کی وجہ ان کی سیاسی دلچسپیاں ہیں اور کالج تک پہنچ کر تو باقاعدہ قید و بند کی مصیبت بھی جھیل چکے ہیں۔ اسی سیاسی وابستگی کی وجہ سے ان کی تعلیم میں بھی رخنہ پڑا اور کانگریس سے وفاداری کے باوجود ان کے پاسپورٹ کے حصول میں بھی بہت سی مشکلات حائل ہوئیں جن سے بددل ہو کر آپ نے واپس اس ملک میں نہ

آنے کا تہیہ کیا۔ خاندان کی مالی بدحالی کا ذکر آپ بار بار کرتے ہیں مگر جب تعلیم کے لئے لندن جانے کا انتظام کر لیتے ہیں تو قاری کو یہ حیرت ضرور ہوتی ہے کہ ایسے حالات میں پھنسا ہوا کوئی شخص اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن جانے کا کیسے سوچ سکتا ہے؟ دلی جاتے ہیں تو بمشکل کرائے یا دو چار روز کے اخراجات ان کے پاس ہیں۔ بمبئی جاتے ہیں تو اگر ان کی محسنہ آڑے نہ آئیں تو ان کو گئو شالہ میں سونا پڑتا ہے۔ مگر تعلیم کے لئے لندن جانے کے سارے بندوبست ہو جاتے ہیں تو پڑھنے والا چونکتا ہے کہ یا یہ اپنے مخدوش مالی حالات کے بیان میں مبالغہ کر رہے ہیں یا حقائق کو چھپا رہے ہیں۔

با ایں ہمہ ان کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ ناہموار تعلیمی سلسلہ کے باوجود یہ ہمت نہیں ہارتے اور تعلیم مکمل کر لیتے ہیں۔ وطن واپس آ کر وطن کا قرض اتارنا یا نہ اتارنا ہر شخص کے اپنے حالات پر منحصر ہوتا ہے۔ جس سیاسی ناانصافی سے یہ دوچار ہوئے ہیں اس کے پیش نظر ان کا فیصلہ درست ہی معلوم ہوتا ہے واپس آ کر بھی اسی محرومی اور ناانصافی کا شکار ہوتے تو اور زیادہ دکھ جھیلتے۔

آپ نے اپنی آنکھوں سے اپنے ماحول کے سماجی تفاوت اور مذہب کی بنیاد پر منافرت کے مظاہر دیکھے تو انسانیات کو ہی اپنا موضوع بنایا اور اسی موضوع میں تخصص کر کے وی آنا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

آپ ذہنی طور پر کانگریسی تھے اور کانگریس کی سیاسی تگ و دو میں پیش پیش رہے مگر ان کی سیاسی معلومات ناپختہ حد تک کمزور ہیں لکھتے ہیں'' ہندوستان کی آزادی کے لئے ۲۹۔ ۳۰ اور ۳۱ میں تین گول میز کانفرنسیں ہوئیں وہ ناکام ہو گئیں'' (صفحہ ۳۷) یہ کانفرنسیں آزادی کے لئے نہیں ہندوستان میں نئے آئینی نظام کے نفاذ کے لئے تھیں جو ۱۹۳۵ کے ایکٹ کے تحت نافذ ہوا اور جس کے تحت ڈائی آرکی یعنی دو عملی کا نظام قائم کیا گیا۔ انتخابات ہوئے اور بعض اختیارات اسمبلیوں کو سونپے گئے اور بعض اختیار مرکزی حکومت نے اپنے پاس رکھے۔ اسی لئے اسے دو عملی کا نظام کہا جاتا ہے۔ اختلافات میں خلیج کانگریس کے غیر متوازن رویہ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

دوسری سیاسی ناپختگی کی بات آپ نے یہ کہی کہ'' جناح صاحب مہاراجہ محمود آباد اور چوہدری خلیق الزمان کے کہنے پر واپس آئے'' (صفحہ ۷۰) یہ بات نہ صرف بعید از حقیقت ہے بلکہ ایک حد

تک مضحکہ خیز ہے کیونکہ چوہدری خلیق الزمان کبھی جناح صاحب کی اچھی کتابوں میں نہیں رہے اور مسلم لیگ سے ان کی وفاداری کے نمونہ کا ثبوت تو نواب سر یامین خاں کی خود نوشت ''نامہء اعمال'' سے بھی مل جاتا ہے'' (مصنف پاتھ وے ٹو پاکستان چوہدری خلیق الزمان) نے غلط بیانیاں کی ہیں۔ انہوں نے ظاہر نہیں کیا کہ وہ کس طرح کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مقرر ہوئے اور اپنا پورا بیان جو کانگریس کا جھنڈا بلند ہوتے وقت دیا اپنی کتاب میں نہیں دیا'' (نامہء اعمال صفحہ ۱۱ جلد اول) اور تو اور یہ بھی اسی کتاب میں درج ہے کہ'' چوہدری خلیق الزمان کو امن مشن پر پاکستان بھیجا گیا (سر یامین خاں) ان سے ملنے کو گئے تو وہ رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی میں آرام مونڈھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے قائد اعظم کی بابت وہ خراب الفاظ استعمال کئے جن کا تحریر کرنا خلاف تہذیب ہے لب لباب یہ تھا کہ ایک خود سر شخص ہم سب کو تباہ کر کے پاکستان ادھورا لے کر وہاں کا گورنر جنرل بن بیٹھا اور یہاں کشت وخون کروا گیا''

(نامہء اعمال صفحہ ۱۳۷۷)۔ جناح صاحب کی مردم شناسی کا تو زمانہ گواہ ہے کیا وہ چوہدری خلیق الزمان جیسے کھوٹے سکوں کو جانتے نہ تھے؟ جانتے اور خوب پہچانتے تھے۔ قصہ مختصر انہیں واپس لانے والے لوگ اور تھے اور تاریخ ان لوگوں کو جانتی ہے۔

احوال الرجال میں آپ نے راجہ صاحب محمود آباد کے باب میں تضحیک و تمسخر کے انداز میں دو واقعات بیان کئے ہیں پہلا یہ کہ راجہ صاحب کو غربت کی زندگی گزارنے کا شوق چراتا تھا تو ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرنے کا ڈھونگ رچاتے تھے رولز رائس میں گھر سے نکلتے۔ گاڑی میں تیسرے درجہ میں سوار ہوتے اور اگلے سٹیشن پر اتر کر پھر اسی کروفر کے ساتھ واپس آجاتے (صفحہ ۷۷) دوسری بات یہ بیان کی ہے کہ راجہ صاحب نے سنت انبیاء پورا کرنے کے لئے آسٹریلیا سے اعلیٰ نسل کے دنبے منگوائے تھے انہیں ملازمین کی نگرانی میں رکھوایا تھا کبھی کبھار باہر جاتے اور اپنی سونے کی مٹھ والی چھڑی سے کچھ دیر انہیں ادھر ادھر ہنکا کر سنت پوری کر لیتے (۷۸) یہ باتیں ان کے اندر کے بغض کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ مہاراجہ محمود آباد نیک پاک مسلمان اور مسلم لیگی تھے اور مصنف محترم تو فرنگی محل کے باسی تھے ان کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اس ماحول کا تذکرہ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی

پھلواری معتمد تعلیمات ندوۃ العلما لکھنؤ نے کیا ہے'' مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ کے بدنام زمانہ چوک کے محلہ ٹکسال میں واقع تھا'' (سفرنامہء حیات صفحہ ۳۹) پروفیسر صاحب کا بچپن اسی ماحول میں کوچہ گردی کرتے گزرا تھا کچھ اثر تو آپ نے قبول کیا ہی ہوگا اس لئے مسلم لیگیوں کا مذاق اڑاتے ہوئے انہیں نہ ان کی بزرگی کا خیال رہتا ہے نہ ان کی دین سے وابستگی کا۔ حالانکہ خود ان کا قول ہے کہ'' فرنگی محل کی خاندانی روایت کے مطابق سیاسی اختلافات ذاتی تعلقات پر کبھی اثر انداز نہیں ہوتے'' (صفحہ ۱۳۵)

آپ نے لڑکپن میں ایک قلمی ماہنامہ جاری کیا تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور ساتھ میں بڑے مزے کا فقرہ لکھا کہ'' کسی زمانہ میں آذر کے ہاں ابراہیم پیدا ہوئے تھے آج کل بکثرت ابراہیم کے یہاں آذر پیدا ہو رہے ہیں'' (صفحہ ۱۱۲)

مجاز کا سلام مچھلی شہری کے بارہ میں دوسرا لطیفہ ہم نے ان کے ہاں پڑھا ہے۔ سلام کافی ہاؤس میں داخل ہوئے تو مجاز نے کہا'' ایک ایٹم بم ہیروشیما پر گرا تھا دوسرا سلام مچھلی شہری کی صورت میں ہما شا پر گرا ہے'' (صفحہ ۱۰۳)

علی سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے ناطے سے ماسکو کی تعریف کرتے ہوئے شعر کیا کہا ہے اپنے خاندان کا سجع کہہ دیا ہے وہ بھی یاد رکھنے کا ہے'' ہر عاشق ہے سردار یہاں۔ ہر معشوقہ سلطانہ ہے'' (صفحہ ۱۹۵)

پروفیسر صاحب کی اس خود نوشت میں لکھنؤ کے گلی کوچوں کا، بازار کی بولی ٹھولی کا تذکرہ تو موجود ہے وطن سے وابستگی اور محبت کا تصور الشاذ کالمعدوم کے زمرہ میں ہے۔ شاید دوسرے حصہ میں آپ نے اس کی تلافی کردی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

شاہراہ مکہ

آسٹرین نژاد نومسلم محمد اسد (Leopold weiss 1900-1992) نے اپنی روحانی خودنوشت شاہراہِ مکہ Road to Mecca کے نام سے ۱۹۵۴ میں لکھی جو ان کے عرب سے ہندوستان آجانے تک ۱۹۳۲ تک کے عرصہ کو محیط ہے۔ اپنی زندگی کے اواخر میں آپ نے ۱۹۳۲ سے ۱۹۹۲ تک کے حالات لکھنے کی طرح ڈالی اس کا نام '' دل کی اپنے وطن کو مراجعت '' یعنی Homecoming of the Heart رکھا۔ اس کا پہلا حصہ جو ۱۹۳۲ سے ۱۹۵۲ کے واقعات پر مشتمل ہے علامہ محمد اسد نے لکھا مگر دوسرے حصہ کی تکمیل ان کی تیسری رفیقہء حیات پولا حمیدہ اسد کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کا عنوان ''محمد اسد: بندہء صحرائی'' تجویز ہوا۔ میرے سامنے جو چھپی ہوئی خود نوشت ہے اسے جناب محمد اکرام چغتائی نے اسی نامطبوعہ مسودہ کی مدد سے دیگر متعلقہ حواشی کے ساتھ The Truth Society Lahore ۸۱۔اے۲ گلبرگ ۳ لاہور کی جانب سے ۲۰۰۰ میں شائع کیا ہے۔

علامہ محمد اسد کا نام دنیائے اسلام میں ان کے بخاری شریف اور قرآن حکیم کے ترجمہ وتفسیر کی وجہ سے بہت معروف نام ہے۔ آپ بتیس سال کی عمر تک سعودیہ میں مقیم رہے پھر یکا یک سعودیہ سے ہندوستان آجانے کا فیصلہ کیا۔ اس کتاب میں اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ ایک افغانی عالم ڈاکٹر عبدالغنی کے ساتھ سعودی حکومت کے ناروا سلوک نے انہیں بدظن کر دیا جنہیں محض اس لئے دس برس تک قید رکھا گیا کہ وہ تعلیم کے پھیلاؤ کی خواہش رکھتے تھے اور نئی نسل کو علم کے نور سے منور کرنا چاہتے تھے۔ (بندہ صحرائی صفحہ ۲۴)۔ ہندوستان کا سفر اختیار کرنے سے قبل محمد اسد سلطان ابن

سعود سے ملنے گئے تو بادشاہ نے انہیں گلے لگاتے ہوئے کہا'' میرے فرزند تمہیں ہمارے پاس جلد واپس آنا ہے۔ مت بھولو یہ تمہارا اپنا ملک ہے''(صفحہ ۲۱)

ہندوستان پہنچنے پر محمد اسد کا پہلا تاثر یہ تھا کہ ''ہندو تعلیم اور تجارت کی ترقی میں کوشاں رہے مگر مسلمان اپنے شاندار ماضی میں کھوئے رہے اور اسی پر فخر کرتے رہے'' (صفحہ ۳۱) یہاں انہیں مہربان میزبان میسر آتے رہے اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اقبال سے بھی ان کی ملاقات ہوئی مگر اجتہاد کے مسئلہ پر اقبال کو ان سے اتفاق نہیں تھا۔ علامہ اسد نے اقبال سے کہا'' ڈاکٹر اقبال! کیا آپ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ وہ اصحاب جو خود کو مسلمان معاشرہ کی ترقی کا اہل سمجھتے ہیں اور اس کے لئے اجتہاد کو لازمی عنصر قرار دیتے ہیں کیا ان کے بغیر مسلمان تہذیبی بنجر پن کی اتھاہ گہرائیوں میں نہیں گریں گے یا وہاں سے نکلنے کے امکانات معدوم نہیں ہو جائیں گے؟ میرا پختہ یقین ہے کہ آپ کا موقف درست نہیں میں تسلیم کرتا ہوں یہ دور انحطاط ہے۔ لیکن ہم جیسے لوگوں کو چاہیے کہ اس وقت ہم اپنے نظریہء حیات کا از سر نو جائزہ لینے کی جرات کا مظاہرہ کریں۔ قطع نظر اس بات کے کہ ماضی کی مسلمان نسلوں نے اسلامی مسائل کو حل کرنے کی غرض سے کیا اقدام کئے اگر ہم ایک الگ جماعت کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں یا اپنے تہذیبی زوال پر قابو پانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہمیں اپنی لغزشوں کی پرواہ کئے بغیر اجتہاد ہی کے راستہ پر چلنا پڑے گا چاہے ہمارے ملا اس کو پسند کریں یا نہ کریں۔ ہمیں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہمیں فکر کرنی چاہئے کہ کہیں ہم جامد نہ ہو جائیں''۔۔۔ ''میری یہ باتیں سن کر اقبال کے مداحین مہر بلب ہو گئے''۔۔۔''میری ان سے دوستی چار سال بعد ان کی وفات (۱۹۳۸) تک قائم رہی'' (صفحہ ۵۹) اقبال سے ان کی ملاقاتیں جاری رہیں۔

ایک اور ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اقبال نے اپنے مطالعہ کے لئے جو کمرہ مخصوص کر رکھا تھا اس کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا ایک میں میں بھی موجود تھا اقبال حقہ کی نال منہ میں دبائے دیوار کے ساتھ سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے میں ان سے مخاطب ہوا'' آج مسلمانوں کو ایک پیغمبر کی ضرورت ہے کیونکہ وہی ان میں زندگی کی نئی روح پھونک سکتا ہے اور انہیں حالیہ جمودی حالت

سے باہر نکال سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ حضور اکرمؐ کی ذات خاتم الانبیا ہے اور اب ان کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہو سکتا۔ رسولؐ پاک مدینہ میں مدفون ہیں اور ہم ان کی آواز تک نہیں سن سکتے'' (صفحہ ۶۲) اس پر اقبال نے انہیں احادیث کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ احادیث کا انگریزی میں ترجمہ کریں اس طرح بخاری شریف کے ترجمہ کی بنیاد پڑی۔ بخاری شریف کے ترجمہ کی اشاعت کے سلسلہ ہی میں انہیں نظام حیدر آباد سے ملنے کے لئے حیدر آباد جانا پڑا۔ نظام نے انہیں معقول مالی امداد کے علاوہ رسالہ اسلامک ریویو کی ادارت بھی سونپی جس سے ان کے مالی مسائل کافی حد تک حل ہو گئے مگر قاری کو یہ بات بہت کھلتی ہے کہ ملی کاموں میں اتنی فراخ دلی سے تعاون کرنے والے نظام کی کنجوسی اور جزرسی پر طنز کرنے سے نہیں چوکے۔ ''ایک پگڑی والا ملازم بڑی سی چائے دانی لے کر آیا اور پہلے نظام اور پھر میرے کپ میں چائے ڈال دی۔ ایک اور ملازم نے مجھے چھوٹے کیک اور بسکٹوں سے سجائی رکابی پیش کی۔ میں نے ایک کیک اٹھایا لیکن نظام نے ہاتھ کے اشارے سے کچھ لینے سے انکار کر دیا ملازم میری کرسی کے پیچھے آن کھڑا ہوا۔ جونہی میں نے کیک ختم کیا اس نے دوبارہ رکابی میرے آگے بڑھا دی۔ میں نے کچھ اور لینے سے معذرت کر دی اور وہ ملازم پھر سے میری کرسی کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ نظام نے اسے ماتھے پر تیوری چڑھا کر دیکھا۔ جب کیک بردار ملازم اشارہ کا مفہوم نہ سمجھ سکا تو انہوں نے خفگی سے اردو میں کہا ''انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ وہ کچھ اور نہیں لیں گے'' یہ سنتے ہی وہ ملازم چپکے سے کھسک گیا۔ کیا نظام کو خوف دامنگیر تھا کہ میں اپنا ذہن بدل کر دوسرا کیک ہڑپ کر جاؤں گا'' (صفحہ ۷۳)

جزرسی اور کنجوسی نظام کی فطرت میں سہی مگر پاکستان کے ساتھ جو نیکی نظام نے کی اس کا ذکر جسٹس ریٹائرڈ صمدانی نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے ''حیدر آباد کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو گیا لیکن نظام حیدر آباد جاتے جاتے جو نیکی پاکستان کے ساتھ کر گئے اسے یاد رکھنا بہت ضروری ہے ان دنوں پاکستان میں حیدر آباد کے نمائندے (نواب) مشتاق احمد صاحب تھے جن کے ذریعہ نظام نے بہت سارا پیسہ پاکستان منتقل کر دیا اور اس طرح پاکستان ابتدائی مالی مشکلات سے کسی حد تک بچ گیا'' (جائزہ۔ خودنوشت جسٹس صمدانی صفحہ ۴۸)۔ نواب مشتاق احمد خاں صاحب نے بھی اس بات کا ذکر

اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ دونوں حیدر آباد کے لوگ ہیں۔ علامہ اسد نے چوہدری محمد علی سے جو الفاظ منسوب کئے ہیں وہ بعید از حقیقت معلوم دیتے ہیں کہ ''انہوں نے بتایا کہ قائداعظم نے امیر ترین مسلمان حکمران نظام حیدر آباد دکن سے درخواست کی ہے کہ وہ پاکستان کو سونے چاندی کی شکل میں چند لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ ادھار دے دیں اور انہیں اپنے نام پر ہی بنک میں جمع کروا دیں تاکہ پاکستانی کرنسی کو تحفظ مل سکے لیکن نظام دولت کے انبار کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے قائد اعظم کی درخواست کو رد کر دیا'' (صفحہ ۱۱۴) علامہ اسد طبعاً شکی مزاج ہیں منفی باتوں کو لے اڑتے ہیں۔ یہ بات تو کھلا ہوا راز ہے کہ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں پاکستانی معیشت کو سب سے مضبوط سہارا نظام حیدر آباد ہی نے دیا تھا۔ حسن اتفاق کہ انہی دنوں مجھے ایک حیدر آبادی معزز خاتون بیگم صوفی پاشا کی خودنوشت کی تصویری نقل دستیاب ہوئی ہے آپ نواب محمد یار جنگ کی صاحبزادی ہیں۔ لکھتی ہیں ''قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان میں مالی دشواریوں کو سامنا ہوا تو انہوں نے نظام دکن سے خفیہ طور پر خواہش کی کہ پاکستان کو بطور قرضہ معقول رقم دی جائے اعلیٰ حضرت نے میر لائق علی سے جو اس وقت حیدر آباد کے وزیراعظم تھے مشورہ کیا انہوں نے کہا دس کروڑ روپیہ بھجوا دیجئے۔ لیکن حضور نظام نے بیس کروڑ روپے بھجوا دئے'' (ہماری زندگی خودنوشت بیگم پاشا صوفی ایم اے علیگ صفحہ ۳۱) اور ۱۹۴۷ کا بیس کروڑ روپیہ کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔

محمد اسد کو براہ راست پبلک سروس کمشن کے ذریعہ پاکستان کی وزارت خارجہ میں لیا گیا اور ڈپٹی سکرٹری کا عہدہ دیا گیا۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ اور دیگر مسلمان ممالک کے ساتھ روابط کے باب میں ایک تفصیلی میمورینڈم لکھا تو سکرٹری خارجہ اکرام اللہ نے اس کو پسند نہیں کیا مگر وزیر خارجہ ظفر اللہ نے اسے رد نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہمارے وزیر خارجہ کی بڑی خوبیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ ان لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرنے میں دریغ نہیں کرتے تھے جو نوآبادیاتی استعماریت کے خلاف نبرد آزما تھے۔ ان کے اس رویہ میں ذرہ بھر کھوٹ نہیں تھی۔ مسلمانوں میں یگانگت و اشتراک کو تقویت دینے کے اس مخلص جذبہ کا ان کے جماعت احمدیہ سے نجی گہرے تعلق یا برطانیہ سے ان کی جذباتی ''فرمانبرداری'' سے نہیں۔۔۔ حکومت پاکستان نے بورقیبہ اور اس کی تحریک کو نہ صرف مالی اور اخلاقی

امداد کا پختہ یقین دلایا بلکہ دوسرے ذرائع بھی بروئے کار لانے کا وعدہ کیا۔ بین الاقوامی سطح پر ان یقین دہانیوں کے منفی اثرات ہو سکتے تھے لیکن پاکستان کو ان کی پروا نہیں تھی'' (صفحہ ۱۴۴)

حیرت کی بات یہ ہے کہ علامہ اسد نے اس ساری امداد کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی ہے ''بورقیبہ نے ان مذاکرات اور ان کے مثبت نتائج کے ضمن میں میرے مخلصانہ تعاون کو کبھی فراموش نہیں کیا کئی سال بعد جب میں وزارت خارجہ سے سبک دوش ہو چکا تھا اور وہ تیونس کی کرسیٔ صدارت پر متمکن تھے لیکن پھر بھی وہ کھلے عام اس کا اعتراف کرتے تھے۔ (صفحہ ایضاً)

دسمبر ۱۹۵۱ میں ان کا تبادلہ اقوام متحدہ میں کر دیا گیا۔ ''وزیر خارجہ بڑے پراسرار شخص تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اقوام متحدہ کے اگلے اجلاس میں یورپ کی نو آبادیات اور ''ماتحت علاقوں'' کی حیثیت اور انہیں آزاد کرانے کے لئے جو تحریکیں چل رہی ہیں ان کے بارہ میں بحث ہو گی چونکہ یہ تمام عرب ممالک ہیں اس لیے ایسا نمائندہ بھیجنا مفید رہے گا جو ان کے مسائل سے کما حقہ، آگاہ ہو اور ان کی زبان بھی بول سکتا ہو''۔۔۔ ''وزیر خارجہ نے میری اس تعیناتی کا ذکر کرتے ہوئے ''ہمارے نمائندوں میں سے ایک'' کے الفاظ استعمال کئے۔ جس کا مطلب ہے مجھے مشن کا سربراہ نہیں بنایا جائے گا۔۔۔ میں جانتا تھا کہ میں کسی بھی برائے نام سربراہ کے مقابلے میں اس فریضہ کو زیادہ مؤثر طریقے سے ادا کرنے کی اہلیت رکھتا ہوں'' (صفحہ ۱۴۵) ان کی اس انا کو اور زیادہ ٹھیس اس وقت پہنچی جب پروفیسر احمد شاہ پطرس بخاری کو مشن کا سربراہ مقرر کیا گیا'' وہ لاہور کے ایک کالج میں انگریزی ادب پڑھاتے رہے وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے اور مجھے ناظم الامور کی حیثیت میں ان کی ماتحتی میں کام کرنا تھا۔ ہم ذاتی طور پر ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے اور یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہ اجتماع ضدین ہے جن کا اتصال ممکن نہیں ہوتا'' (صفحہ ۱۴۶)۔ علامہ تو پطرس بخاری کو نہیں جانتے تھے مگر پاکستانی تو اس نابغہء روزگار شخص کی صلاحیتوں سے واقف تھے۔ علامہ اسد کا رویہ سمجھ میں آتا ہے جس کا اظہار وہ آگے چل کر بار بار کرتے ہیں ''مجھے جلد ہی یہ احساس ہو گیا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے دوست نہیں بن سکیں گے۔ بلاشبہ وہ بلا کے ذہین شخص تھے اور ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا اور بظاہر ان کی پرورش اچھے ماحول میں ہوئی تھی لیکن ان اوصاف کے ساتھ وہ بڑے مغرور اور خود بیں

شخصیت کے مالک تھے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ کسی بھی موضوع پر اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرتے تھے اور سب سے بڑھ کو یہ کہ جس کو اپنی ہیئت اقتدار کے ماتحت سمجھتے تھے ان پر رعب جمانا اور اپنی بالا دستی کا احساس دلاتے رہنا بخاری صاحب کی کمزوری تھی لیکن ایسی مغلوبیت میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔۔۔۔ وہ بھی غالباً اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ میں ان کی بلند مرتبہ شخصیت کو نقصان پہنچانا چاہتا تھا اور پاکستانی وفد کو متحرک اور فعال رکھنے کے لئے جس ''ساکھ'' کی ضرورت ہے میں اسے خراب کرنے کی سازش کر رہا تھا'' (صفحہ ۱۴۹)

بخاری صاحب سے اختلافات ایک طرف، علامہ صاحب نے ایک امریکی لڑکی پولا سے شادی کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ''مرجہ قوانین کے تحت اگر وزارت خارجہ کا کوئی افسر غیر پاکستانی قومیت کی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہو تو اسے گورنر جنرل سے پیشگی اجازت لینا ضروری تھا۔ ایسی درخواست کے ساتھ رسمی طور پر ملازمت سے مستعفی ہونا پڑتا تھا درخواست منظور ہونے کی صورت میں استعفیٰ بھی درخواست دہندہ کو واپس کر دیا جاتا تھا بصورت دیگر استعفیٰ حتمی قرار پاتا تھا۔ مجھے اپنی درخواست کی منظوری کا پورا یقین تھا (صفحہ ۱۵۸) تقریباً دو ہفتے بعد مجھے حیران کن خط موصول ہوا۔ میری درخواست مسترد کرتے ہوئے میرا استعفیٰ منظور کر لیا گیا'' (صفحہ ۱۵۹) یہاں علامہ اسد کی لکھی ہوئی خودنوشت ختم ہو جاتی ہے باقی حصہ پولا حمیدہ کا لکھا ہوا ہے جس کو میں خودنوشت کے زمرہ میں شمار نہ کرتے ہوئے نظر انداز کرتا ہوں۔ یہ حصہ علامہ اسد کی سوانح عمری ہے جو ان کی شریکہء حیات نے لکھی ہے۔

علامہ صاحب کی دو فاش غلطیوں کی نشان دہی کرنا اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے بارہ میں ان کی ناپختہ اور نامکمل معلومات کا اندازہ لگایا جا سکے۔ لیاقت علی خاں کے بارہ میں لکھتے ہیں ''وہ شمال مغربی پاکستان کے ضلع ہزارہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ حملہ آور ایک اجنبی شخص تھا'' (صفحہ ۱۴۲) لیاقت علی خاں راولپنڈی میں شہید ہوئے اور راولپنڈی ضلع ہزارہ میں نہیں۔ اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ ''چند روز بعد قومی اسمبلی کی مقتدر جماعت یعنی مسلم لیگ کے رہنماؤں میں سے ایک کو نیا وزیر اعظم منتخب کر لیا وہ مشرقی پاکستان کا ایک سیاست دان تھا ان کا نام محمد علی تھا'' (ایضاً) درست کہ نیا وزیر اعظم مشرقی پاکستان کا سیاست دان تھا مگر ان کا نام خواجہ ناظم الدین

تھا۔ یہ باتیں میں اس لئے ریکارڈ پر لا رہا ہوں کہ ایسی کمزور معلومات والے شخص کو اقوام متحدہ میں سفیر کا مرتبہ دینا کسی طور مناسب نہیں تھا اور اگر بخاری صاحب ان کو کسی ایسی بات پر ٹوک دیتے تھے تو کیا برا کرتے تھے۔

باایں ہمہ علامہ اسد کی خودنوشت بڑی تشنہ سرگزشت ہے۔ اگر شاہراہ مکہ کو علامہ اسد کی اپنی خودنوشت کو اور پولا حمیدہ کی لکھی ہوئی سرگزشت کو یکجا کر کے مرتب کر دیا جائے تو علامہ کی ایک اچھی سوانح حیات مرتب ہو سکتی ہے۔

❁

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی والوں کی جانب سے ہندی کے مشہور ادیب رام پرشاد بسمل کی ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے کی مرتب کردہ آپ بیتی ''رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی'' کے عنوان سے ۲۰۰۳ میں دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اپنی پھانسی سے دو دن قبل رام پرشاد بسمل اس آپ بیتی کو مکمل کر کے اپنے ایک کرمفرما کے حوالہ کر دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہندی سے اس کا ترجمہ جناب احسان احمد صدیقی نے کیا ہے۔

ڈاکٹر اپادھیائے نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''شہید رام پرشاد بسمل ہندوستان کی قابل فخر انقلابی تحریک کے صف اول کے رہنما اور اعلیٰ درجے کے منتظم تھے۔ اس کے علاوہ بے مثال قومی شاعر ادیب اور کامیاب مترجم بھی تھے۔ رام پرشاد بسمل کی انقلابی کارروائیوں کی طرح ان کی ادبی تخلیقات نے حریت پسندوں کو جنگ اور ایثار کی راہ پر گامزن کیا۔ جنگ آزادی کے دوران حریت پسند، عوامی جلسوں جیلوں کی بیرکوں اور پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بسمل کے جذبۂ حریت پسندی سے بھرپور غزلیں اور نظمیں گاتے تھے یہ کتاب اسی بہادر انقلابی کی خودنوشت ہے اسے پڑھ کر آج بھی ہمیں اپنے وطن کی جنگ آزادی کے دوران دی گئی قربانیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ رام پرشاد بسمل کی یہ خودنوشت گورکھپور جیل میں ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ کو ہوئی اپنی پھانسی سے دو دن پہلے انتہائی مشکل حالات میں لکھ کر مکمل کی تھی۔ بنارسی داس چترویدی نے لکھا ہے ''رام پرشاد بسمل کی خودنوشت ہندی کی ممتاز خودنوشت ہے جن حالات میں یہ لکھی گئی ان کے درمیان سے گذرنے کا موقعہ لاکھوں میں سے کسی ایک ہی کو مل سکتا ہے'' (رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی دیباچہ صفحہ ۷) کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس واقعہ کے عین پچاس برس

کے بعد ایک اور انقلابی رہنما ویسے ہی حالات میں تختہ ء دار تک پہنچے گا اور اپنی خودنوشت If I am Assassinated کے نام سے لکھ کر جیل سے باہر بھیجنے میں کامیاب ہو جائے گا اور وہ خودنوشت بھی ہندوستان ہی سے چھپے گی۔ رام پرشاد بسمل اور ذوالفقار علی بھٹو میں فرق یہ رہے گا کہ رام پرشاد نے ظالم اور غاصب انگریز حاکموں کو زک پہنچانے کے لئے انہیں نقصان پہنچانے کا جرم کیا تھا بھٹو کو اس کے اپنے مقرر کردہ قابلِ اعتماد محافظوں نے تخت سے اتارا اور تختہ ء دار تک پہنچا دیا۔

یہ خودنوشت ایک غریب مگر انقلابی نظریات رکھنے والے نوجوان کی داستان حیات ہے جس کے طریق کار اور نظریات سے قاری کو اختلاف رکھنے کا پورا حق ہے مگر اس کی اپنے مقصد سے وابستگی اور پھر اپنے کئے پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار قابل قدر ہے۔ رام پرشاد بسمل نے اپنی ماں سے ایمانداری اور استقلال کا جو سبق سیکھا تھا اس کو فراموش نہیں کیا۔ یہ خودنوشت نئے دور کے انقلابیوں کو حب الوطنی کا سبق دینے کی نیت سے لکھی گئی ہے اور شاید قومی کونسل نے اس کی اشاعت میں اسی مقصد کو ملحوظ رکھا ہے۔ خدا کرے اس انقلابی کی باتیں نئی نسل کو حب الوطنی اور اپنے وطن سے وفاداری کا سبق سکھا سکیں۔ اپنی ماں کے نام جو پیغام انہوں نے لکھا وہ یاد رکھنے کا ہے ''تمہیں میری موت کی دکھ بھری خبر سنائی جائے گی۔ ماں! مجھے یقین ہے کہ تم یہ سمجھ کر حوصلہ رکھو گی کہ تمہارا بیٹا ماؤں کی ماں بھارت کی خدمت میں اپنی زندگی قربانی کی دیوی کی نذر کر گیا اور اس نے تمہاری کوکھ کو کلنک نہیں لگایا اپنے عہد پر قائم رہا جب آزاد ہند کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کے کسی صفحہ پر روشن لفظوں میں تمہارا نام بھی لکھا جائے گا'' (صفحہ ۲۱)۔ اس کی خودنوشت کا ترجمہ کرنے والوں نے اسے شہید کا نام دیا ہے اور وطن کی آزادی کے لئے قربان ہونے والے اسی نام کے سزاوار ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں اردو میں ایک محاورہ ہے ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانا۔ ہندی کا یہ محاورہ ہم نے پہلی بار سنا ہے اور لطف اٹھایا ہے کہ ''ڈیڑھ مچھلی کی کھچڑی الگ پکانا'' (صفحہ ۶۴)

میرے جیون کی کچھ یادیں

اردو کے ادیب بزرگ مولانا صلاح الدین احمد کے بھتیجے، ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما اور کانگریس کے سرگرم رکن جناب زیڈ اے احمد کی خودنوشت ''میرے جیون کی کچھ یادیں'' نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی جانب سے ۲۰۰۹ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کا مقدمہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکرٹری اے بی وردھن نے لکھا ہے اور کیا خوب لکھا ہے کہ اس خودنوشت میں ''ڈاکٹر صاحب نے کچھ ایسے تحریکی اور علمی ورق کھولے ہیں جو کمیونسٹوں کی حب الوطنی اور عوام کے تئیں نچھاور کرنے والے جذبے سے کام کرتے رہنے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان کی یہ سوانح عمری اس بات کی بھی گواہی پیش کرتی ہے کہ اصولوں کے تئیں پورے اعتبار سے کام کر کے ہی ایک سچا کمیونسٹ اور بہتر انسان بنا جا سکتا ہے''۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب انگریزی میں لکھی اور اسے شمس اقبال صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا۔

ڈاکٹر زیڈ اے احمد کا نام رفیع الدین احمد تھا مگر اسکول میں ان کا نام زین العابدین احمد لکھوایا گیا۔ (میرے جیون کی کچھ یادیں صفحہ ۱۶) جس کی وجہ ڈاکٹر صاحب نے یوں لکھی ہے کہ ''دراصل اس وقت جب میرا نام سکول میں لکھا گیا تھا والد صاحب پر اسلام کے شیعہ طبقہ کے عالموں کا رنگ چڑھ چکا تھا'' (صفحہ ایضاً)۔ ان کی پیدائش امرکوٹ ضلع تھرپارکر سندھ کی ہے مگر سکول جانے کی عمر تک ان کے ابا کا تبادلہ میر پور خاص میں گودھرا (گجرات) ہو گیا تھا۔ ان کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ''ایک بزرگ رشتہ دار گھر پر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ انہیں پڑھنے

کے لئے کسی اچھے مولوی کے سپرد کر دیا جائے۔ ان کی رائے سن کر والد صاحب پہلے تو خاموش رہے مگر جب انہوں نے اپنی بات پر زور دیا تو والد صاحب ناراض ہوتے ہوئے بولے ’کیا پڑھائے گا مولوی! بس قرآن رٹائے گا اور تھوڑی عربی یا اردو لکھنا سکھائے گا ننھے بچوں کو قرآن رٹانا وہ بھی عربی زبان میں کہاں کی عقل مندی ہے۔‘‘ (صفحہ ۱۹) اس سے قبل بھی ان کے والد دینی مدرسوں کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر چکے تھے کہ ’’اسلامی مدرسے کٹھ ملا پن کا مرکز ہوتے ہیں‘‘ (صفحہ ۱۷)۔

ڈاکٹر زیڈ اے احمد کا بچپن سندھ میں گذرا۔ سندھ بمبئی کا حصہ تھا اس لئے اندرون سندھ میں ان کے ابا کی تعیناتی ہوتی رہی اور وہ جاگتی آنکھوں سے سندھ کے وڈیروں کا حال دیکھتے رہے۔ ’’عام سندھی عوام خاص طور سے دیہاتی عوام زمینداری ظلم اور استحصال میں جینے کو مجبور تھے اور وہ زمیندار بھی کیسے تھے بے حد پچھڑے اور دقیانوس۔ بڑی زمینداریاں تقریباً مسلمان زمینداروں کے ہاتھ میں تھیں اور وہ جدید فکر سے کوسوں دور تھے۔ پھر ان میں پڑھنے لکھنے یا پڑھانے لکھانے میں دلچسپی کیونکر ہوتی۔ سماج جتنا پچھڑا رہے اتنا ہی ان کے لئے بہتر تھا۔ اس پچھڑے اور غریب سماج میں انہیں ’میر صاحب‘ کہلانے کا رتبہ حاصل تھا وہی ان کے لئے سب کچھ تھا۔ اس کی آڑ میں وہ اپنے قبضہ کی رعایا پر جتنا چاہتے ظلم ڈھانے کو آزاد تھے۔ ان سندھی (مسلم) زمینداروں، جنہیں سندھی زبان میں وڈیرہ کہا جاتا ہے، کی بیداری کی یہی سب سے اونچی حد تھی۔ انہیں اپنے قبضے کی ہزاروں ایکڑ زمین کو سدھارنے اور اچھی کھیتی کے لائق بنانے کی بھی فکر نہیں تھی۔ ان وڈیروں کے قبضے میں ایک ایک کے پاس پانچ پانچ دس دس ہزار ایکڑ تک زمین ہوا کرتی تھی لیکن ان میں سے کسی نے ۱۰۰۔۲۰۰ ایکڑ سے زیادہ زمین پر کاشتکاری کرانے سے زیادہ کی بات سوچی ہی نہیں‘‘ (صفحہ ۱۸) مسعود کھدر پوش کی ہاری رپورٹ ڈاکٹر زیڈ اے احمد کی باتوں کا دستاویزی ثبوت مہیا کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں غریبوں کے ان حالات اور استحصال کو قریب سے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو آئی سی ایس بننے کی بجائے پکے کمیونسٹ بن گئے اور انگلستان کی کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن رہے۔ پی ایچ ڈی کر کے واپس آئے تو کمیونسٹ پارٹی کے خلاف قانون ہونے کے باوجود اس کے رکن رہے اور تن من دھن اس پارٹی کے مقاصد کے لئے قربان کرنے پر مستعد رہے۔ ان کے ابا ضیاء

الدین احمد سینئر پولیس افسر تھے۔ پھوپا غلام حسین ہدایت اللہ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے (صفحہ ۲۱) انہیں اچھی اسے اچھی ملازمت مل سکتی تھی بلکہ ڈاکٹر داؤد پوتا کے ریٹائر ہونے پر خالی ہونے والی محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کی بارہ سو روپے کی اسامی کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا (صفحہ ۱۲۰) مگر آپ نے کمیونسٹ پارٹی کے لئے کام کرنے کی ترجیح دی اور اپنے ابا سے صاف کہہ دیا کہ آپ ملازمت نہیں کریں گے۔ لکھنؤ گئے اور کمیونسٹ پارٹی کے لندن گروپ کے باقی اراکین سے ملے۔ سجاد ظہیر، محمود الظفر ڈاکٹر اشرف وغیرہ سے اور ’’بعد کو اپنی ہونے والی بیوی ہاجرہ بیگم کے ہمراہ پارٹی کے ہول ٹائمر بن گئے‘‘ (صفحہ ۱۲۵) پارٹی کی ہدایت پر انہیں کانگریس میں شامل ہو کر سیاسی کام کرنے کا حکم ہوا چنانچہ آپ پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے اور کل ہند کانگریس کمیٹی میں کام کرنے لگے۔

پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کے ملنے کی روداد دلچسپ بھی ہے اور چشم کشا بھی۔ ’’گفتگو کے دوران پنڈت جی نے سب سے پہلے ہم لوگوں کا تعارف اور خاندان کے بارے میں پوچھا جس کا میں نے صحیح صحیح جواب دیا اپنے والد کے بارہ میں بتایا ہمارے والد صاحب پولیس آئی جی ہیں میرے سامنے روٹی روزی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے میں تو صرف آپ کی نگرانی اور قیادت میں سیاسی کام کرنا چاہتا ہوں میں آپ کے حکم کے مطابق سیاسی کام میں پورا وقت دوں گا پنڈت جی کچھ سوچتے رہے پھر بولے تم لوگ اتنے خود کفیل خاندان کے ہو لیکن ہمارے دفتر کے جو ہول ٹائمر ہیں ہم انہیں گذر بسر کے لئے ہی کچھ دے پاتے ہیں وہ بہت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں ایسی حالت میں تم اپنی زندگی گذارتے ہوئے کام کر سکو گے؟‘‘ میں نے کہا کیوں نہیں میں یہ سب کرنے کے لئے پورے طور پر تیار ہوں آپ بھی مجھے اتنا ہی دے دیجئے جتنا دوسروں کو دیتے ہیں۔ نہرو صاحب نے کہا میں تم کو پچاس روپیہ مہینہ دوں گا اور جب شادی کر لو گے تو ۷۵ روپیہ مہینہ دوں گا اس سے زیادہ ہم نہیں دے سکتے اگر اتنے میں تمہارا کام چل سکے تو جب چاہو کام شروع کر سکتے ہو‘‘۔۔۔ ’’گفتگو کے دوران ہی انہوں نے مجھ سے ایک ایسا سوال پوچھا جس کو سن کر میں یک بیک گھبرا گیا۔ پنڈت جی نے مجھ سے پوچھا تم کس نظریہ کی سیاست کرنا چاہتے ہو؟ تمہارا سیاسی اصول کیا ہے؟ میں ایک دم ٹپٹا گیا کوئی جواب دیتے نہیں بن پا رہا تھا یہ بھی ڈر تھا کہ اگر میں سیدھے طور پر بتا دیا کہ میں کمیونسٹ ہوں تو

معلوم نہیں پنڈت جی ناراض ہو جائیں۔ کچھ سیکنڈ سوچنے کے بعد میں نے جواب دیا میں سوشلسٹ ہوں۔ لگتا تھا پنڈت جی میرے تاثرات کو تاڑ گئے اس لئے فوراً ہی چٹکی لیتے ہوئے دوسرا سوال جڑ دیا کیسے سوشلسٹ ہو فے بین یا مارکسی؟ تب میں نے واضح طور پر کہہ دیا میں مارکسی ہوں۔ میری گھبراہٹ اور جواب دینے کے ہڑبڑاہٹ بھرے طریقے پر وہ ہنس پڑے اور کہا بہت اچھی بات ہے پرسوں جس وقت چاہو آ کر اپنا کام شروع کر دو۔ جہاں تک مارکسزم کا سوال ہے تو میری لائبریری چلو اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی لائبریری میں لے گئے اور کہا ان کتابوں کو دیکھو یہاں چاروں طرف مارکسی فلسفہ اور ادب بھرا پڑا ہے مارکس، اینگلس لینن کی کتابیں دستیاب ہیں تم جتنا بھی چاہو ان کا استعمال کر سکتے ہو" (صفحہ ۱۲۶۔۱۲۷)

جلد ہی آپ سوراج بھون یعنی پنڈت جی کی قیام گاہ میں قائم کانگریس کے دفتر میں ڈاکٹر اشرف اور رام منوہر لوہیا کے ہمراہ رہنے اور کام کرنے لگے۔ کانگریس میں ان پڑھے لکھے پکے کمیونسٹوں کو رکھ لینا نہرو ہی کا کام تھا اور نہرو نے ان کی علمیت کا خوب فائدہ بھی اٹھایا۔ لال بہادر شاستری کو جو بعد کو ہندوستان کے وزیر اعظم ہوئے ڈاکٹر زیڈ اے احمد کی شاگردی میں دے دیا کہ "ان کو "لاسکی" کا سیاسی قاعدہ پڑھا دیں اور لال بہادر شاستری نے ان کے سامنے با قاعدہ زانوئے تلمذ تہہ کر کے سبق لئے" (صفحہ ۱۳۹) اس بات کی داد بھی دینا پڑتی ہے کہ یہ لوگ اپنے مقصد کے ساتھ کیسی گہری وابستگی رکھتے تھے اور برضا و رغبت کام کرتے تھے۔ جس طرح احمد بشیر اور حمید اختر نے پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں کی تاریخ محفوظ کی ہے اور ان کی بے لوث قربانیوں کا تذکرہ مختلف کتابوں میں کیا ہے ڈاکٹر زیڈ اے احمد کی کتاب آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ ہے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے اپنے مقصد کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں، روپوشیوں کی پریشانیاں بھی اٹھائیں، اعلیٰ سماجی مرتبے کے خاندانوں سے تعلق ہونے کے باوجود غریبوں جیسے وسائل میں زندگی کرنا سیکھا۔ غریبوں کی بہبود کے لئے ہمارے وڈیروں کی طرح محض نعرے نہیں لگائے ذاتی طور پر ان جیسی زندگی بھی کر کے دکھائی۔

ڈاکٹر زیڈ اے احمد ۱۹۲۸ میں تعلیم کے لئے انگلستان گئے تو اس وقت انگلستان شدید معاشی

بحران کا شکار تھا۔ "وہاں ہندوستان جیسی غریبی تو نہیں تھی ۔۔۔ مگر (انہوں نے دیکھا) کہ" انگلینڈ جیسے سرمایہ دار ملک میں بھی گہری معاشی تنگی ہے لوگ ٹیمس ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے ملتے تھے ان کے پاس بستر اور مناسب کپڑے نہیں ہوتے تھے وہ سردی میں کانپتے دکھائی دیتے تھے ساری رات وہ کاغذ بچھا کر کھمبے کے نیچے سو کر گذارتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا اتنے خود کفیل ملک میں ہزاروں لوگوں کے پاس پہننے اور اوڑھنے کے لئے گرم کپڑے نہیں ہیں ۔۔۔ دیہاتوں میں ٹہلتے ٹہلتے گیا وہاں کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ کسانوں کے مکانوں کی چھتیں ٹوٹی ہوئی تھیں ایسے لوگ بھی تھے جنہیں دو وقت کا پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا تھا ۔۔۔ انگلینڈ میں غریبی کے الگ الگ پہلو میرے سامنے آئے اگر کسی نے سگریٹ پینے کے بعد بچے ہوئے ٹکڑے کو سڑک پر پھینک دیا تو کئی آدمی اس کو اٹھانے کے لئے لپکتے تھے لوگ ہوٹل کے باہر ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگتے تھے" (صفحہ ۷۷) ماحول میں پھیلی ہوئی اس غربت اور لندن سکول آف اکنامکس کی فضا نے ان کے ذہن میں اشترا کی نظریات کو پختہ کر دیا۔ ادھر پارسی سرمایہ دار خاندان کے دھتکارے ہوئے ساپور جی سکلت والا اور آکسفورڈ کے سجاد ظہیر سے ملاقاتوں نے انہیں ترقی پسند تحریک کی طرف راغب کیا۔ شوکت عمر، ڈاکٹر اشرف اور محمود الظفر کی رفاقت سے ان کی کمیونزم سے وابستگی پختہ ہو گئی۔ آپ" کیمبرج جا کر کامریڈ محمد دین تاثیر سے بھی ملے ۔۔۔ وہ ایک پڑھے لکھے اور بہت ہی قابل نوجوان تھے۔ وہ اسلامیہ کالج امرتسر میں استاد اور بلند معیار کے اردو شاعر تھے اسلامی فلسفہ اور اسلامی تاریخ کا انہیں گہرا مطالعہ تھا اس کے ساتھ ساتھ ان کو کمیونسٹ فلسفہ اور اس کی تحریک میں بھی بہت دلچسپی تھی۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے" (صفحہ ۱۱۴)

ان تمام رفاقتوں کے باوجود لندن والے انہیں کمیونسٹ پارٹی کا رکن بنانے میں جھجکتے تھے۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل درمیان میں آئی تو انہیں با قاعدہ رکنیت دی گئی اس طرح پڑھے لکھے نوجوانوں کا یہ گروپ پکا کمیونسٹ ہو کر ہندوستان لوٹا۔ تینوں گول میز کانفرنسوں کے موقع پر بھی یہ گروپ مستعد اور چوکس رہا۔ پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر تو زیڈ اے احمد، شوکت عمر اور اشرف تو رہتے ہی مولانا محمد علی کے ساتھ تھے۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے ان کے ایک نمائندہ کو برلن آنے کی دعوت دی تو زیڈ اے احمد

ہی وہاں گئے اور ہٹلر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر کے آئے۔

دوسری گول میز کانفرنس (۷ ستمبر تا یکم دسمبر ۱۹۳۱) میں گاندھی جی بھی کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے تو اس گروپ نے ان کو گھیر لیا'' گاندھی جی ہمیں بتایئے کہ آپ نے پشاور کے ان قیدیوں کی رہائی کے لئے جنہوں نے نہتے لوگوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا لارڈ اروِن سے مانگ کیوں نہیں کی؟'' گاندھی جی تھوڑا اسٹپٹا گئے کچھ دیر چپ رہے۔۔۔ پھر انہوں نے کہا ہم فوج کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے ہیں اگر ہماری حکومت بنی اور فوجی اسی طریقے سے بے ضابطگی کا مظاہرہ کریں گے تو ہمیں بھی سخت قدم اٹھانا پڑیں گے' یہ سن کر ہال میں کافی شور وغل مچ گیا۔ زیادہ تر ہندوستانی کھڑے ہو کر چلانے لگے ہم گاندھی جی کے اس جواب سے مطمئن نہیں۔ کسی نے کہا گاندھی جی سامراجیت سے نجات نہیں سمجھوتا چاہتے ہیں۔۔۔ گاندھی جی اٹھے اور پچھلے دروازے سے باہر نکل گئے'' (صفحہ ۹۴)

ان کے گروپ میں نواب رامپور کے خاندان کی ایک مطلقہ خاتون ہاجرہ بیگم بھی تھیں جو اپنے دو سالہ بیٹے کے ہمراہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کو لندن گئی تھیں۔ یہی ہاجرہ بیگم بعد کو ان کی بیوی بنیں۔ ''ان کا نکاح جسٹس سر سید وزیر حسن کی کوٹھی پر ڈاکٹر اشرف نے پڑھا۔ ان کے اور ہاجرہ بیگم کے نکاح نامے پر سجاد ظہیر اور فراق گورکھپوری کے بطور گواہ دستخط ہیں'' (صفحہ ۱۳۲) ہاجرہ بیگم کے صاحبزادے سمیع خاں بعد کو ہندوستانی فوج میں جرنیل بن کر ریٹائر ہوئے۔

مسلمانوں کے بارہ میں اچاریہ کرپلانی جیسے کانگریسی لیڈر کی ایک بات ڈاکٹر صاحب نے بیان کی ہے وہ ہندوؤں کی ذہنیت کی آئینہ دار ہے اور اسی کے شاخسانہ کے طور پر یہ لوگ کانگریس کے دفتر سے علیحدہ بھی ہوئے۔ ''اچاریہ کرپلانی نے مسلمانوں کے بارہ میں انگریزی میں کہا مسلمانوں کے بارہ میں میرے رائے ہے کہ لیٹ سلیپنگ ڈاگز لائی۔ یعنی سوتے ہوئے کتوں کو سونے دو اگر وہ جاگیں گے تو بھونکنے لگیں گے۔ جب ہماری حکومت بنے گی تو ہم ان سے نمٹیں گے'' (صفحہ ۱۳۹) بات نہرو تک گئی گاندھی جی تک گئی مگر اس کا کوئی حل نہ نکلا اس لئے یہ لوگ کانگریس کے دفتر سے تو علیحدہ ہو گئے اپنے نظریات پر مستحکم رہے۔ اور سارے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرتے

رہے۔ اس سلسلہ میں انگریزوں کی قید میں بھی رہے اور بہت تکلیفیں اٹھائیں۔ بنگال کے قحط کے سلسلہ میں دل ہلا دینے والی تفصیلات اس کتاب میں درج ہیں۔ اپٹا یعنی انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کی طرف سے بے شمار اناج اور کپڑے اکٹھے کر کے بھوکے بنگالیوں کی مدد کرنے کا بھی تذکرہ بھی ہے گیت کے ایک ٹکڑے کا بھی کہ:

''بھوکا ہے بنگال رے ساتھی۔ بھوکا ہے بنگال
جن ہاتھوں نے موتی رولے آج وہی کنگال،
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال''

یہ گیت اتنا دل کو چھو لینے والا تھا کہ لوگوں کے اندر تک کو ہلا دیتا تھا اور وہ رو پڑتے تھے'' (صفحہ ۲۷۹) وامق جونپوری نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ یہ گیت ان کا لکھا ہوا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے کامریڈوں میں وامق جونپوری کا ذکر تو کیا ہے اس گیت کے سلسلہ میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ (صفحہ ۳۰۲)

آزادی مل جانے کے بعد اتر پردیش میں پنت کی حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دیا تو آپ روپوش ہو گئے۔ کچھ دنوں کے لئے لاہور بھی آئے اور اپنے بھائی ڈبلیو زیڈ احمد (وحید الدین احمد) کے ہاں چھپے رہے۔ اتفاق سے ڈبلیو زیڈ احمد کے ہاں ایک دعوت میں خاں قربان علی خاں آئی جی پولیس دعوت میں آئے ہوئے تھے انہوں نے پوچھ لیا کہ ڈاکٹر زیڈ اے احمد آجکل کہاں ہیں؟ وحید صاحب کی بیگم نے سادگی میں کہہ دیا یہیں تو ہیں۔ یہ وہاں سے اپنے دوسرے بھائی ظفر الدین احمد کے پاس کراچی چلے گئے جو پولیس میں ڈی آئی جی تھے وہاں بھی سی آئی ڈی پہنچ گئی۔ آخر بھائیوں نے یہی فیصلہ کیا کہ انہیں واپس ہندوستان بھیج دیا جائے اور آپ وہاں سے تاجر کے روپ میں واپس ہندوستان چلے گئے۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۶۰ کی دہائی سے ۱۹۹۴ تک مسلسل پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے اور ۱۹۹۴ میں ریٹائر ہوئے اور پارٹی نے اپنے سولہویں اجلاس میں منعقدہ ۷ تا ۱۱۔ اکتوبر میں انہیں ویٹرن رکن بنا کر عام ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا۔ (صفحہ ۳۱۴) کتاب کا آخری باب ان کی بیگم ہاجرہ

بیگم کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اختتامیہ ان کی بیٹی سلیمہ رضا نے لکھا ہے۔ آپ ۱۷ جنوری ۲۰۰۰ کو ترانوے برس کی عمر میں رہگزائے قضا ہوئے۔ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے۔ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔

ڈاکٹر زیڈ اے احمد نے اپنے خاندان کے رجحانات پر کیا خوبصورت بات کتاب کے آغاز ہی میں لکھ دی ہے کہ ''میرے ابا جدید سوچ کے ایک کشادہ دل اور رحمدل انسان تھے اپنے اسی میلان کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ بڑی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہ آزاد خیال اور رحم دل ہی نہیں تھے ان میں وطن پرستی اور قومیت کا جذبہ بھی خوب تھا۔ کئی بار تو انہیں اسی لئے پریشانیاں جھیلنی پڑیں کیونکہ ایک اعلیٰ پولیس افسر ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے جذبہء وطن پرستی کو چھپا نہیں سکے تھے۔ میرے چچا صلاح الدین احمد بھی ایک وطن پرست ادیب تھے ان کی تحریروں میں برطانوی حکومت اور اس کے مظالم کی مخالفت کا اظہار ہوتا تھا'' (صفحہ ۳) اور اس بات کی گواہی تو پاکستان کا ہر ادیب دے سکتا ہے کہ اس خاندان کے اکثر افراد نے حق گوئی و بے باکی کا علم ہمیشہ بلند رکھا۔ مولانا کی اولاد میں ان کی نواسی اسماء (عاصمہ) جیلانی حقوق انسانی کے اتلاف پر تڑپ اٹھتی ہے اور اپنے نانا کے علم کو سرنگوں ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ اللہ اس کو سلامت رکھے۔

غرض ڈاکٹر زین العابدین احمد کی یہ خودنوشت ہندوستان کے غریب عوام کی جدوجہد کی مستند تاریخ کا درجہ رکھتی ہے اور مدتوں یاد رکھی جائے گی۔

اور یہ بستی نہیں یہ دلی ہے

محترم سید شوکت علی شوق نگینوی ثم رفعت سروش کی خودنوشت تین مختلف حصوں میں اور وقتوں میں چھپ کر سامنے آئی۔ ۱۹۹۳ میں ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' دلی سے شائع ہوئی۔ اس میں آپ نے لکھا تھا کہ ان کی زندگی کے وہ حالات جو بمبئی سے متعلق ہیں ۱۹۸۶ میں ''بزم ارایاں'' کے عنوان سے چھپ چکے ہیں ساتھ میں یہ بھی مرقوم تھا کہ ان کی ابتدائی زندگی کے حالات ''نقوشِ رفتہ'' کے عنوان سے ۱۹۸۳ میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب جو خودنوشت ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' کے نام سے مجھ تک پہنچی ہے اس میں ان کی ابتدائی زندگی اور بچپن کے حالات درج ہیں خدا معلوم یہ کتاب نقوش رفتہ کا کوئی بازیافتہ نقش ہے یا کوئی نئی کتاب ہے۔ یہ کتاب نورنگ کتاب گھر نوائیدہ والوں کی جانب سے ۱۹۹۶ میں چھپی ہے۔ کتاب کے اندرونی فلیپ پر ڈاکٹر رضیہ حامد نے ان کے ۱۹۳۸ سے لے کر اب تک کے تخلیقی سفر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''رفعت سروش کی دسترس میں لفظ کے اظہار کی تمام اصناف ہیں۔ ۹ شعری مجموعے، ۶ منظوم ڈراموں کی کتابیں، ایک ناول، ۶ نثری تخلیقات اور تین تراجم'' شامل ہیں۔ شاید خودنوشت کے تین مختلف حصے تین نثری تخلیقات کے ضمن میں آتے ہوں۔

خودنوشت کے اس حصہ میں ان کی بچپن کی زندگی اور خاندانی حالات مرقوم ہیں۔ میں نے ان کی خودنوشت ''اور بستی نہیں یہ دلی ہے'' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ کتاب ''ان کی ریڈیو بیتی کے سوا اور کچھ نہیں۔ جہاں انہوں نے ادب کے بارہ میں بات کرنے کی کوشش کی ہے وہیں خودستائی ان کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی ہے'' (پس نوشت اور پس پس نوشت صفحہ ۳۲۴)۔ ''پتہ پتہ بوٹا بوٹا'' میں بھی ان کی ابتدائی زندگی کا وہ حصہ معرضِ بیان میں آیا ہے جب یہ کچھ عرصہ کے لئے دلی میں مقیم رہے اور

کلر کی کی چکی میں پستے اور زندگی کی گاڑی کو گھسیٹتے رہے۔اس دوران ان کی ''خوبصورت لاابالی سے نوجوان ، بالوں میں خوبصورت سی بے ترتیبی گفتگو میں اڑان اور ترنم میں دل کو چھو جانے والا سوز'' رکھنے والے جمیل الدین عالی سے اور اختر الایمان سے ملاقات ہوئی (پتہ پتہ بوٹا بوٹا صفحہ ۸۹)۔مجاز کو انہوں نے ''ہارڈنگ لائبریری کے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دیکھا'' (صفحہ ۹۵) پھر ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرہ میں مجاز جذبی نخشب جارچوی کو سنا۔خواجہ محمد شفیع دہلوی کی اردو مجلس تک رسائی ہوئی اور وہاں دلی کے ادیبوں شاعروں سے انہیں ملنے کا موقع میسر آیا۔شاہد احمد دہلوی اور مکتبہ علم و ادب تک پہنچے۔محمد حسن عسکری سے علیک سلیک رہی۔خدا معلوم انہیں ''پنجابیوں'' سے کیوں کد رہی۔

اپنے وطن نگینہ میں تھے تو اپنے ایک دوست پر رکھ کر پنجابیوں کو مطعون کیا کہ ''کہ سب حجاج اور حفاظ ذخیرہ اندوزی کر رہے تھے اور یہ سب پنجابی برادری کے افراد تھے'' (صفحہ ۶۹) دلی میں آئے تو ساقی کے حوالے سے پنجابیوں پر برسے کہ'' شاہد احمد دہلوی پنجابیوں کی اردو کی گرفت کرتے رہتے تھے'' (صفحہ ۱۰۱) پھر اسی رو میں ''فیض احمد فیض کے ساتھ عبدالمجید سالک کو بھی فوج میں بھرتی کروا گئے ہیں'' (صفحہ ۱۰۲) حالانکہ فوج والے کرنل مجید ملک عبدالمجید سالک نہیں تھے۔آپ نے ایک جگہ اپنی نظموں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' میرے ایک نقاد انور صدیقی نے مجھے آنکھ کا شاعر کہا ہے'' (صفحہ ۵۵) مگر مجھے شبہ ہے کہ یہ آنکھ ''دیدہ بینا'' نہیں۔اپنے ''اعتراف'' میں ان کا کہنا ہے کہ'' میں نے جب قلم اٹھالیا تو خوف فساد خلق کو دل سے نکال دیا'' (صفحہ ۷) مگر حال یہ ہے کہ اپنی آٹھ سال کی عمر میں اپنے وطن موانہ میں اپنے ایک بزرگ کی علمیت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' قادیانیوں سنی شیعہ مسلمانوں کے درمیان مناظرہ ہوا۔قادیانی مولوی ایسے دوڑے کہ اگلے روز نظر ہی نہ آئے'' (صفحہ ۷۳) اس کا مطلب یہ ہوا کہ خوف فساد خلق ہی کو نہیں خدا کا خوف بھی دل سے نکال دیا ہے آٹھ سال کے بچے کو مناظرہ یا اس کے عواقب کی کیا سمجھ ہو سکتی ہے؟ پنجابیوں کے ساتھ قادیانیوں کو بھی لپیٹ لیا ہے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ یہاں جناب محمد اسلم خاں خٹک کی خودنوشت کا حوالہ درج کروں مگر افسوس کہ وہ خودنوشت اس وقت میرے سامنے نہیں۔خٹک صاحب نے لکھا ہے کہ حکومت نے مجھے کابل

میں اس مشن پر بھیجا کہ یہ تو پتہ چلاؤں کہ کابل والے ایک مسلمان ہمسایہ ملک ہونے کے باوجود پاکستان کے کیوں دشمن بنے ہوئے ہیں تو آپ نے ارباب حل وعقد سے گفتگو کی۔ان کا پہلا جواب یہ تھا کہ ہم پاکستان کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں؟ ہمارے سب سے بڑے دشمن پاکستان پر چھائے ہوئے ہیں۔خٹک صاحب نے پوچھا وہ کون ہیں؟ جواب ملا ''قادیانی''۔خٹک صاحب کا کہنا ہے کہ وہ حیران رہ گئے جب زیادہ کریدا تو پتہ چلا کہ وہ ہر پنجابی کو ''قادیانی'' کہتے ہیں۔جس طرح بنگالی ہر مغربی پاکستانی کو پنجابی کہتے تھے۔اس لئے کابل والے ہر پنجابی کو قادیانی سمجھتے تھے۔میں نے یہ حوالہ اپنی سنت جاریہ سے انحراف کرتے ہوئے درج کیا ہے کہ خٹک صاحب کی خودنوشت میرے مطالعہ میں آئی پیشتر ازیں کہ میں اس کا حوالہ نوٹ کر سکتا جس دوست سے مستعار لی تھی وہ واپس لے گئے اب یہ سطور لکھتے وقت وہ دوست ملک سے باہر ہیں۔جب بھی خٹک صاحب کی خودنوشت دستیاب ہوگی اس کا حوالہ لفظ بہ لفظ بلحاظ صفحہ قارئین تک پہنچادوں گا۔ ریٹائرڈ جنرل علی قلی خاں کو خط لکھ کر ان سے ان کے تایا کی خودنوشت طلب کی ہوئی ہے دیکھئے شاید وہ توجہ فرمائیں۔

ان کی ادبی معلومات کا عالم یہ ہے کہ انشا کے مشہور زمانہ شعر میں تصرف فرمانا جائز سمجھتے ہیں اور مطلب کے خبط ہونے کا بھی انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔''فلک کی تیرہ بختی چین دیتی ہے کسے انشا۔غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں'' (صفحہ ۹۴) کیا وِوِدھ بھارتی والے ایسے ہی اہلِ ذوق پالتے رہے ہیں؟

بمبئی سے جی ایچ کیو تک

پاکستانی فوج کے بہادر، نڈر اور سپیشل سروسز گروپ کے بانی میجر جنرل ابوبکر عثمان مٹھا مرحوم کی خودنوشت بہت برس پہلے ۱۹۹۳ میں انگریزی میں Fallacies and Realities کے عنوان سے چھپی تھی۔ اب اس کا کرنل غلام جیلانی خاں کا کیا ہوا نہایت نفیس اردو ترجمہ ۲۰۰۹ میں ''بمبئی سے جی ایچ کیو تک'' کے عنوان سے دوست پبلیکیشنز اسلام آباد نے چھاپا ہے۔ یہ کتاب جنرل مٹھا کی زندگی میں چھپنے کو تیار تھی۔ وہ خود اس کا دیباچہ وغیرہ لکھنا چاہتے تھے پھر بوجوہ آپ نے اسے اسی طرح چھاپنے کی اجازت اپنی شریک حیات محترمہ اندو مٹھا کو دے دی۔ محترمہ اندو نے دیباچہ تو نہیں لکھا کتاب کے آخر میں ایک جامع و مانع اختتامیہ شامل کر دیا جس سے کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ بہ نظر ظاہر اس کتاب کا مقصد جنرل گل حسن کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا جواب دینا ہے۔ جنرل گل حسن نے اپنی خودنوشت میں جنرل ابوبکر کے بارہ میں بعض ایسی باتیں لکھی تھیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اس لئے اس کتاب کے انگریزی نام کا لفظی ترجمہ ''غلط بیانیاں اور حقائق'' بنتا تھا مگر کتاب میں بیان کردہ باتوں کے تنوع کی وجہ سے اس کا عنوان ''بمبئی سے جی ایچ کیو تک'' تجویز ہوا اور کتاب کا متن پڑھنے کے بعد یہی مناسب معلوم دیتا ہے۔

میجر جنرل ابوبکر عثمان مٹھا بمبئی کے ایک امیر کبیر معزز میمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سیاسی اور معاشرتی حلقوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے حتیٰ کہ انگریز گورنر اور وائسرائے تک ان کے ہاں آتے تھے۔ ابوبکر جنہیں گھر والے اور دوست محض ''ابو'' کہتے تھے نے نوجوانی میں ہی فوج میں شمولیت کا ارادہ کر لیا اس کے لئے پونا میں شیواجی سکول میں داخل ہو گئے جہاں فوج میں

داخلہ کی تیاری کروائی جاتی تھی۔ وہاں سے آپ فوج کے لئے منتخب ہوئے اور انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے پہلے عارضی کمشن حاصل کیا۔ دوسری جنگ عظیم میں حصہ لیا۔ پھر مستقل کمشن پایا۔ پاکستان بننے پر پاکستان فوج میں آجانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت آپ دہلی جی ایچ کیو میں کام کر رہے تھے اور کپتان تھے۔ مارچ ۱۹۴۸ میں آپ پاکستان آگئے ان کے خاندان میں سے صرف دو پھوپھیاں پاکستان آئیں۔ باقی لوگ بمبئی ہی میں رہے۔ ان کی بیگم گورنمنٹ کالج لاہور کے مشہور استاد پروفیسر چیٹر جی کی صاحبزادی اندو ہیں۔ پروفیسر چیٹر جی عیسائی تھے اور دہلی میں مقیم تھے۔ اندو فلسفہ میں ایم اے کرنے کے بعد جنرل مٹھا کے عقد میں آئیں۔ پاکستان میں آپ نے مشہور کلاسیکی رقص بھارت نائیٹم کا علم بلند رکھا اور بہت اچھی اچھی رقاصائیں پیدا کیں۔

جنرل مٹھا کی یہ خودنوشت اگرچہ بہت طول طویل خودنوشت ہے مگر یادوں کی مکمل بازگشت کے عیب سے مبرا لگتی ہے کیونکہ جنرل صاحب نے واقعات کے بیان میں بہت محتاط رویہ اپنایا ہے اسی لئے ان کی رفیقہء حیات اندو مٹھا کو یہ شکوہ ہے کہ ''اپنے شوہر کی کتاب کے مسودہ کو پڑھنے کے بعد جس بات نے مجھے از حد غمگین کیا وہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد کے طویل وقفہ کو (۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ تا ۴ دسمبر ۱۹۹۹) کو صرف ایک باب میں سمیٹ ڈالا حالانکہ یہ وقفہ ان کی سروس کے مقابلہ میں اتنا مختصر نہ تھا'' (بمبئی سے جی ایچ کیو تک۔ صفحہ ۶۵۹) اس کا مطلب ہے کہ جنرل مٹھا کے بے پناہ مطالعہ نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ زندگی کی صرف وہ تفصیلات بیان کرنے کے لائق ہوتی ہیں جو آپ کی شخصیت کے تمام پہلو مناسب طور سے بیان کر دیں اور یہی بات اس طویل خودنوشت کی کامیابی کی دلیل بنتی ہے۔ محترمہ اندو مٹھا نے لکھا ہے کہ ''جو حقائق اور جو تفاصیل بعد میں ان کو معلوم ہوئیں ان پر انہوں نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔۔۔ ایک واحد بات جو انہوں نے میرے ساتھ شیئر کی اس کو بیان کرنے کا رسک مول لینے کو تیار ہوں۔ وہ بات یہ تھی کہ جنرل یحییٰ کے مارشل لاء کے زمانہ میں جی ایچ کیو میں معمول کی ہفتہ واری کانفرنسیں ہوا کرتی تھیں جن میں سارے پی ایس اوز شریک ہوا کرتے تھے۔ جب وہ ختم ہوتیں تو بعض پی ایس اوز بشمول جنرل گل حسن یحییٰ کے دفتر میں رک جاتے یا اسی روز شام کو یحییٰ کو جا ملتے۔ لیکن میجر جنرل مٹھا (کیو ایم جی) اور میجر جنرل افتخار جنجوعہ

(ایم جی او) کبھی بھی اس گروپ میں شامل نہیں رہے۔ تو ایسے میں کوئی ''کچن کابینہ'' یا وہ غلط اصطلاح جسے ''ملٹری ٹولہ'' کہا جاتا ہے اگر تھی تو اس کی اصل حقیقت یہی تھی'' (صفحہ ۶۵۸)۔

اس خودنوشت سے جنرل مٹھا کی شخصیت کو جو اہم پہلو سامنے آتا ہے وہ ہے'' ان کا ناروا دھانس اور دھاندلی کے سامنے ڈٹ جانا'' (صفحہ ۵۱) ان کی باقی ساری سرگزشت ان کی اس بات کی گواہ بنتی ہے۔ ایوب نے جو کمانڈر انچیف تھے انہیں کوئی غلط کام کرنے کو کہا تو آپ نے صاف انکار کر دیا (صفحہ ۳۷۵) پھر ان کی صاف گوئی اور انصاف پسندی کے بھی کئی رخ سامنے آتے ہیں۔ جنرل گل حسن نے ان کے خلاف اپنی یادداشتوں میں ان کے قول کے مطابق ''جھوٹ کے پلندے'' اکٹھے کر دئے ہیں مگر انہی کا کہنا ہے کہ گل حسن کی جگہ ان کا تقرر ہوا تو رات کے کھانے پر یہ ''دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے اور فوج کے بارے میں گپ شپ لگاتے ان معاملات اور موضوعات پر وہ مجھ سے کہیں زیادہ معلومات رکھتا تھا'' (صفحہ ۴۹۱) یعنی جنرل صاحب انگریزی محاورہ کے مطابق Give the devil his due پر یقین رکھتے تھے۔ یحیٰ کے باب میں بھی ان کی رائے بڑی نچی تلی اور انصاف پر مبنی ہے کہ جب بھی یحیٰ نے کوئی سفارش کی یحیٰ نے انہیں یہی حکم دیا کہ'' قانون کے مطابق عمل کرو'' (صفحہ ۵۴۰)۔

کمانڈر انچیف ایوب کے بارہ میں ان کی رائے بڑی وزنی ہے'' میں ایوب کو بطور کمانڈر انچیف نہایت محترم گردانتا تھا وہ کثیر المطالعہ انسان تھے۔ وہ اپنے ملنے والوں کو مختلف موضوعات پر اپنے علم و فضل سے حیرت میں ڈال دیتے تھے۔۔۔ ان کے دماغ میں کوئی الجھاؤ نہ تھا۔۔۔ جب میں یہ سطور قلمبند کر رہا ہوں (مارچ ۱۹۹۸) تو کہہ سکتا ہوں کہ ان جیسا عالی ظرف اور عالی دماغ کمانڈر انچیف کوئی دوسرا نہیں گذرا'' (صفحہ ۳۶۸) اس کے ساتھ ساتھ جنرل حمید کی یہ بات بھی لکھ دی ہے کہ'' جنرل حمید کہنے لگے جب میں بطور ملٹری سکریٹری تعینات ہوا تھا تو ایوب خاں نے مجھے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ قادیانیوں پر کڑی نظر رکھوں۔۔۔ میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا کہ حمید جیسا کشادہ مشرب انسان بھی اس قسم کے تعصبات کا حامل تھا'' (صفحہ ۳۹۱) جنرل صاحب نے صاف صاف دکھ کا اظہار کیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ'' یہ عدم برداشت روز بروز بڑھتی رہی آج نوبت یہاں تک آچکی ہے کہ مذہب کے نام پر سیکڑوں مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں حالانکہ ہمارا دین تمام ادیان میں

سب سے زیادہ اعتدال پسند دین ہے'' (صفحہ ایضاً) ''پاکستان میں مذہبی شدت پسندی کی انتہا'' (صفحہ ۱۸۲) کا انہیں اندازہ ہو گیا تھا فوج میں سہل کوشی کا جو کلچر فروغ پا رہا تھا (صفحہ ۱۸۴) اس پر انہیں بجا طور پر تشویش تھی۔

فوجی زندگی کی ابتدا میں انہیں بنگال کے قحط کا قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔ ان کی یونٹ کو قحط زدگان کی مدد کرنے کا حکم ملا۔ یہ ''۱۹۴۳ کا بنگال کا بدترین قحط تھا۔ جب سے میں نے یونٹ جائن کی تھی ہم آبادیوں سے دور مضافات میں رہتے تھے اب پہلی بار آبادیوں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ۔۔۔ میں گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں گیا تو دیکھا کہ کھاتے پیتے لوگوں کی گاڑیاں قطار اندر قطار آ رہی ہیں فٹ پاتھوں پر ان کے سامنے ننگ دھڑنگ بھوک سے بلبلاتے اور فاقوں کے شکار مرد و زن اور بچے بوڑھے لاشوں کے انبار کی صورت پڑے ہیں لیکن ان ''امراء'' کی نگاہیں ان لاشوں کے کسی حصے پر نہیں پڑتیں وہ اپنی دھن میں مال مست اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی توندیں نکالے سیدھے ہوٹل کے ڈائننگ ہالوں کا رخ کر رہے تھے۔ قحط کا شکار معصوم بچوں کی کراہیں اور سسکیاں شاید ان امیر زادوں تک پہنچ ہی نہ پاتی تھیں۔ مزید حیرت انگیز بات یہ کہ ان لوگوں میں امریکی اور برطانوی بھی تھے۔ لیکن کثرت مقامی امرا اور رؤسا اور خوشحال اور مرفہ حال سیٹھوں کی تھی۔۔۔ میرے ساتھ ڈک پکاڈون بھی تھا۔ وہ بھی میری طرح اس انسانی بے حسی پر حیران و پریشان تھا! جو کچھ ہماری جیبوں میں تھا ہم دونوں نے قحط کے مارے لوگوں کے حوالے کیا اور سیدھے واپس اپنے کیمپ میں آ گئے'' (صفحہ ۱۱۲۔۱۱۳) اس لمبے اقتباس سے ان کی انسان دوستی اور ہمدردی کے علاوہ اس بات کا سراغ بھی ملتا ہے کہ اس صورت حال نے انہیں پڑھنے اور سوچنے پر آمادہ کیا اور آپ نے فوجی زندگی میں بھی اپنے مطالعہ کی عادت کو ترک نہیں کیا۔

اس خودنوشت کا احوال الرجال والا حصہ بھی یادگار ہے۔ فوجی افسروں اور سیاسی رہنماؤں کے باب میں ان کی رائے بڑی وقیع ہے۔ ایوب گل حسن اور جنرل حمید کا مختصر ذکر ہو چکا ہے دوسرے جرنیلوں کا ذکر۔ جنرل افتخار ان کے جی او سی معائنہ کے لئے آئے ان کی شہرت تھی کہ'' وہ ہر روز ناشتے میں ایک بریگیڈیئر یا لفٹینٹ کرنل کھا جاتے ہیں'' (صفحہ ۲۲۱) جنرل موسیٰ کمانڈر انچیف تھے تو

ان کے ایس ایس گروپ میں آئے دیکھا کہ ایک جوان کچھ پکار رہا ہے۔ پوچھا کیا پکار رہے ہو؟ اس نے کہا سر مینڈک پکار رہا ہوں۔ موسیٰ نے کہا پکا ہی رہے ہو یا کھاؤ گے بھی؟۔۔۔جوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ راشن ٹین سے دو مینڈک اٹھا کر منہ میں ڈالے اور چبا چبا کر کھانے لگا پھر اگلے ہی لمحے اس نے تیسرا مینڈک جنرل موسیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا'' سر بسم اللہ!'' موسیٰ کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے بغیر حیل و حجت مینڈک منہ میں ڈال لیا اب خدا جانے اسے چبا کر کھایا یا ثابت ہی نگل لیا میں نے بھی یہ پوچھنا خلاف تہذیب سمجھا کہ سر کیا ذائقہ تھا اس کا؟'' (صفحہ۳۶۱)۔ اس سے موسیٰ کے حوصلہ کے علاوہ یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ ایس ایس جی کے لوگوں کو کس قسم کی اور کیسی صبر آزما اور سخت ٹریننگ دی جاتی تھی۔

ضیاء الحق کا ذکر۔'' ہر سوموار کو جی ایچ کیو میں چیف کی زیر صدارت پی ایس اوز کی ایک ہفتہ واری کانفرنس ہوا کرتی تھی۔ ایسی ہی ایک کانفرنس میں ایک روز جنرل یحیٰی نے ایک سگنل فائل سے نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ سگنل میجر جنرل نوازش نے جوارڈن میں پاکستانی ملٹری مشن کے سربراہ تھے بھیجا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ جی ایچ کیو کے احکام کی خلاف ورزی کرنے پر بریگیڈئیر ضیاء الحق کا کورٹ مارشل کیا جائے۔ ہمارے اس مشن کا کام تو یہ تھا کہ اردنی فوج کو ٹریننگ دی جائے اور اس کے علاوہ کوئی اور کام نہ کیا جائے۔ تمام افسروں کو اس بات کی خبر تھی۔ لیکن نوازش کے مطابق ضیاء نے اس حکم کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے اردنی فوج کے آرمرڈ ڈویژن کی میدان جنگ میں (فلسطینی مہاجرین کے خلاف) کمانڈ کی تھی اس آپریشن میں ہزاروں فلسطینی ہلاک ہو گئے تھے'' ۔۔۔'' میں یہ پڑھ کر سخت حیران ہوا ہوں کہ یحیٰی نے ضیاء کو کیسے چھوڑ دیا کیونکہ یحیٰی نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ ضیاء کو ضرور سزا دی جائے گی'' (صفحہ ۵۵۳۔۵۵۴)۔

بھٹو'' معاملات میں بڑا نادان شخص بھی تو تھا'' (صفحہ۵۶۹) پھر لکھا ہے'' بھٹو پرلے درجے کا فاشسٹ تھا'' (صفحہ۶۴۷) بھٹو کے ساتھ ہی سندھی وڈیروں کا ذکر خیر۔ سندھی فوج میں اس لئے نہیں آتے تھے کہ انہیں خوف تھا'' کہ وہ گھر پر نہیں ہوں گے تو وڈیرے ان کی عورتوں بیٹیوں سے زیادتی کریں گے'' (صفحہ۴۱۱) اور وڈیروں کی اس عادت کا مظاہرہ بھٹو نے اپنے دور اقتدار میں کر کے دکھایا۔

عام عوام میں سے ڈاکٹر کنیز یوسف کا ذکر کہ انہیں پی ایم اے میں ملٹری جغرافیہ پڑھانے کے لئے کسی اچھے ماہر کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے امریکہ والوں سے استفسار کیا جواب آیا'' آج ساری دنیا میں سب سے بہترین جغرافیہ دان ایک خاتون ہے جس کے علم و فضل کے اعتراف میں دنیا کے تمام ماہرین جغرافیہ یک زبان ہیں ان کا نام ڈاکٹر کنیز یوسف ہے وہ پاکستانی ہیں آپ ان سے رابطہ کریں۔'' (صفحہ۶۴۹)

اختر حمید خاں آئی سی ایس افسر تھے۔'' ملازمت کو تج کر عوام کی فلاح کے کام کرنے لگے۔۔۔ان کی اہلیہ جو علامہ مشرقی کی صاحبزادی تھیں ان سے سخت نالاں تھیں۔۔۔ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مذہب سے بھی انہیں لگاؤ تھا۔۔۔قرآن حکیم کا مطالعہ انہوں نے عربی زبان میں کیا تھا۔ اس قسم کے انسان کو توہین رسالت کا مرتکب قرار دینا (جیسا کہ حال ہی میں ان پر الزام لگایا گیا ہے) پرلے درجے کی حماقت کے سوا کچھ نہیں۔'' (صفحہ۴۲۸)

اس خودنوشت کی دلچسپی مصنف کی دیانت و امانت کے مظاہرہ پر منحصر ہے۔ ورنہ واقعات تو سارے فوجی افسروں کی زندگی کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

ایک آدھ جگہ ہلکے سے مزاح کا چھینٹا بھی ہے۔ ایک انگریز افسر کا نام تھا Tex Little مگر اس کا قد بت چھ فٹ کا تھا (صفحہ۳۶۶) مگر نام کے حوالہ سے مختار مسعود نے ''لوحِ ایام'' میں جو بات لکھی ہے وہ منفرد ہے کہ ایران میں امریکہ کے سفیر کا اسم گرامی تھا مسٹر وہائٹ مگر وہ سیاہ فام خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مختار مسعود نے خوب بات کہی کہ'' اس باوقار سیاہ فام شخص کو نام لے کر مخاطب کرنے والے کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کوئی سفید جھوٹ بول رہا ہو'' (لوح۔ ایام صفحہ۱۵۳)

جنرل مٹھا جیسے بہادر، حوصلہ مند، پہاڑوں جیسی قوت برداشت رکھنے والے شخص کی خودنوشت اتنی دلچسپ ہے کہ قاری خود کو ان کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور یہی ایک خودنوشت کی بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اردو کی بہت کم خودنوشتیں اپنے مواد اور انداز بیان کی وجہ سے اس خودنوشت کا مقابلہ کر سکیں گی۔

❁

لمحوں کا سفر

ابھی پچھلے دنوں مُلّا واحدی کی خودنوشت کا تجزیہ میں نے لکھا تھا اس میں میں نے ملا واحدی کے اس ارشاد کا حوالہ دیا تھا کہ ہر آدمی خودنوشت لکھ سکتا ہے کیونکہ ہر آدمی کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہوتی ہے جو دوسروں کے لئے سبق آموز اور مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس بات کی صداقت میں کوئی کلام نہیں مگر خودنوشت سوانح حیات لکھنا محض قلم پکڑ کر اپنے حالات لکھ دینے کا نام نہیں۔ خودنوشت کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے صرف وہ حالات لکھے جائیں جو اہم ہوں اور دوسروں کے لئے دلچسپی کا موجب بھی ہوں۔ اتفاق یوں ہے کہ ان دنوں مجھے ایک ایسی خودنوشت کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہے جو ایک عام آدمی کی عام سے انداز میں لکھی ہوئی خودنوشت ہے ایسی خودنوشت جس کا لکھنے والا ایک نہایت غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا والد ریلوے میں درجہ چہارم کا ملازم رہا۔ ایک کمرہ کے کوارٹر میں زندگی بسر ہوئی بچپن غربت اور محنت مزدوری کرتے گزرا مگر اس نے حوصلہ مندی کے ساتھ تمام تر نامساعدت کے باوجود زندگی میں ترقی کرنے کے مقصد کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ تعلیم کا سلسلہ بھی اونچ نیچ کے ساتھ جاری رہا۔ عیال داری کا بوجھ بھی کندھوں پر رہا۔ بھائیوں سے برادران یوسف جیسے سلوک کا مورد بھی رہا مگر ثابت قدمی کے ساتھ دیانت داری اور محنت کا دامن تھامے رکھا اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک صحافی قلم کار کالم نگار اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور اچھا لکھنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ میں جناب محمد اسلم لودھی صاحب کا ذکر کر رہا ہوں۔

''لمحوں کا سفر'' ان کی خودنوشت کا عنوان ہے۔ جو جولائی ۲۰۰۹ میں سدرہ ایمپوریم پبلشرز اردو

بازار لاہور والوں کی جانب سے چھپی ہے۔ اس سال ان کی کتاب محبت کے عنوان سے چھپی ہے اسے بھی وہ اپنی خودنوشت کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ لمحوں کا سفر تو واقعی ان کی داستانِ حیات ہے مگر اس عیب سے مملو ہے جسے یادوں کی مکمل بازگشت کہا جاتا ہے۔ آپ نے بچپن سے لے کر اپنی اب تک کی زندگی کے تمام واقعات کو تمام تر جزئیات و تفصیل سے بیان کر ڈالا ہے۔ سکول اور سکول کی شرارتیں دوست اور دوستوں کی کھلنڈرے پن کی حرکتیں۔ ماں باپ کے کردار کی خوبیاں اور زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں غرض زندگی کی کوئی تفصیل ان کے قلم کی زد میں آئے بغیر نہیں رہی۔ اور یہی وہ عیب جس سے خودنوشت نگاروں کو بچنے کا کہا جاتا ہے۔ اس میں ان کا قصور بھی نہیں۔ کتاب پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو کوئی مناسب استاد میسر نہیں آیا جو ان کی انگلی پکڑ کر انہیں لکھنے کی راہ پر لگاتا یا انہوں نے ڈھنگ کی کوئی خودنوشت ہی پڑھی ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ خودنوشت غیر ضروری باتوں کا پلندہ بن گئی ہے جنہیں اگر کتاب میں درج نہ بھی کیا جاتا تو کتاب کی افادیت میں کوئی فرق نہ آتا۔ بعض غلطیاں تو ایسی آ گئی ہیں جنہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف دیندار تو ضرور ہے مگر دین کا علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ قرآن کی آیت انا للله وانا الیه راجعون کو لکھنے والا اگر انا کو الف کی زبر کے ساتھ لکھے اور الیہ کو علیہ لکھے تو اس کا وبال کس کی گردن پر ہوگا؟ (لمحوں کا سفر صفحہ ۴۸) لودھی صاحب نے کیا ہی اچھا کیا کہ دوسری بار یہی آیہ کریمہ لکھنے کا موقعہ آیا تو اس کا ترجمہ لکھ دیا (صفحہ ۱۰۰)

ان کی یہ دونوں کتابیں جنہیں یہ خودنوشت کہتے ہیں غیر ضروری تفصیلات کی وجہ سے خودنوشت کے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ ابتدا میں اپنی والدہ محترمہ کی زندگی کے حالات ہیں جو ان کے دیکھے ہوئے نہیں سنے ہوئے ہیں۔ والد صاحب کے حالات کا بھی یہی عالم ہے ان کی تفصیلات آپ یوں بیان کر رہے ہیں گویا سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ نانا اور دادا کے حالات بھی اسی زمرہ میں ہیں۔ خودنوشت ان حالات کی متقاضی ہوتی جو آپ کے آنکھوں دیکھے ہوں یا آپ کی ذات پر بیتے ہوں۔ پھر آپ نے یہ ستم بھی کیا ہے کہ کئی کئی صفحات کے خودنوشت کے لحاظ سے غیر ضروری مضامین خودنوشت میں درج کر دیے ہیں۔ شہادت کی آرزو ایک علیحدہ مضمون تھا جس کا اس خود

نوشت سے کوئی تعلق نہیں بنتا (۲۷۱-۲۷۷)۔ حد یہ کی ہے کہ اگر کوئی تفصیل بعد کو یاد آئی ہے تو چھوٹی چھوٹی مزے دار باتیں (صفحہ ۲۲۲) کے عنوان سے انہیں بھی کتاب کا حصہ بنا دیا ہے۔ غرض انہیں پڑھنے سے زیادہ لکھنے کا شوق ہے۔ دوسری کتاب محبت کے باب میں تو خود ان کا قول ہے کہ ''چاہتوں میں ڈوبی ہوئی انمول کہانیوں کا مجموعہ'' مگر کتاب کے آخر میں اپنے بھائیوں کے برادران یوسف بن جانے کا تفصیلی تذکرہ کر دیا ہے۔ اے کاش محمد اسلم لودھی صاحب پڑھنے کی طرف زیادہ توجہ رکھتے اور خودنوشت لکھنے سے قبل کچھ خودنوشتیں ضرور پڑھ لیتے تو ان کی خودنوشت میں یہ چیزیں راہ نہ پاتیں۔

ہمیں تو اس کتاب میں اپنے ہمعصر دوست ڈاکٹر محمد عارف مرحوم و مغفور کا ذکر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لودھی صاحب نے جو ان کے ماتحت تھے انہیں ''فرشتہ صفت انسان'' لکھا ہے۔ (صفحہ ۱۶۷) پھر بارِ دگر کتاب کے صفحہ ۳۱۳ پر ان کا ذکرِ خیر کیا ہے۔ عارف مرحوم تھا ہی ایسا کہ اس کو ایسے عزت و احترام کے القابات سے یاد کیا جائے۔ ہمارے ساتھ تو اس کی وفات کے بعد اس کی آل اولاد کا بھی کوئی رابطہ نہیں رہا مگر وہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہر دل میں زندہ ہے۔ اس کے بارہ میں میرا ایک مضمون کئی برس پہلے ''علامت'' میں چھپا تو سینئر سول سرونٹ شیخ منظور الٰہی نے مجھے لکھا کہ ڈاکٹر محمد عارف کا ذکر خیر کر کے تم نے اس فرشتہ صفت افسر کی یاد دلا دی ہے جس جیسے ہماری سول سروس میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ اللہ تعالیٰ لودھی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے ایک نابغہء روزگار دوست کی یاد تازہ کر دی۔

ہمارے ایک اور ہم عصر کا ذکر بھی ہے انیس ناگی کا۔ اگر ان کے باب میں اتنی تلخی کا اظہار نہ کیا جاتا تو مناسب تھا کیونکہ اپنی محرومیوں یا دوسروں کی زیادتیوں کا نوحہ کرنا خودنوشت کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ بھائیوں کی برادران یوسف والی حرکتوں کا تذکرہ اسی ضمن میں ہے کہ نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔

خودنوشت میں خیالی مکالموں کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ روسی سفیر اور پاکستان کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرنے والے ''مجاہد'' ضیاء الحق کا مکالمہ یوں درج کیا گیا ہے جیسے صاحب کتاب اس مجلس میں موجود تھے (صفحہ ۳۲۳)۔ پھر آپ نے ۱۹۶۵ کی جنگ کے بیان میں بھارتی پائلٹوں کا ایک

فرضی بیان کتاب میں شامل کر دیا ہے جو ہمارے خوش فہم اور سادہ دل لوگوں نے اختراع کر رکھا تھا (صفحہ ۱۰۵) پھر آپ نے جنرل اعظم خاں کے بارہ میں لکھا ہے کہ ''جنرل اعظم نے ۱۹۵۸ میں قادیانیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت کے دوران مارشل لاء لگایا تھا اور ایمان کی روشنی سے منور سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا تھا'' (صفحہ ۱۲۵) اول تو یہ واقعہ ۱۹۵۳ کا ہے۔ دوم کہ یہ تحریک منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق کوئی دینی تحریک نہیں تھی محض فتنہ و فساد کر کے حکومت وقت کو گرانے کی ایک سیاسی سازش تھی۔ لودھی صاحب کی ایسی باتیں ان کے عدم مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں۔ سنی سنائی باتیں خودنوشتوں میں نہیں لکھی جاتیں۔

غرض یہ خودنوشت جسے میں نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا تھا کہ دیکھیں ایک عام آدمی عام انداز میں خودنوشت لکھے تو اس کا سلوب کیسا ہوتا ہے میرے لئے کوئی حوصلہ افزا تجربہ ثابت نہیں ہؤا۔

داستانِ وفا

جناب ڈاکٹر عبدالستار خاں وفا کلکتوی راشدی کی خودنوشت ''داستانِ وفا'' مکتبہ اشاعت اردو شاہ فیصل ٹاؤن کراچی کی جانب سے ۱۹۹۷ میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر وفا راشدی کلکتہ میں پیدا ہوئے علامہ وحشت کلکتوی سے قریبی تعلق رہا۔ سکول میں صاحب ذوق اساتذہ کی رہنمائی میسر رہی جس کی وجہ سے سکول کے زمانہ میں ہی مضمون نگاری شروع کردی۔ پہلا مضمون علامہ وحشت کلکتوی ہی کے باب میں تھا۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی کلکتہ کے اکابر اردو سے تعارف حاصل ہوتا گیا۔ پہلی کتاب بھی آپ نے گھر کے نامساعد حالات کے باوجود کلکتہ ہی سے شائع کی۔ تقسیم ملک کے بعد ڈھاکہ ہجرت کی۔ مادری زبان بنگلہ تھی مگر اردو کے ساتھ والہانہ لگاؤ رہا۔ ''اردو سے میرا تعلق'' (صفحہ ۱۶۸۔۱۶۹) کے عنوان سے باقاعدہ اپنی اردو سے وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ اپنے استاد رضا مظہری، برادر، علامہ جمیل مظہری کی نصیحت کا ذکر بھی کیا ہے کہ ''لغت دیکھنا قواعد زبان وزبان دانی اور محاورات کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ (کرنا) بھی بہت ضروری ہے'' (صفحہ ۵۳) آپ نے استاد کی نصیحت کو پلے باندھ لیا اور عمر بھر اس پر عمل پیرا رہے۔ حتیٰ کہ لڑائی بھڑائی میں ان کے دو دانت ٹوٹ گئے تو محاورہ کا دامن نہیں چھوڑا یہی لکھا کہ ''میرے دو دانت شہید ہوگئے'' (صفحہ ۹۲)

اس خودنوشت کے پہلے پچاس صفحات میں مصنف موجود نہیں صرف لوگوں کے خطوط اور آراء ہیں جو انہیں ان کی تصانیف پر موصول ہوتی رہیں۔ یہی حال کتاب کے اواخر کا ہے صفحہ ۲۲۳ سے لے کر ۲۷۰ تک سید معراج جامی اور دوسرے احباب کے مرتب کردہ خطوط درج ہیں یا دوسروں کے ارشادات۔ اور یہ بات خودنوشت کے اصول کے لحاظ سے بےحد ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے۔

اس خودنوشت کی سب سے زیادہ قابل قدر بات کلکتہ کے ماحول کی عکاسی ہے۔ علامہ وحشت کلکتوی کے علاوہ مولانا آزاد اور آرزو لکھنوی کا تذکرہ ہے۔ ٹیگور کی گیتا نجلی کی تفصیلات اور نذر الاسلام کا ذکر ہے۔ ہمیں تو یہ بات ان سے معلوم ہوئی کہ ٹیگور کی گیتا نجلی کا انگریزی ترجمہ میکملن کمپنی نے ۱۹۱۲ میں چھاپا تھا اور Yeats نے اس پر زوردار مقدمہ لکھا تھا ۱۹۱۳ میں اس کتاب پر ٹیگور کو نوبل پرائز ملا (صفحہ ۷۹)۔ نذر الاسلام کا ذکر بھی پہلی بار ہم نے پڑھا ہے کہ نذر الاسلام نے ایک انٹر ویو میں کہا ''میں نے میر کو سمجھنے کے لئے اردو زبان اور حافظ کو سمجھنے کے لئے فارسی زبان سیکھی'' (صفحہ ۸۳) اسی جگہ یہ بھی ذکر ہے کہ علامہ وحشت نے فرمایا ''میں نذرل سے یہ نہ کہہ سکا کہ میں نے انہیں پڑھنے کے لئے بنگلا سیکھی''۔

وفا راشدی ڈھاکہ سے ہجرت کر کے مغربی پاکستان آگئے اور کچھ عرصہ لاہور اور پھر کوٹری میں مقیم رہے۔ سندھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ان پر مہربان رہے اور دوسرے اہل علم کے ساتھ ان کی کتاب بنگال میں اردو کی بہت قدردانی کی۔ انہیں ''اردو کی ترقی میں اولیائے سندھ کا حصہ'' کے عنوان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی اجازت دی اور جب ان کا مقالہ منظور ہوگیا تو زبانی امتحان کے لئے حاضر ہوئے۔ وائیوا لئے بغیر ہی ڈاکٹر صاحب نے باقی ممتحنین کی آراء ان کے سامنے کردیں اور فرمایا مبارک ہو'' آپ کا نکاح ہوگیا'' (صفحہ ۱۵۵)

ڈاکٹر وفا راشدی اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد انجمن ترقی اردو میں اختر حسین اور نور الحسن جعفری کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ترقی اردو بورڈ کی ایک میٹنگ کا حال ہمیں بہت خوش آیا ہے اس میں اپنے قارئین کو شریک کرتے ہیں۔

''ممتاز حسن صاحب شان الحق حقی کی گاڑی میں ترقی اردو بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کے لئے پہنچے۔ بورڈ کے دفتر کی کھڑکیاں بند تھیں جس میں اجلاس کا انعقاد ہونا تھا۔ ممتاز صاحب نے چپراسی سے شریفانہ لہجہ میں کہا کھڑکیاں کھولو۔ چپراسی سے پہلے ہی ممتاز صاحب نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک کر کے تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ پھر میز کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگے'' یہ میز کرسیاں بھی صاف نہیں کیں'' انتظار کئے بغیر ممتاز صاحب خود ہی میز صاف کرنے لگے۔ میں نیشنل بنک آف

پاکستان کے مینیجنگ ڈائریکٹر، ترقی اردو بورڈ کے صدر نشین، وفاقی حکومت کے ریٹائرڈ فنانس سکرٹری
پاکستانی نوٹ پر جن کے دستخط ہوا کرتے تھے کی یہ سادگی اور شرافت دیکھ کر حیران رہ گیا'' (صفحہ ۱۸۳)

کیا خوب بات انیس نے کہی ہے رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے۔ وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے۔ ہم
نے بھی ایک ریٹائرڈ فنانس سکرٹری اور وزیر خزانہ ایم ایم احمد کی فروتنی کا ایک ایسا ہی مظاہرہ دیکھا ہوا
ہے جس کے بیان کا یہ محل نہیں۔

ڈاکٹر وفا راشدی صاحب کی یہ خودنوشت خودنوشت کے فنی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی بایں ہمہ
بنگال اور بنگال کے ادبی زعماء کے حوالہ سے بعض ایسی باتیں بیان کرتی ہے جو ہم جیسوں کے لئے نئی
اور معلومات افزا ہیں اور اسی وجہ سے علمی حلقوں میں پڑھی جائے گی اور قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے
گی۔

کچھ یادیں

شیخ انعام منظور صاحب کی خودنوشت '' کچھ یادیں'' کے عنوان سے اکتوبر ۲۰۱۰ میں پنجند
اکیڈمی مچھلی مارکیٹ اردو بازار لاہور سے شائع ہوئی ہے اور راولپنڈی سے میرے غائبانہ مہربان ڈاکٹر
بلال سہیل صاحب نے بصرفِ کثیر مجھے بھیجی ہے۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

ایس انعام منظور صاحب بینکر ہیں اور راولپنڈی کے یو بی ایل کے جنرل مینیجر کی حیثیت سے
ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے یو بی ایل نے آغا حسن عابدی اور مشتاق احمد یوسفی کے بعد اہل ادب
پیدا کرنے بند کر دیئے ہیں مگر ایس انعام منظور صاحب نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے تو ہم انہیں
خوش آمدید کہتے ہیں۔

یہ خودنوشت واقعاتی اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ ہمارے ہاں واقعاتی اسلوب کی نمایاں خودنوشتیں
دیوان سنگھ مفتون کی '' ناقابل فراموش'' اور میر محمد اسمٰعیل دہلوی کی '' آپ بیتی'' ہیں جنہیں ان کے
رواں دواں بیانیہ اسلوب نے اپنے زمانہ میں بہت مقبولیت بخشی۔ ایس انعام منظور صاحب نے بھی
احوال بیان کے لئے واقعاتی اسلوب چنا ہے۔ واقعاتی اسلوب کی کامیابی کا معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ
پڑھنے والا لکھنے والے کے بیان کردہ کسی واقعہ پر بے یقینی یا بے اعتباری کا مرتکب نہ ہو۔ اس لئے
واقعاتی اسلوب اپنانے والے پر بہت ذمہ داری آجاتی ہے۔ یہ کتاب الا ماشاء اللہ قاری کے اعتبار کو
ٹھیس نہیں پہنچاتی البتہ بعض مقامات پر مصنف نے اپنی لاعلمی یا مناسب معلومات مہیا نہ ہونے کی وجہ
سے ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو حقیقت سے بعید ہیں۔ مگر چار سو آٹھ صفحات کی اس خودنوشت میں ایسے
مقامات ایک یا دو ہیں۔ سب سے پہلی لغزش تو ان سے پشاور کے قیام کے بیان میں ہوئی۔ آپ کے

والدگرامی ریڈیو پاکستان پشاور سے پشتو میں پروگرام نشر کر کے لوگوں کو نیوی میں بھرتی ہونے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اس ناتے سے انعام صاحب کو بھی ریڈیو میں بچوں کے پروگرام میں شرکت کی اجازت ملتی رہی اور ان کے گھر کی خواتین بھی ریڈیو پر پروگرام کرتی رہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ''پشاور کے سٹیشن ڈائریکٹر زیڈ اے بخاری تھے'' (کچھ یادیں صفحہ ۲۰) ان کو کم عمری کی رعایت دیتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ''۱۹۴۵ میں پشاور ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر سجاد سرور نیازی تھے'' (ناممکن کی جستجو حمید نسیم صفحہ ۲۰۹) زیڈ اے بخاری پشاور کے رہنے والے ضرور تھے مگر کسی زمانہ میں پشاور ریڈیو سٹیشن کے ساتھ وابستہ نہیں رہے۔ پھر ان کی بچپن کی یادداشت انہیں بتاتی ہے کہ آپ نے ریڈیو میں ''اختری بائی فیض آبادی جو بعد میں بیگم اختر کے نام سے جانی جاتی تھیں دلاری بائی جی اے خاں گوالیاری فتح علی خاں (نصرت فتح علی خاں کے والد) مبارک علی خاں قوال۔ عظیم پریم راگی، کجن بیگم۔ (مہناز بیگم کی والدہ) زاہدہ پروین سرندر کور علی بخش ظہور ملکہ پکھراج'' کو سامنے بیٹھ کر سنا'' (صفحہ ۲۱) حمید نسیم کہتے ہیں ۱۹۴۵۔۱۹۴۶ کے دوران ان تمام فنکاروں میں سے صرف ملکہ پکھراج پشاور تشریف لائیں باقی جتنے نام انعام صاحب نے اپنی کم سنی کی یادداشت کے بوتے پر گنوادئے ہیں انہوں نے ریڈیو پشاور کو اپنی تشریف آوری سے نہیں نوازا حمید نسیم نے تو باقاعدہ فہرست درج کی ہے جس کو دوبارہ درج کرنے کا کوئی محل نہیں (ناممکن کی جستجو صفحہ ۲۳۰)۔ میں تو ایسی باتوں سے یہ نتیجہ نکالا کرتا ہوں کہ بچپن کی باتوں کو بیجا وثوق سے بیان کرنے والے بڑی عمر میں بھی واقعات اختراع کر لیتے ہیں جیسے جوش صاحب نے یادوں کی بارات میں کیا ہے یا جیسے انعام صاحب نے ایک دو اور مقامات پر بھی کیا ہے۔

چوہدری معین صاحب کے ذکر خیر میں آپ نے لکھا ہے کہ چوہدری صاحب کے ''والد غیر منقسم ہندوستان میں ایس پی investigation تھے ان کی شہرت کا چرچا جب مرزا غلام احمد جو احمدی فرقہ کے سربراہ تھے نے سنا تو انہوں نے کسی نہ کسی طریقہ سے چوہدری صاحب تک رسائی حاصل کر لی اور ان سے ملنے کی خواہش کی'' (صفحہ ۱۷۹) آگے جو الزام آپ نے لگایا ہے وہ کوئی نیک اور شریف آدمی کسی پر نہیں لگاتا کیا ایس انعام منظور صاحب جو شریف الطبع آدمی ہیں'' اور مذہب کو سمجھنے والے مسلمان ہیں'' (صفحہ ۲۱۱) پسند فرمائیں گے کہ میں ان کی لکھی ہوئی بات ان کے یا ان کے خاندان کے

کسی فرد کے بارہ میں لکھ دوں؟ الزام تراشی تو ایک طرف انعام صاحب کو تو اتنا بھی علم نہیں کہ مرزا غلام احمد صاحب ۱۹۰۸ میں انتقال فرما گئے تھے۔ کیا معین صاحب کے والد محترم ۱۹۰۸ سے قبل ایس پی تھے؟ ایسا شخص جسے اللہ تعالٰی نے حج اور عمرہ کی توفیق ارزانی فرمائی ہو اور جسے دستِ شفا سے نوازا ہو (صفحہ ۳۸۳) ایسی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ ان کی تو پکی عمر کی معلومات بھی کچی ہیں۔ کینیڈا کے سفر پر آئے ہیں تو لکھا ہے کہ آپ نے ''مونٹریال میں سی این ٹاور دیکھا۔'' (صفحہ ۳۲۱)۔ بھائی میرے سی این ٹاور مونٹریال میں نہیں ٹورنٹو میں ہے۔

بایں ہمہ کتاب دلچسپ ہے اور ہمارے لئے اس لئے بھی دلچسپی کا موجب ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد گوجر خان تحصیل کے رہنے والے تھے اور راجہ سجاول خان جس کا ذکر انعام صاحب نے کیا ہے ہمارا جانا پہچانا دیکھا ہوا کردار ہے۔ تقسیم ہند کے بعد ہم لوگ اپنے گاؤں چنگا بنگیال میں جا بسے تھے وہاں سے قاضیاں کے قصبہ تک مڈل سکول میں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ راجہ سجاول کی ڈھوک ہمارے رستہ میں پڑتی تھی راجہ صاحب کا حکم تھا کہ جس بچے کو بھوک لگے یا پیاس لگے وہ بے دھڑک روٹی یا لسی طلب کر لیا کرے مگر ہم لوگ گھر سے پوٹلی میں اپنا دوپہر کا کھانا باندھ کر سکول جاتے تھے۔ البتہ کھیتوں سے سرسوں کی ہری کونپلیں توڑنے کے لئے یا ہرے چنے یعنی بونٹ جسے اصطلاح میں چھولیا کہتے ہیں لینے کے لئے اجازت لینا ضروری تھی اور ہمیشہ مل جاتی تھی۔ راجہ صاحب اپنی چارپائی پر بیٹھے یا لیٹے رہتے اور بچوں کو سکول جاتا دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ہم نے انہیں ایک بار مدتوں بعد راولپنڈی میں اس وقت دیکھا تھا جب وہ ہمارے گاؤں کی یونین کونسل کے چیئرمین تھے۔

پھر بیول کا قصبہ تو ہمارے گاؤں سے محض ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ ہماری دادی اماں اسی قصبہ کی تھیں۔ اس قصبہ کی مردم خیزی کا اب ایک زمانہ معترف ہے کہ برطانیہ کی قدامت پسند پارٹی کی صدر اسی قصبہ بیول کی رہنے والی ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے ''ان کی دعوت پر جو آٹھ جانیں آملیٹ بنانے پر ضائع کر دیں'' (صفحہ ۱۳۶) اس کا پڑھ کر بہت لطف آیا۔ پولیس والے کھانا جانتے ہیں کھلانا ان کے ضابطہ اخلاق کا حصہ نہیں۔

فوجیوں کی باتیں بھی خوب ہیں۔ ایک بار یہ لوگ کار کا حادثہ کر بیٹھے جنرل موسیٰ جو ڈپٹی چیف

آف سٹاف تھے گذرتے ہوئے رک گئے اور دریافت کیا کہ کسی مدد کی ضرورت تو نہیں؟ (صفحہ ۸۶)
انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی کے والد ان کے نانا کے شاگرد تھے۔ان کے نانا جنرل گریسی سے
ملنے گئے تو جنرل صاحب خود اٹھ کر آئے اور انہیں اپنے دفتر میں لے گئے (صفحہ ۵۳)۔مگر ہمیں تو اس
کتاب میں سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ نظر آئی کہ جنرل ضیاء الحق کو ریوڑیاں بہت پسند تھیں (صفحہ
۲۸۷) اور چین سے ان کے لئے خاص طور سے آتی تھیں۔ہمیں جنرل عارف کی یہ بات اب سمجھ میں
آئی ہے کہ جنرل ضیاء الحق ذاتی اور قومی اخراجات میں کیوں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے اور سارے
بیت المال کو اپنا ذاتی اثاثہ سمجھتے تھے۔ایس انعام منظور صاحب نے اس عقدہ کو حل کر دیا ہے ''اندھا
بانٹے ریوڑیاں ہر پھر اپنوں کو!''۔

بہر طور ایس انعام منظور کی یہ خودنوشت دلچسپی سے پڑھی جائے گی مگر جو بھی ان کے اندر چھپے
ہوئے آدمی سے روشناس ہوگا وہ حیرت سے ضرور پوچھے گا کہ اتنا شریف آدمی دوسروں پر بیہودہ
الزام لگانے میں اتنا دلیر بھی ہو سکتا ہے؟

میں ہوں شکست کی آواز

میرے عزیز دوست پروفیسر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے پچھلے برس ایک دوست کے ہاتھ اپنے
ساتھی اور رفیق کار پروفیسر صدیق مرزا کی خودنوشت ''میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' مجھے ارسال
فرمائی۔یہ خودنوشت بیت الحکمت لاہور والوں نے ۲۰۰۸ میں شائع کی اور کتاب سرائے اردو بازار
لاہور سے دستیاب ہے۔کتاب کے تعارف کے طور پر ڈاکٹر شیرانی نے ''صداقت کی شہادت'' کے
عنوان سے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔اور کیا خوب بات کہی ہے کہ ''آپ بیتی لکھنے کے لئے لازمی شرط ہی
یہ ہے کہ اس کی بنیاد صداقت شعاری اور صاف گوئی پر استوار ہو بصورت دیگر وہ آپ بیتی نہیں رہتی
بلکہ دعوائے استقرارِ حق کی عدالتی کارروائی بن کر رہ جاتی ہے''۔صدیق مرزا صاحب کی خودنوشت کا
مطالعہ کرنے کے بعد میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مصنف نے صاف گوئی اور حق گوئی سے کام لیا
ہے اور سب کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا ہے۔

صدیق مرزا صاحب خودساز شخصیت ہیں آپ نے حصول تعلیم کے مراحل تنگی ترشی کے ماحول
میں رہ کر طے کئے اور ماں باپ کی تنگ دستی کو اس راستہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔پھر ملازمت کے
سلسلہ میں بھی ان کا سفر دور دراز کے سکولوں سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتے ہوئے آپ کالج
کے لیکچرار بنے اور پھر پرنسپل بن کر وظیفہ یاب ہوئے۔اولاد بھی ماشاء اللہ خدمت گذار اور صاحب
روزگار ہے زندگی میں کوئی کمی نہیں اس لئے جب میں نے ان کی خودنوشت کا قنوطیت سے لبریز عنوان
دیکھا تو خیال گذرا کہ شاید ان کی زندگی میں خدانخواستہ ناکامیوں کا تناسب زیادہ رہا ہوگا مگر الحمدللہ

ایسی کوئی بات نہیں۔ مرزا صاحب نے محض اپنی کسر نفسی کے اظہار کے لئے یہ چونکا دینے والا عنوان چن لیا ہے۔

قبلہ صدیق مرزا نے سکول کے استاد کی حیثیت سے اپنی ملازمت شروع کی اور وہ تمام نفسیاتی عادتیں اپنالیں جو سکول ماسٹروں سے منسوب سمجھی جاتی ہیں۔ ''ان کی سکول میں موجودگی میں بعض شر پسند لڑکوں نے ہیڈ ماسٹر کی پٹائی کر دی'' (میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔ صفحہ ۴۴) اور آپ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بلکہ تحقیقات ہوئی تو جرم ثابت ہو جانے پر ان کا بہ طور سزا تبادلہ کر دیا گیا تو صرف اتنے تاسف کا اظہار فرمایا ''میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں مرزا صاحب پر تشدد کے دوران پلاٹ میں کلاس کو پڑھاتا رہا اور مرزا صاحب کی مدافعت میں آگے نہ بڑھا''

(صفحہ ۴۸) حالانکہ ایک استاد پر تشدد کوئی ایسا معمولی واقعہ نہ تھا کہ دوسرے استاد خاموش تماشائی بن کر تماشا دیکھتے رہتے۔ اس عادت کا اظہار بعد کو بھی دو چار مقامات پر ہوا ہے جہاں آپ نے اپنے بعض ناموافق رفقاء کے لئے ''خبثِ باطن'' (صفحہ ۴۷ مکرر صفحہ ۹۱) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر کے لئے انٹرویو میں پیش ہوئے تو سوال کیا گیا ''فیض اور احمد ندیم قاسمی میں کیا نظریاتی اختلاف تھا؟'' (صفحہ ۷۳) فرماتے ہیں میں اس سوال کا جواب نہ دے سکا پھر بھی چن لیا گیا۔ ادب اردو کے جس استاد کو فیض اور قاسمی کی نظریاتی ہم آہنگی کا ہی علم نہ ہو اسے عصری ادب پڑھانے کا کیا حق ہے؟ مگر آپ اس بات پر ہی خوش ہیں کہ آپ منتخب کر لئے گئے مگر ان کی خود نوشت پڑھنے والے ضرور حیرت میں ہیں کہ آپ نے ادب میں فرسٹ کلاس کیسے لی ہو گی؟

ہمیں تو ان کی اس اسلام پسند استاد کی امتحانی نگرانی والی بات بہت اچھی لگی جسے لڑکیوں کے امتحان کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ انسپکٹر کمرہ میں گیا تو دیکھا کہ مولانا صاحب لڑکیوں کی طرف پیٹھ کئے دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھے ہیں۔ اس نے کہا مولانا یہ آپ کیسی نگرانی کر رہے ہیں؟ جواب ملا یہ ''لڑکیاں میرے لئے نامحرم ہیں میں ان کی طرف منہ کر کے کیسے بیٹھ سکتا ہوں''۔ (صفحہ ۴۶)

احوال الرجال میں مظہر محمود شیرانی تو ہمارا جانا پہچانا دوست ہے باقی یا ان کے رفقا ہیں یا پرنسپل

ایک دو ایم این اے ہیں ایک دو سول سرونٹ اور بس! کردار نگاری کی انہیں فرصت ملی نہ آپ نے کوشش کی ہے۔ ہمیں تو دو پرانے شعران کے ہاں ملے انہیں غنیمت جانتے ہیں۔ احمد مشتاق کا شعر:

رہ گیا مشتاق دل میں رنگِ یادِ رفتگاں
پھول مہنگے ہو گئے قبریں پرانی ہو گئیں

اور امین گیلانی کا شعر:

نقش ہے دل پہ مرے پون صدی کی تاریخ
پیش کرتے ہیں مجھے لوگ حوالوں کے لئے

❀

چشم دید

پاکستان کے سابق وزیراعظم جناب فیروز خاں نون کی خودنوشت ''چشم دید'' کے عنوان سے تخلیقات مزنگ روڈ لاہور والوں کی جانب سے ۲۰۰۵ میں چھپی۔ سر فیروز نے اپنی خودنوشت انگریزی میں لکھی تھی جس کا عنوان تھا .From Memory چشم دید اسی خودنوشت کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف نے تعارف میں لکھا ہے کہ'' یہ کتاب ۵۹-۱۹۵۸ کے موسم سرما میں یادداشت سے مرتب کی گئی تھی اور میں نے حال ہی میں اس پر نظر ثانی کی ہے''۔ (چشم دید۔صفحہ ۷) مگر حال ہی میں کی تشریح موجود نہیں۔ میرے پاس جو انگریزی کتاب محترمہ وقار النساء نون کے دستخطوں سے پہنچی تھی وہ میں نے کسی لائبریری کو تحفہ میں دے دی تھی اس کا سنِ اشاعت مستحضر نہیں۔ بہر حال یہ ترجمہ ایسا صاف ستھرا ترجمہ ہے کہ کہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ کتاب کا متن کسی انگریزی کتاب سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

راقم الحروف نے سر فیروز کے دوست اور دیرینہ رفیق کار سر ظفر اللہ خاں کے ایک بے تکلف دوست کی زبان سے یہ بات سنی ہوئی ہے کہ سر فیروز نے ان سے کہا کہ انہوں نے اپنی خودنوشت مرتب کی ہے چوہدری صاحب اس کا دیباچہ لکھ دیں۔ سر ظفر اللہ نے کہا کتاب کا عنوان کیا رکھا گیا ہے؟ سر فیروز نے بتایا . From Memory چوہدری صاحب نے تفنن کے طور پر کہا کہ اگر آپ کتاب کا عنوان From Failing Memory رکھ دیں تو میں دیباچہ لکھنے کو حاضر ہوں۔ اس کے بعد کا مجھے معلوم نہیں سر فیروز اور سر ظفر اللہ کے مابین کیا معاملہ ہوا۔ سر ظفر اللہ تو عالمی عدالت انصاف میں چلے گئے۔ جو کتاب چھپی اس کا دیباچہ سر ظفر اللہ کا لکھا ہوا نہیں۔ اور ''فیلنگ میموری'' کے بہت سے نمونے اس کتاب میں موجود ہیں۔ یہ مضمون ثاقب زیروی مرحوم کے ہفت روزہ رسالہ

لاہور میں چھپا تو میرے دوست ائیر مارشل ظفر احمد چوہدری نے ای میل پر پیغام بھیجا کہ'' میں نے ابھی ''لاہور'' میں فیروز خاں نون کے بارے میں آپ کا دلچسپ مضمون پڑھا ہے۔ مجھے بھی کچھ چٹکلے یاد ہیں جو شاید آپ کے علم میں نہ آئے ہوں اور ان باتوں کا ماخذ خود چوہدری صاحب ہیں جنہوں نے میری موجودگی میں یہ باتیں بیان فرمائیں۔ فیروز خاں نون کھانے پر چوہدری صاحب کے ہاں آئے تو پوچھا'' کیا آپ نے میری خودنوشت From Memory پڑھ لی ہے؟'' چوہدری صاحب نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے پوچھا'' پھر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟'' چوہدری صاحب نے کہا ''عنوان کچھ مختصر ہے'' سر فیروز نے حیرت سے کہا'' کیا مطلب؟'' چوہدری صاحب نے فرمایا میرا مطلب ہے اس کا عنوان ہونا چاہیئے تھا'' From Failing Memory '' اور یہ کہہ کر ان کی بہت سی فروگزاشتیں بیان فرمائیں۔ سر فیروز نے اپنے دوست کی باتوں کا برا نہیں مانا'' میں نے سوچا کہ Failing Memory والی اصل بات اپنے قارئین تک پہنچا دوں کیونکہ ظفر چوہدری صاحب براہ راست اس بات کے شاہد ہیں۔ دونوں باتوں کا نفس مضمون ایک ہی ہے۔

سر فیروز نے سکندر مرزا کے پولیٹیکل سروس میں ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' پٹھانوں میں لفظ پولیٹیکل چالاک کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے یعنی ایسا شخص جو شاطر ہو اور دوسروں پر اعتماد نہ کرتا ہو۔ کسی پٹھان کی توہین کے لئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہ بڑا پولیٹیکل آدمی ہے'' (صفحہ ۳۳۱) مولانا عبدالمجید سالک نے اپنی سرگزشت میں لکھا ہے کہ آپ اپنے چچا کے ہمراہ، جو پولیٹیکل ایجنٹ (جناب علی قلی خاں۔ والد محترم جناب اسلم خٹک) کے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ تھے مُلا پاوندہ سے ملنے کو گئے۔ مُلا صاحب نے فارسی میں فرمایا'' بیٹے انگریز کی نوکری نہ کرنا انگریز کافر ہیں اور جو ان کی نوکری کرتا ہے وہ بھی کافر ہے۔ پولیٹیکل منافق کو کہتے ہیں۔'' ایں کاکائے شما سر دفتر منافقان است'' یعنی تمہارے چچا منافقوں کے دفتر کے سربراہ ہیں (سرگزشت صفحہ ۳۹)۔

سر فیروز نے انتخابات کے سلسلہ میں فرمایا ہے کہ'' اگر رائے دہی کے سلسلہ میں ہمیں برقع پوش خواتین سے نجات مل جائے تو یہ بہت اچھی بات ہوگی کیونکہ برقع کی آڑ میں فریب دہی اور جعل سازی کثرت سے ہوتی ہے'' (صفحہ ۳۴۰)۔ ان کے زمانہ میں شناختی کارڈ کا سلسلہ نہیں تھا مگر اب

شناختی کارڈ بھی موجود ہیں مگر ان پر خواتین کی تصویر نہیں ہوتی۔ کیا اس کا علاج یہ نہیں کہ ملک میں تعلیمی سرگرمیوں کو بڑھایا جائے اور الیکشن کے لئے اتنی خواتین پولنگ افسر میسر آ جائیں جو کام سنبھال سکیں تو یہ سب سے بہتر علاج ہے۔ ورنہ برقع کا تعلق محض رسم و رواج سے ہے نہیں عقیدہ سے ہے اور عقائد کو معرض بحث میں لانا کسی صورت میں ممکن نہیں۔ سرفیروز کی پہلی اہلیہ محترمہ بے حد پردہ دار خاتون تھیں۔ ان کے گھر تو پردہ اٹھانے کا رواج محترمہ وقار النساء نون کے آنے کے بعد ہوا اور مجھے علم نہیں کہ ان کی اولاد جو پاکستان کے بڑے صنعتکاروں میں شمار ہوتی ہے اپنے ہاں پردہ داری کا اہتمام کرتی ہے یا نہیں؟ سرفیروز نے خود اس بات کا اعتراف فرمایا ہے کہ پاکستان میں انتخابات یوں ہوتے تھے کہ ''نئی آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے جس میں ہر صوبائی رکن کا ایک ناقابل انتقال ووٹ تھا۔ ہمیں ان ناموں کی فہرست دے دی گئی جنہیں منتخب کیا جانا مقصود تھا'' (صفحہ ۲۷۹) ایسی صورت میں عورتوں کا پردہ میں یا بے پردہ ہونا بے معنی ہو جاتا ہے۔

سرفیروز کی اس خودنوشت پر لکھا تو ہے کہ ''سابق وزیر اعظم پاکستان کی آپ بیتی'' مگر یہ سرگزشت کسی سیاست دان کی سرگزشت نہیں ایک جاگیردار وڈیرے کی سرگزشت معلوم دیتی ہے جس کے باپ دادا انگریزوں کے خیر خواہ اور وفادار رہے۔ باپ نے انگریزوں کی ملازمت کی نواب اور سر کا خطاب پایا۔ بیٹے کو انگلستان میں تعلیم دلائی اور بیٹا انگریزوں کے دور میں سیاسی طور پر بہت کامیاب رہا باپ تو کمشنر کے عہدے تک پہنچا مگر بیٹا پنجاب میں دس سال سے زیادہ عرصہ تک وزیر اور مرکز میں وائسرائے کی کونسل کا رکن رہا۔ انگلستان میں انگریزوں کے زمانہ میں ہندوستان کا ہائی کمشنر رہا۔ شہنشاہ جارج ششم کی تاج پوشی کے جشن میں انگریزی ہندوستان کی نمائندگی میں ہائی کمشنرز کے جلوس کی قیادت اپنے شاندار طرہ والی پگڑی پہن کر کی۔ ۱۹۴۶ میں وائسرائے کی کونسل سے مستعفی ہو کر پنجاب میں آ گئے تا کہ آزادی کی جدوجہد میں مسلم لیگ کا ساتھ دے سکیں۔ اس وقت پنجاب میں ان کے قریبی عزیز سر خضر حیات ٹوانہ کی یونینسٹ پارٹی کی حکومت تھی مگر یہ انہیں مسلم لیگ کا راستہ صاف کرنے پر رضامند نہ کر سکے۔ یہ سعادت ان کے رفیق کار سر ظفر اللہ کے حصہ میں آئی جو اس وقت ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے جج کے رتبہ پر فائز تھے۔

قیام پاکستان کے بعد انہیں مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ بعد کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن کر پنجاب آ گئے پھر مرکز میں وزیر خارجہ اور وزیر اعظم رہے مگر ان کی خودنوشت سے ان کے سیاسی تدبر کا کوئی واضح اور دیرپا تاثر مرتب نہیں ہوتا۔ آبادی کے ایک بڑے حصہ یعنی خواتین کے ووٹوں کے باب میں تو ذکر ہو چکا ہے دوسرے مسائل پر بھی آپ نے جو آراء بیان فرمائی ہیں وہ محل نظر ہیں اور خود اپنے دور اقتدار میں ان پر عمل نہیں کر سکے مثلاً ''مستند لوگوں کو، ائمہ مساجد مقرر کرنا چاہیئے اور انہیں سیاست میں حصہ لینا منع ہونا چاہیئے'' (صفحہ ۷۷)

پولیس کی اصلاح کے لئے ان کا کہنا ہے کہ ان کی تنخواہیں بڑھا دینی چاہئیں مگر خود ہی اس کو عملی طور پر نافذ نہ کیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ایک تجویز آپ نے یہ دی ہے کہ ''مویشی چوروں کو پھانسی دے دینی چاہیئے'' (صفحہ ۲۷۰) کیونکہ پرانے زمانے میں برطانیہ میں بھیڑیں چوری کرنے والے کو پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔

اب ان کی یادداشت کا ذکر۔ لکھتے ہیں ''جب قائداعظم کو میرے کام کے متعلق جاننے کا موقع ملا تو ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ کو ان کا انتقال ہو گیا'' (صفحہ ۲۵۱)۔ جب لندن میں ہائی کمشنر کے تقرر کے لئے ناموں کا انتخاب ہو رہا تھا تو فرمایا ''کابینہ دو ناموں پر غور کر رہی تھی۔ سر فرینک نوائیس کا اور دوسرا میرا'' (صفحہ ۱۶۰) سر فرینک نوائیس کا نام کبھی اس عہدہ کے لئے زیر بحث نہیں آیا دوسرا نام سر جوزف بھور کا تھا (تحدیث نعمت صفحہ ۳۹۵) سر فرینک نوائیس سر جوزف کے طرف دار ضرور تھے امیدوار نہیں تھے۔

پھر فرمایا ''ایڈورڈ ہشتم نے ویلز میں کان کنوں سے خطاب کرتے ہوئے سخت غلطی کی اس واقعہ کی بنا پر ان کی اپنی وزارت سے تصادم کی نوبت آئی'' (صفحہ ۳۶۱) ایک عالم جانتا ہے کہ کان کنوں سے خطاب محض ایک معمولی واقعہ تھا ایڈورڈ ہشتم کا وزارت سے تصادم اور ان کی تخت سے دستبرداری اس وجہ سے نہیں ہوئی، مسز سمپسن سے شادی پر اصرار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ بیسویں صدی کا یہ انوکھا واقعہ تھا کہ ایک بادشاہ نے جس کی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا محض اپنی محبت کی خاطر تخت کو ٹھکرا دیا کیونکہ چرچ آف انگلینڈ کا سربراہ ہونے کی وجہ سے بادشاہ ایک مطلقہ خاتون سے جس کا خاوند زندہ ہو شادی کرنے کا مجاز نہیں تھا۔

چشم دید میں بہت باتیں مزاح کے پیرائے میں بیان ہوئی ہیں مگر اکثر کا تعلق زبان زد عام لطائف سے ہے۔سرفیروز نے وہ لطیفہ بھی درج کر دیا ہے کہ ایک زمیندار نے اپنے دو بیٹوں کو قانون کی تعلیم دلوائی۔ایک موقعہ پر دوسرے زمیندار کے بیٹے نے ان کے حصہ کا پانی اپنے کھیتوں کی طرف موڑ لیا تو وہ بھاگے بھاگے اپنے ابا کے پاس گئے اور مشورہ دیا کہ اس زمیندار پر تعزیرات ہند کی فلاں فلاں دفعہ کے تحت مقدمہ درج کروا دینا چاہیے۔اس پر اس زمیندار نے دہائی دی کہ ''ہے کوئی مائی کا لال ایسا جو میرے دو گریجوایٹ بیٹے لے لے اور اپنا ایک ان پڑھ بیٹا مجھے دے دے'' (صفحہ ۶۲) حتیٰ کہ آپ نے مارک ٹوین کا مشہور عالم لطیفہ بھی پنجاب کے سیاسی بزرگوں سے منسوب کر کے لکھ مارا ہے کہ ایک سیاسی بزرگ (سر عمر حیات خاں ٹوانہ) نے دوسرے کی تقریر اٹھا کر پڑھ دی۔جب دوسرے صاحب (رائے بہادر رام سرن داس) کی باری آئی تو یہ کہہ کر سبک دوش ہو گئے کہ مجھے اپنے پیش رو مقرر سے سو فیصد اتفاق ہے۔(صفحہ ۱۰۰)

البتہ ایک لطیفہ ایسا ہے جسے ''چشم دید'' کہا جا سکتا ہے۔لارڈ ہیلی پنجاب کے گورنر تھے اور سر فیروز ان کے وزیر۔لارڈ موصوف ان کے علاقہ میں دورہ پر گئے۔لامحالہ سرفیروز کو انہیں سپاس نامہ پیش کرنا تھا۔اپنی ملازمت کے آغاز میں لارڈ ہیلی شاہ پور کے علاقہ کے سیٹلمنٹ افسر رہ چکے تھے (اسی مناسبت سے انہیں لارڈ ہیلی آف شاہپور کہا جاتا تھا)۔سرفیروز نے اپنے سپاسنامہ میں فرمایا کہ ہمارے علاقہ کے لوگوں کو یاد ہے کہ ایک نوجوان سیٹلمنٹ افسر کسی زمانہ میں یہاں متعین تھا اور اپنے افسر کی ہدایت پر ایک اتنا بھاری کلہاڑا لے کر جنگلی درخت اور جھاڑیاں کاٹنے کو نکلتا تھا جس کو دو گدھے بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔''سر ہیلی نے فوراً سرفیروز سے پوچھا ''دوسرا گدھا کون تھا؟'' سرفیروز نے برجستہ جواب دیا ''یقیناً کوئی وزیر ہو گا'' (صفحہ ۹۷)۔قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو مشترکہ گورنر جنرل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو ماؤنٹ بیٹن کے رویہ پر سرفیروز نے ''مشتعل مزاج بندر'' (صفحہ ۲۴۹) کی برمحل پھبتی کہی ہے۔

اب تواضع اور انکساری کا ایک غیر معمولی واقعہ۔اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں سرفیروز ہندوستان کے سرکاری دورہ پر گئے ''جب ہم پالم کے ہوائی اڈہ پر پہنچے تو ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔جس

سے سنجیدگی کی فضا کسی حد تک زائل ہو گئی گو میری اہلیہ کو تھوڑی سی گھبراہٹ کا سامنا کرنا پڑا۔وہ میرے پیچھے پیچھے طیارہ سے نیچے اتر رہی تھیں کہ ان کی سلیپر کی وضع کی جوتی جسے ہماری خواتین ساڑھی کے ساتھ پہنتی ہیں پھسل کر نیچے جا پڑی۔اس سے پہلے کہ وہ سیڑھی طے کر کے نیچے پہنچتیں پنڈت نہرو نے سلیپر اٹھا لی اور جب وہ نیچے اتریں تو ان کے سامنے اس طرح رکھ دی کہ پہننے میں دشواری نہ ہو۔فوٹو گرافروں نے اس سے خاصہ لطف لیا اور بہت سی تصویریں کھینچیں۔خوش اخلاقی کے اس سلوک سے نہرو کی وجاہت میں کوئی فرق نہیں آیا۔بلکہ اس میں کسی قدر اضافہ ہی ہو گیا۔تمام اخبارات نے اپنے عالی ظرف وزیراعظم کو بہت سراہا۔میری اہلیہ کے پاؤں سے جوتی نکل جانے کا یہ واقعہ مجھے اپنی زندگی کے ایک اور چھوٹے سے واقعہ کی یاد دلاتا ہے۔جس کا تعلق سر ظفر اللہ سے ہے جو میرے عمر بھر کے ساتھی ہیں انہوں نے بلا کی قوت حافظہ پائی ہے اور میری خواہش ہے کہ وہ اپنی یادداشتیں ضرور مرتب کریں (مرتب ہو کر تحدیث نعمت کے عنوان سے چھپ چکی ہیں) ایک بار میں سر ظفر اللہ کی دعوت پر مرزا صاحب سے ملاقات کے لئے ربوہ گیا۔جو احمدیہ فرقہ کا صدر مقام ہے۔کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے جوتے اتار دئے۔ملاقات کے بعد جب میں جانے کے لئے کھڑا ہوا تو مرزا صاحب سے باتیں کرتے کرتے پاؤں سے جوتے ٹٹولنے لگا۔یہ دیکھ کر سر محمد ظفر اللہ نیچے جھکے میرے جوتے اٹھائے اور قرینے سے جوڑ کر سامنے رکھ دئے۔بیشتر پاکستانیوں نے اس طرز تپاک کا خواب بھی نہیں دیکھا ہو گا وہ تو ایسی حرکت کو اپنے وقار کے منافی اور کسر شان سمجھتے ہیں۔لیکن ظفر اللہ کے وقار کو اس سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ان کی منکسر مزاجی نے میرے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اسی طرح کے حالات میں جو ہمیں پالم کے اڈا پر پیش آئے اگر کہیں میں نے مسز اندرا گاندھی کی جوتیاں اٹھائی ہوتیں اور ان کے سامنے سیدھی کر کے رکھی ہوتیں تو معلوم نہیں پاکستانی اخبارات کیا کچھ حاشیہ آرائی کرتے'' (صفحہ ۳۲۳)۔

سرفیروز خاں نون کی یہ خودنوشت اپنی سادگی ء بیان اور مخلصانہ اظہار رائے کی وجہ سے ہماری خودنوشتوں میں نمایاں رہے گی۔انہیں اپنے کسی عمل پر کوئی شرمندگی ہے نہ انہوں نے اپنی ذات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ایک بات اس خودنوشت کو دوسری تمام خودنوشتوں سے

نمایاں تر کرتی ہے کہ سر فیروز نے ساری کتاب میں کہیں ایک بار بھی اپنے والد گرامی کا نام نہیں لکھا "میرے والد صاحب" کہہ کر ان کا ذکر کیا ہے۔ صرف ایک تصویر کے نیچے ان کا اسم گرامی درج ہے کہ نواب سر محمد حیات خاں نون مصنف کے والد۔ اور بس! یہ ایک بات ہی پنجاب اور اودھ کے جاگیرداروں کی شخصیات کا فرق ظاہر کرنے کو کافی ہے۔

سر فیروز کو جب وزیر اعظم پاکستان کے عہدہ سے فارغ کر کے ملک میں پہلا مارشل لاء لگایا گیا تو صدر سکندر مرزا نے انانیت سے بھرپور ایک خط ان کے نام لکھا وہ بھی تاریخ میں درج ہونے کے قابل ہے اور یہی ایک خط اس خودنوشت کا واحد خط ہے۔ یہ خط اس بات کا ثبوت ہے کہ جو لوگ اپنے وجود کو ملک کے استحکام اور سلامتی کے لئے ناگزیر سمجھا کرتے ہیں تاریخ ان کا کیا انجام کیا کرتی ہے۔

اس خط کا متن بھی عبرت کے مقصد سے درج کر رہا ہوں۔

ایوان صدر، کراچی

۷۔اکتوبر ۱۹۵۸

مائی ڈیئر سر فیروز!

میں بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس ملک میں استحکام اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ذمہ داریاں میں خود نہ سنبھال لوں۔ اور انتظامیہ کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لوں۔ ۳۔ مارچ ۱۹۵۶ کا آئین نہ صرف یہ کہ ناقابل عمل ہے بلکہ پاکستان کی سالمیت اور اس کے استحکام کے لئے خطرناک بھی ہے۔ اگر ہم اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے تو بالآخر ہمیں پاکستان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

لہٰذا مملکت کے سربراہ کی حیثیت سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئین منسوخ کر دوں، تمام اختیارات خود سنبھال لوں، مرکزی پارلیمنٹ اور مرکزی اور صوبائی کابینہ کو توڑ دوں۔ مجھے صرف اتنا افسوس ہے کہ یہ فیصلہ کن انقلابی اقدام مجھے آپ کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں کرنا پڑا ہے۔ جس وقت آپ کو یہ خط ملے گا مارشل لاء نافذ ہو گیا ہو گا اور جنرل ایوب جنہیں میں نے مارشل لاء کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا ہے اپنے اختیارات سنبھال چکے ہوں گے۔

آپ کے لئے ذاتی طور پر میرے دل میں بڑا احترام ہے اور آپ کی ذاتی خوشی اور فلاح کے لئے جو کچھ بھی ضروری ہوا میں بے تامل کروں گا۔ آپ کا مخلص۔ سکندر مرزا" (صفحہ ۳۳۶)۔ اس خط پر کسی تبصرہ کی احتیاج نہیں۔

سفرِ حیات

جماعت احمدیہ کے نامور صحافی اور صاحب اسلوب ادیب جناب مسعود احمد خاں دہلوی کی خود نوشت ''سفرِ حیات'' اردو جرمن کلچرل سوسائٹی پی او بکس ۱۰۳۸۲۴ فرینکفرٹ جرمنی ۶۰۱۰۸ سے ۲۰۱۱ میں شائع ہوئی ہے۔ پانچ سو صفحے کی یہ خود نوشت رواں دواں اور شگفتہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ جس میں قدم قدم پر دلی کے شرفا کی زبان پر چڑھے ہوئے محاوروں کا چٹخارا پڑھنے والے کو چونکائے بغیر نہیں رہتا کہ اس اکیسویں صدی میں بھی دلی کا روزمرہ برتنے والے ادیب موجود ہیں؟ مصنف کے والد گرامی جناب محمد حسن آسان دہلوی کو تو دلی والے ان کے چٹخارے دار انداز بیان کی وجہ سے ''بلبلِ ہزار داستان محمد حسن احسان'' کہا کرتے تھے اور اس کا ذکر مصنف نے اپنے دادا اور والد کے حالات زندگی والی کتاب ''نئی زندگی'' میں کیا ہے۔ ہم نے قبلہ محمد حسن آسان کو نہایت ضعیفی کے عالم میں صرف ایک بار دیکھا تھا مگر ان کی زبان فیض ترجمان سے کچھ سننے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ البتہ اس خود نوشت کے مصنف کو جاگتی آنکھوں دیکھا اور کھلے کانوں سنا ہے اس لئے ان کی خود نوشت پڑھتے ہوئے ان کی باتیں یاد آتی جا رہی ہیں اور جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کی سچائی بھی آشکارا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

جناب مسعود احمد خاں دہلوی کی شخصیت کا خمیر دلی کی مردم خیز مٹی سے اٹھا ہے پھر آپ نے اس ماں کی گود میں پرورش پائی جو خود ادیب نہ تھیں مگر ان کی تعلیم و تربیت میں ادیبانہ رکھ رکھاؤ تھا۔ باپ دلی کے ادبی اور علمی حلقوں کے جانے پہچانے آدمی تھے، اساتذہ صاحب ذوق اور عالم اور علم کے قدردان تھے۔ دادا سلسلہ احمدیہ میں بیعت ہوئے باپ نے اپنی سب نرینہ اولاد کو پال پوس کر

گریجوایٹ بنا کر سلسلہ کے سپرد کر دیا۔ سپردم بہ تو مایہ خویش را۔ جماعت احمدیہ کی لغت میں اس عمل کو زندگی وقف کرنا کہتے ہیں۔ مسعود احمد خاں دہلوی نے ۱۹۴۰ میں دلی یونیورسٹی سے گریجوایشن کی اور ۱۹۴۷ میں انگریز کی اچھی بھلی ترقی کے امکانات رکھنے والی ملازمت کو تج کر باپ کی بات پر حرف نہیں آنے دیا اور جماعت کے مرکز قادیان آگئے اور ساری عمر جماعت کی خدمت میں گذاری۔ اللہ تعالیٰ ان کو لمبی اور صحت والی عمر دے۔ ہم نے ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کی باتیں غور سے سن سن کر زبان سیکھی ہے۔ یہ خود نوشت ہمارے ایسے اکیانوے سالہ خوش کلام اور خوش لباس دوست کی سرگزشت ہے جس کے بارہ میں دلی والوں ہی کا محاورہ ہے کہ بات کرتے میں منہ سے پھول جھڑتے ہیں اور لکھتے میں قلم سے موتی ٹپکتے ہیں۔

اس لئے ایک بزرگ دوست کی خود نوشت پر لکھتے ہوئے قلم ڈرتا ہے کہ کہیں کوئی ایسی بات نوک قلم پر نہ آجائے جو زبانِ دوستی میں روا اور زبان تنقید میں ناروا ہو۔ ہم نے زبان دوستی کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ ہماری عمروں میں بڑا تفاوت ہے مگر ہماری دوستی میں ہم عمروں کی سی بے تکلفی ہے۔ پھر ان کے سارے بیٹے عزیزم سلمان احمد خاں مرحوم سے لے کر عزیزان عرفان، عمران اور عثمان تک سب ہی ہمارے شاگرد ہیں اور جانتے ہیں کہ بات کہنے میں ہم لگی لپٹی روا رکھنے کے روادار نہیں اس لئے اپنے شاگردوں کو بھی ہم ناراض نہیں کر سکتے مگر یہ بات ہم ڈنکے کی چوٹ کہے دیتے ہیں کہ اس خود نوشت پر تنقید لکھتے ہوئے بھی ہم کسی دوستی کا لحاظ نہیں کریں گے۔

''سفرِ حیات'' ایک احمدی صحافی کی سرگزشت ہے اس لئے لامحالہ اس کی زبان جماعت احمدیہ کے علم کلام کی زبان ہے جو جماعت سے تعلق نہ رکھنے والوں کو شاید پوری طرح سمجھ میں نہ آئے کیونکہ اس میں جماعت کی تنظیموں جماعت کے اداروں جماعت کے اخباروں اور ان سب پر مستزاد جماعت کے خلفاء کے احکامات وارشادات کا تذکرہ ہے۔ مگر اس خود نوشت کی زبان ایک دلی والے کی زبان ہے جس میں دلی والوں کی چاشنی اور مٹھاس تو موجود ہے مبالغہ موجود نہیں کیونکہ انہیں جماعت احمدیہ کی صحافت سے وابستہ کرتے ہوئے جماعت احمدیہ کے امام نے انہیں متنبہ کیا تھا کہ ''زبان کے معاملے میں ہمارا خوبصورتی اور چاشنی کا معیار مختلف ہے۔۔۔ زبان کے معاملے میں ہم وادی والے

قدرتی حسن کے قائل ہیں مالی کے لگائے ہوئے مصنوعی حسن کو ہم چنداں اہمیت نہیں دیتے''۔ (سفر حیات صفحہ ۱۰۱)۔ کچھ عرصہ تک جماعت کے اخبار الفضل میں کام کرنے کے بعد کچھ دیر کے لئے جماعت کے بیرونی ممالک میں تبلیغی نظام کا انصرام کرنے والے محکمہ کے قائم مقام افسر محکمہ بنائے گئے تو ایک رپورٹ لکھنے پر امام جماعت کی طرف سے تنبیہ ہوئی کہ ''الفضل میں آپ کے جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ مجھے پسند نہیں آئے ان میں دلائل کم اور لفاظی زیادہ تھی'' (صفحہ ۱۳۲) گویا دلی کی مٹی نے ابھی اپنا اثر زائل نہیں ہونے دیا تھا۔ امام وقت کی تنبیہ سے بہت دل گرفتہ ہوئے مگر جماعت کے ایک اور ادیب قبلہ میر محمد اسماعیل صاحب نے تسلی دی کہ یہ سرزنش تو رہنمائی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور مسعود احمد خاں دہلوی نے دلی والوں کی لفاظی کو خیر باد کہہ دینے کی کوشش شروع کر دی اور تقریباً نصف صدی تک جماعت کے اخبارات ورسائل کامیابی سے ایڈٹ کئے اور اپنی رپورٹنگ اداریہ نویسی اور تصنیفی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

بھائی مسعود احمد خاں دہلوی (لیجئے ہم بھی اپنی نقادوں والی عادت سے دست بردار ہوتے ہیں) نے لکھا ہے کہ قادیان آنے سے پہلے والی زندگی میں آپ ملازمت کے حصول کی سفارش کے لئے پانی پت گئے کیونکہ وہاں ''چیف کمشنر انکم ٹیکس'' جناب محمد منیر آنے والے تھے ان سے کسی دوست نے ان کی ملازمت کی سفارش کرنا تھی مسعود صاحب کا کہنا ہے کہ یہی ''محمد منیر صاحب بعد کو پاکستان کے چیف جسٹس ہوئے'' (صفحہ ۴۸) ہم چیف جسٹس منیر کی خودنوشت ''زندگی کی شاہراہیں اور پگڈنڈیاں'' پڑھ چکے ہیں آپ انکم ٹیکس کے محکمہ میں کبھی چیف کمشنر نہیں رہے۔ چیف کمشنر انتظامی افسر ہوتا ہے منیر صاحب انکم ٹیکس اپیلیٹ ٹریبونل کے رکن تھے جو عدالتی ذمہ داری ہے۔ وہیں سے آپ ہائی کورٹ کی ججی پر سرفراز ہوئے تھے۔ پھر آپ کو چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب سے شیخ اعجاز احمد صاحب نے ملوایا۔ چوہدری صاحب ان سے نہایت خفگی سے ملے تو یہ بہت آزردہ ہوئے (صفحہ ۵۱) جب اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کا ایک رخ متعین کر رکھا تھا تو انہیں سفارش کہاں سے ملتی؟ جملہ معترضہ ہے مگر کہہ دینے میں کیا حرج ہے کہ چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب سے پہلی بار ملنے والے کو ان کی کم آمیزی کی عادت کی وجہ سے بے رخی کا شدید احساس ہوتا تھا اور اس کمزوری کا اعتراف خود چوہدری صاحب نے

اپنی خودنوشت تحدیثِ نعمت میں بھی کیا ہے۔ ''(سر فنڈلیٹر سٹوارٹ نائب وزیر ہند نے سر اکبر حیدری سے شکایت کی کہ انہوں نے دو تین بار ظفر اللہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے تو چوہدری صاحب نے جواب دیا) میں نے حجاب کی وجہ سے ازخود ان سے گفتگو نہیں کی مجھے افسوس ہے انہیں روکھے پن کا احساس ہوا یہ میری طبیعت کا نقص ہے جس کی اصلاح کرنے میں میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کی وجہ سے دوستوں کو اکثر میرے متعلق شکایت کا موقعہ ملتا رہتا ہے''
(تحدیث نعمت صفحہ ۲۸۵)

خود راقم الحروف جب احمدیہ انٹر کالجیئیٹ ایسوسی ایشن لاہور کا صدر تھا تو عاملہ نے فیصلہ کیا کہ اپنے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے چوہدری صاحب کو دعوت دی جائے۔ میں ملاقات طے کر کے ربوہ میں چوہدری صاحب کی خدمت میں بیت الظفر میں حاضر ہوا اس حال میں کہ میرے جوتے گرد آلود تھے اور بال حسب دستور بکھرے ہوئے۔ چوہدری صاحب نے نہایت قہر کی نگاہوں سے دیکھا اور بے رخی سے پوچھا آپ کیسے آئے ہیں؟ میں نے عرض مدعا کیا کہ آپ لاہور تشریف لائیں تو ہماری ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ سے خطاب فرمائیں۔ فرمایا کسی سے ملنے جانا ہو تو جوتے پالش کر لیا کرتے ہیں۔ میں نے تنک کر جواب دیا میں نے مرقاۃ الیقین پڑھ رکھی ہے اور ربع اشعث اغبر سے بھی ناواقف نہیں۔ چوہدری صاحب چونکے۔ ذرا نرم پڑے پوچھا جلسہ کس جگہ ہوگا؟ میں نے کہا وہیں اس کمرہ میں جس میں آپ لاء کالج لاہور کے لیکچرار ہونے کے زمانہ میں لیکچر دیا کرتے تھے۔ کہنے لگے آپ لا کالج میں پڑھتے ہیں میں نے کہا بحمد اللہ نہیں۔ میں اورئینٹل کالج کا طالب علم ہوں مگر ہمارا اور لاء کالج کا ہال ایک ہی ہے۔ مینارڈ ہال میسر نہ ہو تو ہم لاء کالج والوں سے وہ لیکچر ہال مانگ لیا کرتے ہیں۔ ہم نے پرنسپل شیخ امتیاز علی صاحب سے اس کمرہ کی درخواست کی تھی انہوں نے اجازت دے دی ہے۔ شیخ صاحب ہی نے بتایا تھا کہ اس کمرہ میں آپ لیکچر دیا کرتے تھے۔ فضا کے تناؤ میں ذرا سی کمی ہوئی۔ پھر چوہدری صاحب نے فرمایا ''ٹھیک ہے میں مقررہ تاریخ اور وقت پر آجاؤں گا''۔ میں شکریہ ادا کر کے بڑی آزردگی کے عالم میں رخصت ہوا کیونکہ اس طرح کبھی کوئی بے رخی سے پیش نہ آیا تھا۔ چوہدری صاحب تشریف لائے جلسہ ہوا مگر میں اپنی جوانی کی ترنگ میں بہ طور

صدر سارے انتظامات کرنے کے باوجود جلسہ میں شامل نہ ہؤا کیونکہ میں حسب عادت اپنے جوتے
پالش نہ کر سکا تھا رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے۔ تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں
وہ بھی۔ اور ہمارے بے پالش کے جوتوں اور سر کے بکھرے بالوں کی دوستانہ شکایت تو مسعود بھائی کو
بھی دائم رہتی ہے۔ اب سر کے بال اتنے جوگے نہیں رہے کہ بکھر سکیں لیکن یہی کیا کم ہے کہ ہیں تو سہی!

رپورٹنگ کے سلسلہ میں سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کی ایک تقریر کا ذکر آپ نے فرمایا ہے
کہ شاہ جی نے بڑی تحدی سے الزام لگایا کہ ربوہ میں اسلحہ کے انبار موجود ہیں حکومت تحقیق کرلے
اگر بخاری جھوٹا نکلے تو اسے سرعام پھانسی دے دی جائے'' (صفحہ ۱۹۵) اگلے روز ہی اسمبلی میں کسی رکن
نے سوال کر دیا جس کا جواب قائد ایوان میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے یوں دیا'' جہاں تک حکومت کی
معلومات کا تعلق ہے ربوہ میں نہ تو کسی قسم کا غیر لائسنس یافتہ اسلحہ اور گولہ بارود موجود ہے اور نہ وہاں
آتشیں اسلحہ بنایا یا تیار کیا جا رہا ہے'' (صفحہ ۱۹۸) یہ ممتاز دولتانہ وہی تھے جو جماعت کے خلاف ۱۹۵۳
کی تحریک کے بانی مبانی تھے۔ ان کی زبان فیض ترجمان سے تردید کے باوجود قبلہ شاہ جی ہنستے بستے
رہے اور اپنی غلط بیانی پر انہیں کوئی شرمندگی نہ ہوئی۔ اسی قسم کا واقعہ قدرت نے ایک بار پھر مولانا منظور
چنیوٹی کی رسوائی کی صورت میں دکھایا۔ ان کا کہنا تھا کہ مولانا اسلم قریشی کو مرزا طاہر احمد نے اغوا
کروا کے قتل کر دیا ہے اگر ان کی بات جھوٹی ثابت ہو تو انہیں سرعام تختہ ء دار پر کھینچ دیا جائے۔ اور یہ
بات اسمبلی میں کہی گئی اور اسمبلی کے ریکارڈ میں رہتی دنیا تک موجود اور مولانا کی ''صدق مقالی'' کی
گواہی دیتی رہے گی۔ اسلم قریشی زندہ برآمد بھی ہو گیا اور ٹی وی پر یہ بیان بھی اس نے دیا کہ وہ خود
اپنے گھریلو حالات سے دلبرداشتہ ہو کر ایران چلا گیا تھا اسے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا اس کے باوجود
مولانا تختہ ء دار کو چومنے کی سعادت سے محروم رہے۔

ایک صحافی کی خودنوشت میں صحافیوں کا ذکر تو ہونا ہی چاہیئے۔ م ش کا ذکر ہے۔ مولانا عبدالمجید
سالک کا ذکر خیر ہے۔ چراغ حسن حسرت کا ذکر ہے مگر ہمیں اس بیان میں ایک کمی نظر آتی ہے۔ حسرت
صاحب سے ان کی ملاقات ایک دوست کی وساطت سے کراچی کے فردوس ہوٹل میں ہوئی جہاں
حسرت صاحب مجلس آراء ہؤا کرتے تھے۔ حسرت صاحب ہر مخاطب کو مولانا کہہ کر پکارتے تھے۔ جو

مکالمہ مسعود صاحب نے درج کیا ہے اس میں کسی کو مولانا کہہ کر پکارنے کا ذکر نہیں (صفحہ ۲۴۱)۔
حسرت کسی سے مخاطب ہوں اور اسے مولانا نہ کہیں؟ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ ہمیں مکالمہ
کی صداقت میں کلام نہیں حسرت صاحب کے مولانا نہ کہنے پر تعجب ہے۔ جہاں تک جماعت احمدیہ کے
اس کہنہ مشق صحافی کی رپورٹنگ کا تعلق ہے اس کی ایک گواہی ہمارے پاس بھی ہے۔ ہمارے ڈویژن
کے کمشنر قاسم رضوی کئی بار ربوہ تشریف لائے اور کالج کی بزم اردو میں تقریریں فرمائیں باسکٹ بال کے
میچ ملاحظہ فرمائے۔ پہلی بار بزم اردو کے افتتاح کے لئے تشریف لائے۔ وہ بڑے شگفتہ وشیوہ بیان مقرر
تھے اور کبھی اپنے انفارمیشن افسروں کی لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھتے تھے۔ بزم اردو کے افتتاح کی رپورٹ
روزنامہ الفضل میں شائع ہوئی تو میں نے اس کی ایک نقل کمشنر کے ملاحظہ کے لئے بھیجی۔ کچھ عرصہ کے
بعد کسی اور اجلاس کے لئے دعوت دینے کو میں انہیں ملا تو فرمانے لگے میری تقریر کی رپورٹ کس نے
مرتب کی تھی؟ میں نے مسعود صاحب کا نام لیا۔ کہنے لگے جب میں ربوہ آؤں تو مجھے اس رپورٹر سے
ضرور ملوانا میں نے آج تک اپنی تقریر کی اتنی جامع ومانع اور زبان وبیان کے اعتبار سے بھرپور رپورٹ
کبھی نہیں دیکھی۔ رضوی صاحب ربوہ تشریف لائے تو میں نے کالج کے سٹاف سے تعارف کے بعد
انہیں مسعود احمد خاں دہلوی سے ملوایا کہ یہ صاحب ہیں جن سے ملنے کے آپ آرزومند تھے۔ رضوی
صاحب نے نہایت گرمجوشی سے مسعود صاحب سے مصافحہ کیا اور کامیاب رپورٹنگ پر انہیں خراج تحسین
پیش کیا۔ مسعود صاحب نے خود تو اس بات کا ذکر اپنی خودنوشت میں نہیں کیا کہ خودستائی میں شمار ہوتا مگر
ہم یہ گواہی درج کر رہے ہیں کہ تاریخ میں تو محفوظ ہو جائے۔

احوال الرجال میں قریشی منظور احمد صاحب کا ذکر خیر ہے۔ (صفحہ ۱۹۱۔ مکرر صفحہ ۲۳۹) قریشی
صاحب بڑے کہنہ مشق اور ماہر ٹائپسٹ تھے۔ نسبت روڈ کے کونے پر ایک چھوٹے سے لکڑی کے کیبن
میں اپنی ٹائپ کی مشین لے کر بیٹھتے تھے اور اسی ٹائپ کی حلال روزی سے آپ نے اپنے بیٹے کو ڈاکٹر
بنایا پھر اسے انگلستان سے ایم آر سی پی کروایا ہارٹ سپیشلسٹ بنایا اور پھر وہ بیٹا ایسے وقت میں ربوہ
میں خدمت کے لئے آ بیٹھا جب دوسرے ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی وہاں آنے سے کتراتے تھے۔ یہ
ہارٹ سپیشلسٹ ڈاکٹر لطیف احمد قریشی ہیں اللھم متعنا بطول حیاتہ۔ منظور احمد قریشی صاحب کے انتقال

پر ہم نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا تھا کہ قریشی منظور احمد صاحب نے ۱۹۵۳ کے انکوائری کمیشن کی کارروائی ٹائپ کرنے میں دن رات ایک کر کے جماعت کی خدمت کی مگر ہمارے ایک دوست نے ہماری بات پر اعتبار نہیں کیا کہ تم کہاں اس وقت لاہور میں موجود تھے کہ ایسی باتیں وثوق سے لکھ رہے ہو۔ حالانکہ ہم جماعت کے دفتروں میں کام کر رہے تھے اور اکثر بعض کاموں کے سلسلہ میں ہمیں ۳۱ ٹمپل روڈ یعنی شیخ بشیر احمد صاحب کی کوٹھی میں جانا پڑتا تھا۔ اب ہماری بات کی تصدیق مسعود صاحب کی خودنوشت سے بھی ہوگئی ہے مگر افسوس کہ ہمارے وہ دوست جنہیں ہماری بات میں کلام تھا اس دنیا میں موجود نہیں۔ اخلاص سے کی ہوئی خدمت صدقہ جاریہ کے حکم میں ہوتی ہے جس کا فیض جاری رہتا ہے۔

پھر ڈنمارک کے احمدی نوح ہانسن صاحب کا ذکر ہے (صفحہ ۳۸۶)۔ ہانسن صاحب اپنی کمپنی کی طرف سے ناگویا جاپان تشریف لائے تو امام عطاء المجیب راشد نے ٹوکیو سے ہمیں حکم دیا کہ ہانسن صاحب اوساکا کی سیر کے لئے آنا چاہتے ہیں ان کا خیال رکھا جائے۔ ہانسن صاحب تشریف لائے ہمارے ہاں قیام فرمایا۔ ہم نے اپنی یونیورسٹی کے اپنے رفقاء کے علاوہ ڈینش زبان کے شعبہ کے اساتذہ اور وائس چانسلر کو بھی کھانے پر بلا کر ہانسن صاحب سے تعارف کروایا۔ وہ لوگ بہت حیران ہوئے کہ آپ جنوبی ایشیا کے رہنے والے ہیں ہانسن صاحب پکے ڈینش ہیں دونوں میں کیا قدر مشترک ہے؟ ہم دونوں نے کہا احمدیت۔ وائس چانسلر صاحب کو جب میرے رفقاء کار نے ترجمہ کر کے یہ بات بتائی تو وہ بہت حیران ہوئے کہ عقائد کا اشتراک ایسی گہری اخوت بھی پیدا کر سکتا ہے احمدیت کی اخوت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی اطاعت امام کے ہم عینی گواہ ہیں اس سلسلہ میں مسعود بھائی کی بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ حضرت صاحب نے میاں صاحب کو طلب فرمایا تو بلا توقف حاضر ہو گئے حالانکہ خضاب کر رہے تھے اور ہاتھوں پر خضاب کے دھبے موجود تھے۔ (صفحہ ۲۶۲) مولانا ابوالکلام آزاد نے حضرت مولانا نور الدین کے بارہ میں لکھا ہے کہ جب مولانا ۱۹۰۵ میں قادیان گئے تو ''مرزا صاحب نے بلایا تو مولوی نور الدین خضاب کی وجہ سے ڈھاٹا باندھے آئے'' (خودنوشت

مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ ۲۳۸) امام کا ارشاد سنتے ہی اس پر لبیک کہنا ان بزرگوں کا اسوہ تھا۔

منشی سبحان علی کاتب الفضل کے اخلاص کا ذکر ہے کہ انہوں نے اور ان کے بیٹوں نے رات بھر محنت کر کے ایک ضرورت مند کا مقالہ صاف کر کے لکھ دیا اور اجرت تک نہ لی (صفحہ ۲۵۷) ان کے سارے ہی بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے خوشحال ہیں۔ لمن کے ایک بیٹے کو تو حضرت اقدس کے دورہ کینیڈا کے دوران اپنی نئی اور بڑی قیمتی گاڑی ہمہ وقت خدمت کے لئے پیش کرنے کی توفیق ملی اور وہ گاڑی ہمہ وقت حضرت صاحب کے استعمال میں رہی۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔

ایک کمی ہمیں ضرور محسوس ہوئی کہ ہمارے دوست روشن دین تنویر کا ذکر ذرا زیادہ ہونا چاہئے تھا کہ ان سے آپ نے بہت کچھ سیکھا اور فیض پایا۔ ان کی شخصیت کو جتنا قریب سے آپ نے دیکھا ہے کسی اور نے نہیں دیکھا ہوگا۔

دلی والے کی خودنوشت ہو اور کوئی نئی بات قاری کو نہ ملے۔ ہم نے بھوک کے مارے آنتوں کے قل ھو اللہ پڑھنے کا محاورہ تو سنا ہوا تھا بھوک کے مارے ''پیٹ کے لخ لخ کرنے'' (صفحہ ۱۱۲) کا محاورہ پہلی بار مسعود بھائی کی خودنوشت میں پڑھا ہے۔

یہ خودنوشت اپنی زبان کے چٹخارہ کی وجہ سے ہی نہیں جماعت احمدیہ کی صحافت کی مستند تاریخ کے طور بھی یاد رکھی جائے گی۔

قصہ ایک صدی کا

پیپلز پارٹی کے رہنما اور پنجاب کے سابق وزیر تعلیم ملک غلام نبی کی خودنوشت ''قصہ ایک صدی کا'' ۲۰۰۴ میں سنگ میل والوں نے لاہور سے شائع کی تھی۔ ملک صاحب نے انتساب میں لکھا تھا کہ قائداعظم نے ''جب آزادی حاصل کر لی تو ایک فاتح، کامیاب و کامران قائد کی حیثیت سے ایک چارٹر قوم کے لئے تجویز کیا جسے ایک فرمان کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر ان کے کہے ہوئے ارشادات اور اس قرارداد مقاصد کو جو انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ کو قانون ساز اسمبلی کا پہلا صدر منتخب ہونے پر ارشاد فرمائی عمل کر لیا جاتا، روگردانی نہ کی جاتی، علم و فضل کے بے معنیٰ دریا نہ بہائے جاتے، اپنی غلط سوچوں سے اسے گڈمڈ کرنے کی کوشش نہ کی جاتی، صاحب عقل و ہوش اس پر ایمان داری سے عمل کرتے تو یہ حکمرانوں کے لئے اساسِ دستور کا کام دیتی۔ اور یقیناً قوم کو گذرے ہوئے برسوں میں ان صبر آزما دل خراش اور جان لیوا حالات سے نہ گذرنا پڑتا وہ ایک نئے جوش و خروش، نئے عزم و استقامت کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہو جاتی'' (انتساب۔ قصہ ایک صدی کا صفحہ ۱۳۔۱۴) اتنے خوش آئند انتساب کے ساتھ کتاب کا آغاز ہوتا ہے پھر یہ دعویٰ بھی سامنے آتا ہے کہ ''میں نے منافقت کی ہے نہ جھوٹ بولنے کی کوشش کی ہے'' (صفحہ ۲۳) مگر انہی کے قائد ذوالفقار علی بھٹو نے قائد اعظم کے اس واضح ارشاد کے خلاف منتخب اسمبلی کے ذریعہ ۱۹۷۴ میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو دائرہء اسلام سے خارج کرنے کا کارنامہء قبیح سرانجام دیا تو ملک صاحب چپ رہے اور ان کی پارٹی نوے سالہ مسئلہ کے کامیابی سے حل کرنے پر بغلیں بجاتی رہی اس وقت ان کے منافقت نہ کرنے کے دعوے کہاں تھے؟ پھر بھٹو صاحب نے صنعتی اور تعلیمی اداروں کی نیشنلائزیشن کر کے ملک کی صنعت اور نظام

تعلیم کا ستیاناس کر دیا اس وقت وزیر تعلیم یا سابق وزیر تعلیم کہاں تھے؟ مانا کہ انہوں نے پارٹی کے لئے قید و بند کی مصیبتیں اٹھائی تھیں مگر کیا ان کا ضمیر انہیں یہ نہیں بتاتا کہ غلطی اپنا قائد بھی کرے تو وہ غلطی ہی ہوتی ہے؟ ساری کتاب میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی تباہ کن غلطیوں کی طرف اشارہ تک موجود نہیں کیا یہی راست گوئی ہے؟ ہمیں ان کی سیاسی جدوجہد اور مسلم لیگ کے ساتھ وابستگی پر خوشی ہے اور اس بات پر داد دینے کو ہم تیار ہیں کہ آپ حق بات کہنا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں۔ مسلم لیگ کے اجلاس ۱۴ دسمبر ۱۹۴۷ میں ایک ہلکی پھلکی داڑھی والے نے قائداعظم سے کہا ''ہم لوگوں کو بتاتے رہے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہٰ الا اللہ۔'' قائداعظم نے فرمایا ''تشریف رکھئے نہ تو میں نے نہ ہی ورکنگ کمیٹی یا آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ایسی کوئی قرارداد پاس کی جس میں پاکستان کا مطلب کیا لا الہٰ الا اللہ کو اپنایا گیا ہو۔ ہاں آپ نے چند ووٹ حاصل کرنے کے لئے ایسا نعرہ لگایا ہوگا'' (صفحہ ۱۰۷۔۱۰۸) پھر آپ نے سقوط مشرقی پاکستان کے باب میں بھی حق بات کہہ دی ہے کہ ''یہ سارا کھیل ہی اپنوں کی سازش اور اقتدار کے بھوکوں کی وجہ سے کھیلا گیا'' (صفحہ ۱۴۷) ہم نے کبھی کسی سیاسی رہنما کے دہن مبارک سے اس سے زیادہ ذومعنیٰ اور بامعنیٰ جملہ ادا ہوتے نہیں دیکھا۔

ضیاء الحق کے عبرت ناک انجام پر ان کا کہنا یہ ہے کہ ''یہ بھی خدا کا عذاب ہے کہ بھٹو کی قبر کھودنے والے کو زمین کی مٹی بھی نصیب نہ ہو سکی۔۔۔ یہ عذاب تھا یا انتقام خداوندی'' (صفحہ ۱۸۷) مگر ۱۹۷۴ میں ملاؤں کو خوش کرنے کے لئے مداخلت فی الدین کی روایت ڈالنے والے مطلق العنان حکمران کو اگر تختہء دار پر کھنچنا پڑتا ہے تو کیا یہ عذاب الٰہی یا انتقام خداوندی نہیں؟ ملک صاحب اس باب میں کیوں خاموش ہیں؟

ملک صاحب امرتسر کے ایک مشہور سیاسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ امرتسر پنجاب کا مشہور سیاسی شہر تھا اس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کا زور تھا مجلس احرار اپنے بے پناہ مقررین کی بدولت عام عوام میں مقبول تھی مگر مسلم لیگ اور احرار میں معرکے ہوتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کرتے تو لوگ عشا سے صبح تک دم بخود بیٹھے ان کی تقریر سنتے اور جھومتے رہتے۔ ''احرار کی زبان ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ احرار کے اکابرین قائداعظم اور ان کے ساتھیوں پر اپنی غلیظ فصاحت و بلاغت

کے تیر پھینکا کرتے تھے حقیقت میں وہ سیاسی دیوالیہ پن کا مظاہرہ کررہے تھے۔۔۔۔۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بڑے جذباتی انداز میں جب یہ گلہ کررہے تھے کہ آپ ہمیں چندہ دیتے ہیں تو پھر حساب بھی مانگنا شروع کردیتے ہیں۔ ہندو لیڈر بھی چندہ لیتے ہیں لیکن کوئی ان سے حساب نہیں مانگتا۔ ایک نوجوان اٹھتا ہے اور شاہ جی سے کہتا ہے شاہ جی ہندو جو چندہ لیتے ہیں اس چندہ سے یونیورسٹی بنا کر دکھاتے ہیں اور آپ کو جو چندہ دیا جاتا ہے اس کے بعد مسجدوں کے لوٹے بھی غائب ہو جاتے ہیں'' (صفحہ ۶۵)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہی کا ذکر ہے ''شاہ جی کی زبان سے ایک مصرعہ نکلا ''تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں'' پہلا مصرعہ اس شعر کا اس وقت شاہ جی کے ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے اپنی نشست سے اٹھ کر پہلا مصرعہ پورے زور سے پڑھا۔ ''زلف آوارہ، گریباں چاک، اے مستِ شباب'' مصرعہ سنتے ہی شاہ جی کہنے لگے واہ واہ خیرات بھی ملی تو کہاں سے'' (صفحہ ۲۲۰)

۱۹۷۶ میں ہنری کسنجر نے بھٹو صاحب کو جو وارننگ دی تھی اس کا تذکرہ تو بہت سنا تھا ملک صاحب نے چشم دید گواہی دی ہے کہ گورنر ہاؤس لاہور میں وزیر اعظم بھٹو سے ہنری کسنجر کی میٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ بھٹو صاحب نے بڑی زوردار تقریر کی۔ انہوں نے کہا ہم ''پاکستان کا نوکلئیر پروگرام کسی صورت میں ختم نہیں کریں گے۔ اور کسنجر کو مخاطب کر کے کہا جب آپ دوبارہ پاکستان تشریف لائیں گے تو میں آپ کا گرمجوشی سے استقبال کروں گا'' اس خطاب کے بعد ہنری کسنجر نے بھٹو صاحب کو بڑے ہی شاندار الفاظ میں ان کی تقریر پر خراج تحسین پیش کیا کہ آپ بڑے خوش بیان مقرر ہیں جب بھی آپ امریکہ تشریف لائیں گے میں آپ کا استقبال کروں گا مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ جب میں دوبارہ پاکستان آؤں گا تو اس وقت آپ شاید موجود نہ ہوں'' (صفحہ ۱۶۹)۔ ہنری کسنجر جیسے تجربہ کار سفارت کار کی زبان قابل غور ہے۔ اس خودنوشت میں بڑی بڑی باتیں تو ایسی قابل ذکر نہیں چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی دلچسپ ہیں۔ ایوب خاں کی یہ بات ہم نے ان کے ہاں پہلی بار پڑھی ہے کہ پنجاب کے گورنر نواب کالا باغ تھے ان کے جانے کے بعد جنرل موسیٰ گورنر بنائے گئے۔ صدر ایوب نے دونوں کا فرق بیان کرتے ہوئے کہا ''ایک سنتا نہیں تھا دوسرا سمجھتا نہیں'' (صفحہ

۱۳۹)۔ مجلس احرار والے ''سر فضلِ حسین کو غضب حسین کہتے تھے'' (صفحہ ۴۴)

احوال الرجال میں ڈاکٹر امیر الدین کا ذکر خیر ہے (صفحہ ۲۴۲) حسین شہید سہروردی کو آپ بابا کہا کرتے تھے وہ ان کے دولت کدہ پر بھی تشریف لاتے رہے ان کی خوبیوں کا بیان ہے اس خوبی کا بھی کہ وہ اپنے ادنیٰ کارکنوں کا یہاں تک خیال رکھتے تھے کہ بطور وزیر اعظم ڈھاکہ جانے لگے تو جہاز والوں نے ان کے کارکن گام پہلوان کو سیٹ دینے سے انکار کر دیا کہ ''جہاز پرانا ہو چکا ہے سفر لمبا ہے مجھے خطرہ ہے کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ سہروردی صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔ کموڈ کو ڈھک دیا جائے اور ہم باری باری اس پر بیٹھ جائیں گے'' (صفحہ ۲۴۳) جب تک ان کے کارکن کو سیٹ نہ مل گئی وزیر اعظم نے جہاز اڑنے نہیں دیا۔ ایم اے او کالج کے ذلیر اور نڈر پرنسپل ڈاکٹر دلاور حسین کا ذکر خیر ہے (صفحہ ۲۸۳) اور ہم نے پنجاب کے ایک نامور پرنسپل اور ماہر تاریخ کا ذکر مدتوں کے بعد کہیں کسی کتاب میں دیکھا ہے۔ دلاور صاحب یونیورسٹی کے اساتذہ میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور ایم اے او کالج جیسے کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے بہت شہرت رکھتے تھے۔ جن دنوں ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے ایک لطیفہ گردش میں تھا کہ ایم اے او کالج کے پڑوسی کالج لیڈی میکلیگن کالج کی پرنسپل یہ شکایت لے کر دلاور صاحب سے ملنے ان کے دفتر میں تشریف لائیں کہ ایم اے او کالج کے لڑکے سڑک پر ان کے کالج کی لڑکیوں کو تنگ کرتے ہیں۔ دلاور صاحب نے محترمہ پرنسپل کو کچھ دیر تک اپنے کمرہ میں بٹھائے رکھا اور خوب خاطر تواضع کی۔ پھر ان کی شکایت کے جواب میں فرمایا میڈم آپ کتنی دیر سے میرے کمرہ میں تشریف فرما ہیں؟ انہوں نے کہا کوئی تیس منٹ سے دلاور صاحب مسکرائے اور فرمایا میڈم میں نے اتنی دیر تک آپ کو کمرہ کی بند فضا میں تنگ نہیں کیا تو میرے بچے آپ کی لڑکیوں کو کھلے عام کیسے تنگ کر سکتے ہیں؟ میڈم نے اپنی شکایت پر اصرار ختم کر دیا۔ دلاور صاحب کا جتنا رعب داب تھا وہ ان کے سپورٹس مین ہونے کی وجہ سے تھا۔ ان جیسے زندہ دل پرنسپل بہت کم ہوتے ہیں۔

ملک صاحب اپنے دوستوں شیخ خورشید احمد اور راجہ حسن اختر کے کہنے پر ایوب کی کنونشن مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور فرماتے ہیں ''میں ساری زندگی اپنے اس فعل پر شرمندہ رہا'' (صفحہ ۱۳۱) چلئے ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے کسی فعل پر شرمندگی کا اعتراف کرنا بھی جانتے تھے۔ اب ایسے

لوگ کہاں؟ ان کے احوال الرجال والے حصہ میں جن لوگوں کا یہ ذکر نہیں کر سکے ان کے اسمائے گرامی کی فہرست درج کردی ہے۔ اپنے دوست شریف جنجوعہ کا نام نامی ''چندے آفتاب چندے ماہتاب'' (صفحہ ۳۲۶) لوگوں میں پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اللہ ان کو سلامت رکھے۔ ملک صاحب نے یہ خودنوشت ترانوے برس کی عمر میں لکھی اور یہی کیا کم ہے کہ ان کی یادداشت سلامت ہے اور وہ وثوق سے بات کر سکتے ہیں۔

میری داستان

سید عبداللہ شاہ صاحب کی خودنوشت ''میری داستان'' 1985 میں پہلی بار آتش فشاں پبلیکیشنز ایبٹ روڈ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔ سید صاحب نے سرعنوان کے طور پر فرمایا ہے کہ ''میں نے اپنی زندگی کے تمام واقعات کھل کر بے دھڑک بیان کر دئے ہیں اور زندگی کی یادداشتوں کا یہی اصول ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہ رکھا جائے۔'' پیش لفظ میں آپ نے صراحت سے فرمادیا ہے کہ ''پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہو کر میں نے تبلیغ اسلام شروع کی لال کرتی بازار پشاور صدر کی مسجد کی امامت اختیار کی۔ علمائے سرحد کے اکابرین کے ساتھ تبلیغ میں مشغول ہوا انجمن فضلائے دیوبند صوبہ سرحد کا جنرل سکرٹری رہا۔ قیام پاکستان کے لئے زوردار کوششیں کیں۔ میں جرگہ کا ممبر رہا انگریز نے مجھے خان صاحب کا خطاب دیا۔۔۔ حافظ قرآن، عالم دین، مبلغ اسلام، اخبار کا مدیر و مالک، اول نمبر کا گھڑ سوار اول درجہ کا مارکس مین فوجی نشانہ باز ہوں یہ صفتیں کم لوگوں میں ہوں گی'' (میری داستان صفحہ ۵)۔ آپ مسلم لیگ کے کارکن تھے اور سرحد کے ریفرینڈم میں مسلم لیگ کے ایجنٹ تھے۔ کتاب میں سیاسی اکابرین کے ساتھ ان کی تصویریں کتاب میں شامل ہیں جن میں سکندر مرزا بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب جہاں ختم ہوتی ہے وہاں تک ان کی کسی سیاسی سرگرمی کا ذکر نہیں پولیس کی ملازمت تک اور آٹھویں شادی تک کے ہیں۔ اس کے بعد آپ کہاں رہے اور کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام دئے ان کا ذکر نہیں دوسرا حصہ اگر چھپا ہوگا تو مجھ تک نہیں پہنچا۔

قبلہ شاہ صاحب کے دادا جان سید محمد شاہ کروڑی اپنے زمانہ کے ولی اللہ اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے ان کے مریدوں کی بہت بڑی تعداد تھی اور خاندان کے اکثر لوگ صرف اپنے

معتقدین کی نذر نیاز پر گذارہ کرتے تھے۔شاہ صاحب فوج میں بھرتی ہو کر جنگ عظیم اول میں شریک ہوئے اور عدن میں فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ ''کوت عمارہ'' میں ''اکثر خواتین نکاح متعہ کی خواہش کرتی تھیں اور صرف ثواب کمانے کی خاطر مجھے بہت پسند کیا جاتا تھا'' (صفحہ ۳۳)۔آپ نے دو خواتین سے نکاح بھی کیا ایک عرب لڑکی تھی اور دوسری ایک یہودن۔ یہودی لڑکی سے ان کی اولاد بھی ہوئی ایک لڑکا جس کا نام اس کے یہودی باپ نے اسحٰق عبداللہ رکھا ہندوستان واپس آنے سے قبل ان کی دونوں بیویاں فوت ہوگئیں۔ مدتوں بعد انہیں مولانا یوسف بنوری نے بتایا کہ وہ جامعہ ازہر گئے تھے وہاں انہیں نوجوان پروفیسر ملا جس کا نام اسحٰق عبداللہ تھا اس نے بتایا کہ اس کا باپ ایک ہندوستانی مسلمان تھا۔(صفحہ ۱۲۳)۔شاہ صاحب کا خیال ہے ہوسکتا ہے وہ ان کا بیٹا ہی ہو۔

لام سے واپسی پر بھی شاہ صاحب فارغ نہیں بیٹھے۔جیل کی ہوا بھی کھائی آٹھ نکاح بھی کئے۔ اپنی بیوی سیدہ غلام خدیجہ کے ذکر خیر میں لکھتے ہیں ''میں نے ان کی زندگی میں بھی خفیہ نکاح کر رکھے تھے اور اس کی وفات کے بعد بھی تین کنواری لڑکیوں سے نکاح کئے ہیں اور ایران میں بہت سی نوجوان لڑکیوں سے نکاح متعہ بھی کئے'' (صفحہ ۱۸۵) اور یہاں پر ان کی یہ داستان ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد کیا ہوا اس کے بارہ میں یہ کتاب خاموش ہے۔البتہ قاری کو رہ رہ کر شاہ صاحب کا قول مبارک یاد آتا ہے ''میری زندگی مثالی زندگی ہے'' (صفحہ ۵) اس مثالی زندگی پر بہت سے سوالیہ نشان ہیں آپ انجمن فضلائے دیوبند کے سکرٹری جنرل تو رہے مگر یہ کہیں مذکور نہیں کہ آپ حصول علم کے لئے دیوبند گئے بھی تھے یا انہیں محض آنرری طور پر فضلائے دیوبند کا عہدہ تفویض کردیا گیا تھا؟

تبلیغ اسلام کے لئے آپ نے کیا کوششیں کیں سوائے ایک یہودی بیوی کے کسی کو مسلمان کرنے کا ذکر کہیں موجود نہیں۔غرض یہ خودنوشت ایک سیدزادے کی فتوحات کی ایسی داستان ہے جس کو ان کے مرید تو دلچسپی اور فخر سے پڑھیں گے مگر دوسرے شاید ان سے اور ان کے کارناموں سے اتنی عقیدت کا اظہار نہ کرسکیں۔

❁

ماضی کے تعاقب میں

جناب یونس احمر کی خودنوشت ''ماضی کے تعاقب میں''، فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ کراچی کی جانب سے ۱۹۹۱ میں پہلی بار چھپی تھی۔ یونس احمر کلکتہ میں پیدا ہوئے بنگالی زبان وادب کے ساتھ ان کا واسطہ رہا اردو ادب میں ان کی زیادہ تر پہچان ان کے بنگالی ادب کے تراجم کی وجہ سے ہے۔خود ان کا دعویٰ ہے کہ ''گزشتہ پچاس سال کے دوران میں نے بنگلہ ادب کے خزانے سے اردو ادب کو چند گہر پارے ضرور دئے ہیں''۔۔۔''میں جہد حیات میں ہمیشہ پٹے ہوئے مہرے کی طرح رہا ہوں۔خلوت نشیں کم آمیز اور کم سخن آدمی سے اس سے زیادہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے'' (ماضی کے تعاقب میں صفحہ ۲۸) طبیعت کے اس انکسار و حجاب کے باوجود اگر صہبا لکھنوی صاحب ان سے خودنوشت لکھوانے میں کامیاب ہوگئے ہیں تو اس کی داد دونوں کو ملنی چاہئے۔احمر صاحب کہنا ہے کہ ''جس دن سے زندگی کے اسرار و رموز اور نشیب و فراز سے واقف ہوا ہوں انتہائی کرب کے عالم میں جی رہا ہوں'' (صفحہ ۲۶) یگانہ یاد آتا ہے۔ سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانہ دہر۔ سمجھنے میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا۔

کلکتہ میں ان کی ملاقات ٹیگور اور قاضی نذرالاسلام سے ہوئی۔ ٹیگور سے ۱۹۳۸ کی ترقی پسند ادب کانفرنس کے افتتاح کی حامی بھی بھروالی مگر پھر وہ اپنی علالت کے باعث شریک نہ ہوسکے مگر ان کا لکھا ہوا افتتاحی خطبہ کانفرنس میں پڑھا گیا (صفحہ ۸۲) سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں اس کا ذکر یوں کیا ہے ''کلکتہ کانفرنس یہ ظاہر کرتی تھی کہ ملک کے بعض حصوں میں (اور بنگال تہذیبی اور ادبی لحاظ سے ملک کا سب سے آگے بڑھا ہوا علاقہ تھا) ہماری تحریک اب نیک خواہشوں اور مرتعش

آرزوؤں کی فضاؤں سے گذر کر بہت سے دلوں اور دماغوں کے کشت زار میں ایک نئی اور تر فصل کی طرح ابھر آئی تھی اور اب وہ زمین اور ہوا سے ہی نہیں بلکہ سورج کی گرم اور تیز شعاعوں سے بھی نمو کی قوت کھینچ سکتی تھی'' (صفحہ ایضاً)۔ ٹیگور کا انتقال ۳۰ جولائی ۱۹۴۱ کو ہوا۔ (صفحہ ۴۷) نذرالاسلام نے اپنے اخبار نواجگ میں (نیا زمانہ) میں ایک طویل نظم میں ٹیگور کو خراج عقیدت پیش کیا مگر ۱۰ اگست ۱۹۴۲ کو نذرالاسلام کے دماغ پر فالج گرا اور وہ نہ صرف ذہنی توازن سے محروم ہوگئے بلکہ قوت گویائی بھی کھو بیٹھے۔ ان کی عمر صرف تینتالیس سال کی تھی (صفحہ ۳۶)

کلکتہ کی ترقی پسند کانفرنس کے علاوہ حیدر آباد کی کانفرنس کا ذکر بھی ہے مگر اس کی روداد آپ نے یوں مرتب کی ہے جیسے کسی اخبار میں رپورٹ چھاپنا مقصود ہو۔ مرشد آباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''میر جعفر کی قبر اب تک لوگوں کے لئے عبرت سرائے کا منظر پیش کرتی ہے یہاں عوام کا میلہ سالگا رہتا ہے'' (صفحہ ۵۷) اگر عبرت سرائے کی پہچان یہی ہے کہ وہاں عوام کا میلہ سالگا رہے تو اسلام آباد میں بھی ایک عبرت سرائے موجود ہے ضیاء الحق کی قبر۔ دونوں ایک ہی زمرہ میں تھے۔

ہمیں یہ بات پڑھ کر تعجب ہوا کہ ''کلکتہ مسلم انسٹی ٹیوٹ میں قائداعظم نے خواتین سے خطاب کیا مگر آپ کے سامنے ایک چادر تان دی گئی'' تھی کہ باپردہ خواتین بھی آپ کی تقریر سے مستفید ہو سکیں۔ (صفحہ ۹۶)

سیاسی معاملات میں آپ کی معلومات ناکافی ہیں۔ کلکتہ ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعہ انڈیا کو نہیں دیا گیا تھا بلکہ کانگریس سے سمجھوتے کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے کلکتہ ہندوستان میں شامل کیا تھا ریڈکلف ایوارڈ کو محض دھوکے کے لئے استعمال کیا گیا اس کا اعتراف لارڈ اسے نے اپنی میمائرز میں کھلے عام کیا ہے۔

احوال الرجال میں بہت لوگوں کے اسمائے گرامی موجود ہیں مگر کسی شخصیت نگاری کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ معمول کی باتیں ہیں۔ نذرالاسلام۔ مولوی عبدالحق، سجاد ظہیر، شاہد احمد دہلوی، مولانا آزاد، نہرو، زیڈ اے بخاری، جوش، حفیظ جالندھری، ابن انشاء، کوی جسیم الدین، زین العابدین۔ سوائے جوش صاحب کی ایک بات کے کوئی بات چونکاتی نہیں کہ ''جوش صاحب حسب معمول شراب پی کر

ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے'' (صفحہ ۹۲) اور یہ بات محل نظر ہے۔ جوش صاحب پر ایسا الزام تو شاہد احمد دہلوی تک نے نہیں لگایا۔

ماضی کے تعاقب میں کے آغاز میں مشفق خواجہ صاحب کا ایک بسیط مقالہ اردو کی خودنوشتوں کے باب میں شامل ہے جو بڑا وقیع اور پرمغز ہے اور کسی بھی خودنوشت کے تعارفیہ کے طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ اگر صہبا صاحب یونس احمر کی زندگی کے بعض کوائف خود بیان نہ کردیتے تو یہ خودنوشت مصنف کے عصر اور ہم عصروں کے باب میں تشنہ ہی رہتی۔

حرف محرمانہ

انفارمیشن سروس کے ایک وظیفہ یاب افسر جناب منصور عاقل کی خودنوشت ''حرف محرمانہ'' مکتبہ اتحاد المصنفین پوسٹ بکس نمبر ۱۲۸۳۹ اسلام آباد والوں کی جانب سے مئی ۱۹۹۴ میں چھپی۔ منصور عاقل کی یہ مختصری خودنوشت صرف تراسی صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اختتام پر ''بہ حرفے می تواں گفتم تمنائے جہانے را۔ من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را'' لکھ کر اپنی داستان ختم کر دی ہے مگر تقریباً اتنے ہی صفحات پر اپنی ذات وصفات پر دوسروں کے لکھے ہوئے مضامین اور اخبارات کے شذرے شامل کر کے کتاب کا حجم دوگنا کر دیا ہے اور تجاہل عارفانہ کے طور پر فرمایا ہے کہ ''نہ جانے یہ موقع مجھے کیسے میسر آگیا کہ اخباروں کتابوں اور رسالوں کے ہجوم سے میں یہ بکھرے ہوئے اوراق مجتمع کرسکا'' (حرف محرمانہ صفحہ۲)

منصور عاقل اپنی ملازمت کے دوران مختلف جگہوں پر محکمہ اطلاعات کے افسر کی حیثیت سے متعین رہے اس لئے اہل علم وصحافت سے ان کا رابطہ رہا۔ فارسی اور اردو کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور خود بھی شاعر ہیں اس لئے مشاعروں میں ان کی دلچسپی قائم رہی۔ ان کے کلام بلاغت نظام میں مجھے کوئی اپج نظر آئی ہے نہ ان کی خودنوشت میں کوئی چونکا دینے والی بات ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں تہاں شگفتگی پیدا کرنے کو دوسروں کے لطائف وظرائف کا سہارا ضرور لیتے ہیں۔ حسرت کا کافی ہاؤس کے بیرے والا لطیفہ (صفحہ۳۷) تو اب کلیشے بن چکا ہے

ایک بات ضرورنئی ہے کہ مارشل لا لگا تو اس وقت یہ ملتان میں تھے۔ ملتان میں عیش فیروز پوری کے شاگردوں نے ایک ادبی انجمن ''بزم عیش'' قائم کی تھی اور بوہڑ بازار میں اس کا بورڈ لگا رکھا تھا

مارشل لاء والوں نے اس ''بزم عیش'' پر چھاپا مارا (صفحہ۲۱) کہ یہ سر بازار عیش کی کیا بزم ان لوگوں نے سجا رکھی ہے۔ پروفیسر شور علیگ کی اس بدحواسی کا تذکرہ ہم کئی اور جگہ پڑھ چکے ہیں کہ وہ بزم میں تشریف لائے تو قمیض پاجامہ دونوں الٹے پہن رکھے تھے۔ (صفحہ۴۰) البتہ ان کے محکمہ کے ساتھی ہوش ترمذی مرحوم کا ذکر بہت دنوں بعد کسی جگہ نظر آیا ہے وہ بڑے نغز گو شاعر تھے اور ترنم بھی ان کا خوب تھا ہمیں یاد ہے سرگودھے کے عظیم الشان مشاعرہ میں حفیظ جالندھری اور دیگر بڑے شعرا کی موجودگی میں ہوش ترمذی نے یہ شعر پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا تھا'' کرتے ہو تمنا کہ وہ گل رو نظر آئے۔ آنکھیں بھی تو وہ لاؤ کہ خوشبو نظر آئے''۔ مدتوں اہل سرگودھا اس شعر کو یاد کرتے رہے۔

منصور عاقل صاحب نے احوال الرجال کے سلسلہ میں جناب ممتاز حسن کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ خوب ہے۔ ممتاز حسن حکومت پاکستان کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے مگر ان کی خاکساری اور بندہ پروری کا عالم یہ تھا کہ وظیفہ یابی کے بعد ایک روز وہ ان کے دفتر میں تشریف فرما تھے ''میرا چپڑاسی ان کے لئے پینے کا پانی لایا۔ پانی پی کر جب گلاس سے نظریں اٹھا کر چپڑاسی کو دینے لگے تو یک لخت کھڑے ہو گئے گلاس تو میز پر رکھ دیا اور میرے چپڑاسی کو یہ کہہ کر گلے لگا لیا کہ بھائی الٰہی بخش مدتوں کے بعد آپ کو دیکھا ہے آپ کا کیا حال ہے بال بچے کیسے ہیں وغیرہ وغیرہ اس دوران میں بھی کھڑا ہو گیا تھوڑی دیر بعد جب ممتاز حسن چلے گئے تو میں الٰہی بخش سے پوچھا تم ممتاز حسن صاحب کو کیسے جانتے ہو؟'' تو اس نے بتایا کہ جب وہ حکومت پاکستان میں فنانس سکرٹری تھے تو وہ ان کا چپڑاسی تھا'' (صفحہ ٦۵) خدا معلوم یہ وہی چپڑاسی تھا جس کا ذکر جناب شاہد احمد دہلوی نے ''مرغِ زریں'' کہہ کر کیا ہے یا کوئی اور تھا؟ ''ایک دفعہ میرے پرانے ہم جماعت اور بے تکلف دوست ممتاز حسن صاحب نے مجھے کہلوا بھیجا کہ کسی دن شام کو پانچ بجے میرے دفتر آجاؤ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ممتاز صاحب اس وقت سکرٹری فنانس تھے میں سیدھے سبھاؤ ان کے دفتر وقتِ مقررہ پر پہنچ گیا۔ ان کا چپڑاسی مرغِ زریں بنا باہر کھڑا تھا میں نے پرچے پر اپنا نام لکھ کر اسے دیا کہ صاحب کو دے آیئے اس نے بڑی بے مہری سے میری طرف دیکھا اور بولا بنچ پر بیٹھ جاؤ صاحب کام کر رہے ہیں میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد آکر مجھ سے ہٹ کر اسی بنچ پر آبیٹھا۔ دس منٹ گذر گئے اس نے مجھ سے بات کرنی بھی

گوارا نہ کی میں نے کہا آپ جا کر میرا پرچہ تو دے آیئے مناسب سمجھیں گے تو بلالیں گے بولا اندر کسی بڑے افسر کے ساتھ ضروری کام کر رہے ہیں ابھی ٹھہرو۔ ٹھہرے رہے۔ جب پھر کچھ وقت گذر لیا تو میں نے کہا صاحب نے مجھے بلایا ہے میں اپنے کسی کام سے نہیں آیا ہوں آپ اطلاع تو کر دیجئے وہ میری چٹ لے کر اندر چلا گیا وہاں سے چائے کے خالی برتن لے کر باہر نکلا میری چٹ اس کے ہاتھ ہی میں تھی برتن لئے چلا گیا مجھ سے کچھ نہ بولا جب واپس آیا تو آ کر خاموش بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا چٹ نہیں دی اس نے نہیں کہہ کر منہ پھیر لیا۔ میں جلتا رہا بھلتا رہا پون گھنٹے بعد جب ممتاز حسن صاحب اپنے معزز مہمان کو رخصت کرنے دروازے پر آئے تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی چونک کر بولے ارے آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں پون گھنٹے سے اور آئندہ آپ کبھی مجھے اپنے دفتر نہ بلائیں میں آنے والے پر لعنت بھیجتا ہوں وہ آیئے آیئے کہہ کر گلے میں ہاتھ ڈال کر مجھے اپنے ساتھ کمرے میں لے گئے'' (بزم خوش نفساں۔ صفحہ ۷۲ شائع کردہ مکتبہ اسلوب کراچی)۔

جوش صاحب کی غزل دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں وہ علی الاعلان غزل کی مخالفت کرتے تھے۔ فضل احمد کریم فضلی نے ان کے جواب میں جو رباعی انہی کی ڈکشن میں کہہ کر ان کو دی وہ پہلی بار ہماری نظر سے گذری ہے اس لئے اپنے قارئین کو اس میں شریک کرتے ہیں:

فرعون کی ڈوبی ہوئی سطوت کی قسم
شداد کی کھوئی ہوئی جنت کی قسم
میں بھی ہوں اسی زمرہء عظام میں جوش
''ابلیس و ابو جہل کی عظمت کی قسم''

چوتھا مصرعہ جوش صاحب کا ہے۔ (صفحہ ۶۹)

مگر اس خودنوشت کا ''بیت الغزل'' ان کی پنجاب حکومت کے زیر انتظام قائم کردہ مجلس زبان دفتری کے زمانہ کا ہے۔ لکھتے ہیں ''مجلس زبان دفتری پنجاب کے سکرٹری کی حیثیت سے دفتری زبان کے طور پر اردو کے فروغ و ارتقاء کا کام میرے سپرد ہوا اول تو اس ادارہ نے بہت قابل قدر کام سر انجام دیا تھا'' (صفحہ ۷۵) اس ادارہ نے اردو کی کیسی کیسی اور کیسے کیسے خدمات سرانجام دیں ان کا ذکر

جناب شہرت بخاری نے مجلس زبان دفتری کی ملازمت کا ذکر اپنی خودنوشت ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' میں کیا ہے۔ افسوس کہ اس خودنوشت کا اصل حوالہ اس وقت ہمارے پاس موجود نہیں مگر مشفق خواجہ کے ایک کالم کے توسط سے اس کی شاندار کارکردگی کا حوالہ ہم درج کرتے ہیں۔ ''اقبال اکیڈمی سے پہلے جناب شہرت حکومت پنجاب کی قائم کردہ مجلس زبان دفتری میں ملازم تھے۔ اپنی کارگذاری کی تفصیل آپ نے یوں بیان کی ہے کہ ''میں نے تقریباً چار برس ملازمت کی جو برائے نام تھی۔ اتنا آرام زندگی میں کہیں حاصل نہیں ہوا۔ اس محکمے کا کام ایسی لغات تیار کرنا تھا جو اردو کے سرکاری زبان بننے میں مد ثابت ہو سکے۔ مگر میرا کام یہ تھا کہ میں صبح دفتر جاؤں۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر پھروں دیگر مترجمین سے ادھر ادھر کی ہانکوں چائے پیوں۔ اور میز پر پڑ کر سو جاؤں دو پہر کو اٹھوں کھانا کھانے گھر جاؤں اور پھر اکثر واپس نہ آؤں'' (کالم از خامہ بگوش روزنامہ تکبیر ۱۹۹۷ بحوالہ سخن ہائے ناگفتنی مرتبہ مظفر علی سید صفحہ ۱۶۳)۔ گر ہمیں مکتب و ہمیں ملاست۔ کار طفلاں تمام خواہد شد! جناب منصور عاقل صاحب اس ادارہ کے معتمد تھے اور سبحان اللہ کیسا مفید کام اس ادارہ نے سرانجام دیا۔ اسی ذکر خیر پر ہم اس خودنوشت کا تجزیہ سمیٹتے ہیں۔ ورنہ ان کے ہاں مشاعروں کی بھی بہت روداد یں موجود ہیں جو بہت سے سخن ہائے گفتنی کو دعوت دیتی ہیں۔

❁

گئو دھول

الہٰ آباد یونیورسٹی کے اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ڈاکٹر سید محمد عقیل کی خودنوشت ''گئو دھول'' کے عنوان سے نومبر ۱۹۹۵ میں انجمنِ تہذیبِ نو، مالویہ نگر الہٰ آباد سے شائع ہوئی۔ عنوان کی تشریح ڈاکٹر صاحب نے یوں فرمائی ہے کہ ''شام کے وقت گاؤں کی طرف واپسی کے وقت چرواہوں کے گلّے کے پیروں سے اڑتی دھول، ڈوبتے سورج کی روشنی کو دھندلا دیتی ہے۔ یہی گئو دھول ہے یہاں اسے ایک طرح سے شام زندگی سمجھ لیجئے'' (گئو دھول صفحہ ۷)۔ وزیر آغا نے اپنی خودنوشت کو ''شام کی منڈیر'' سے کا عنوان دیا تھا اور شام زندگی کا لفظ علامہ راشد الخیری کے ساتھ منسوب ہو کر رہ گیا تھا اس لئے سید صاحب نے غالباً اپنے دوست ڈاکٹر رفیع اللہ لیکچرار کاشی ودیا پیٹھ بنارس کے مشورہ سے ہندی کی ترکیب چن لی ہوگی واللہ اعلم بالصواب۔ اس خودنوشت میں اور بھی بہت مقامات پر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی آمیزش ہے جو اردو پڑھنے والوں کو کھلتی ضرور ہے بدنما معلوم نہیں دیتی۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ آپ ''ایک کوردہ ایدل پور میں پیدا ہوئے'' (صفحہ ۱۱) راقم الحروف نے ابوالامتیاز عین سین مسلم صاحب کی خودنوشت ''لمحہ بہ لمحہ زندگی'' کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے گاؤں کو کوردہ لکھ دیا (پس نوشت سوم صفحہ ۱۴۱) تو آپ نے بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ کوردہ تو ایسے گاؤں کو کہتے ہیں جہاں جاہل لوگ بستے ہوں۔ اور ہمارا گاؤں تو جاہلوں کا گاؤں نہیں تھا۔ میں نے نور اللغات دیکھی تو واقعی اس میں کوردہ کے معانی ''کم آباد چھوٹا گاؤں جو غیر مشہور ہو کے ساتھ جاہلوں کی بستی'' (نور اللغات صفحہ ۸۵۴ زیر لفظ کوردہ) بھی لکھے تھے۔ میں نے فوراً جناب عین سین مسلم صاحب کو معذرت کا خط لکھا کہ میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا مجھے علم ہی نہ تھا کہ کوردہ کا لفظ استخفاف

کے لئے بھی مستعمل ہے میں تو اسے چھوٹا کم آباد گاؤں سمجھتا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کے برادر اکبر اپنے گاؤں کو کوردہ کہا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی آواز بہت سریلی تھی۔ ایک بے سرے گویے نے ان کی آواز سنی تو ان کو اپنے ہارمونیم پر کچھ سنانے کو کہا آپ نے سہگل کی گائی ہوئی کوئی غزل گائی تو سماں بندھ گیا۔ اور انہیں ''اپنی آواز کا جادو معلوم ہو گیا'' (صفحہ ۴۶) مگر والدہ صاحبہ تک خبر پہنچی تو ان کی خوب پٹائی ہوئی اور انہیں گانے کی ممانعت ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی حسرت سے اس محرومی کا ذکر کیا ہے۔ پڑھائی لکھائی میں ان کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ ''آموختہ دہرانے کی بجائے امتحان سے قبل مولوی سے تعویذ لے لیا کرتے تھے اور قرآن کا حمائل ایڈیشن جیب میں رکھتے تھے کہ یہ مجھے امتحان میں کامیاب کرا دیں گی'' (صفحہ ۵۲)۔ افتاں خیزاں ان کی تعلیم کا سلسلہ چلتا رہا تا آں کہ ان کے حالات روبراہ ہو گئے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد ملازمت کے سلسلے میں بھی آپ کو بہت تکالیف کا سامنا ہوا مگر بالآخر ''لعنت ہزار بار بہ کار مدرسی'' (صفحہ ۱۸۹) کہنے والے کو اسی کارِ بے ہنراں میں پناہ ملی۔ ایم اے کلاسوں کو پڑھانے والا جب یہ لکھتا ہے کہ ''ایم اے کلاسوں نے چوکس کر دیا مبادا کوئی غلطی نہ ہو جائے'' (صفحہ ۱۹۰) تو پڑھنے والا ان کی چوکسی کے دعوے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی خاتون صدر شعبہ کے ڈی لٹ کے مقالہ کو ''کٹ پیس'' اور ''بازار کا لکھا ہوا مقالہ'' کہا ہے (صفحہ ۳۰۲) ان کی طعن آمیزی کی عادت ان سے نہیں چھوٹی اور اپنی ہر ناکامی کے پیچھے انہیں کسی دوسرے کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات دل سے لگا بیٹھتے ہیں ''کینیڈا میں جوش سیمینار ہوا تو کسی نے ان کا نام بھیجنے کو کہا مگر نام نہ بھیجا گیا تو اس مخالفت کو'' (صفحہ ۲۹۱) اپنے خلاف سازش سمجھ بیٹھے۔ قرۃ العین حیدر ان سے ملنے پر آمادہ نہ ہوئیں تو ''ان کی بے رخی اور کم آمیزی کو افسانہ بنا دیا'' (صفحہ ۳۱۵) اقبال پر اینا ماری شمل کا مقالہ سنا تو ''انہیں یونہی سا لگا اور نام بڑے درشن چھوٹے کی پھبتی کہہ دی'' (صفحہ ۳۱۵) الہٰ آباد یونیورسٹی میں اپنے رفقاء کے بارہ میں لکھا ''میرا خیال ہے جس طرح جرائم اور جرائم پیشہ لوگوں پر کتابیں مرتب کی گئیں ہیں اسی طرح اگر کوئی باہمت یونیورسٹی کے ایسے اساتذہ کے بارہ میں ان کی نفسیات اور اور ان کی مجرمانہ کارکردگیوں پر کوئی کتاب مرتب کر سکے تو اساتذہ میں معلوم نہیں کتنے

سلطانہ مان سنگھ پھولن دیویاں اور نٹور لال جیسے لوگ ملیں گے۔ ایسے ایسے دھوکے باز اور ادبی گرہ کٹ کہ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔۔۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو یونیورسٹیوں میں آنے سے پہلے کہیں ریلوے یا کسی دفتر میں کلرک تھے یا محکمہ مال میں چنگی وصول کرتے تھے۔ محرر مال یا پرائمری سکول میں نائب مدرس'' تھے (صفحہ ۳۲۹) تو کیا اگر کوئی شخص روزی روٹی کمانے کے لئے ریلوے یا محکمہ مال میں کام کرتا ہے اور اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھتا ہے تو یہ بات یونیورسٹی میں آنے کے لئے اس کی راہ میں روک بن جانی چاہیئے؟ (خدا معلوم ڈاکٹر صاحب سبق یاد کرنے کی بجائے تعویذ گنڈے کا سہارا لینے والوں کے بارہ میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟) ایسی بات ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنی خودنوشت ورود مسعود میں جامعہ ملیہ کے اساتذہ کے بارہ میں کہی تھی تو اہلِ ذوق نے انہیں بہت لعن طعن کی تھی ''جامعہ کے استادوں میں بعض سیاہ روسیاہ کار بھی تھے نہایت رکیک حرکتیں کرنے والے رسوائے زمانہ دوسروں کی بہو بیٹی کو بہکانے والے اور ہر قسم کا نشہ کرنے والے''۔ اپنی محرومیوں کا رونا رونا ویسے بھی خودنوشت کے اصول کے خلاف ہے چہ جائیکہ انسان بے سوچے سمجھے دوسروں پر بلکہ اپنے رفقاء کار پر ایسے بیہودہ الزامات لگاتا چلا جائے کہ خود اس پر لگائے جائیں تو اس سے ان کا جواب بن نہ پڑے۔ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنی خودنوشت پر ناقدانہ نظر بھی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ ''جب انا کا شتر بے مہار چل پڑتا ہے تو پھر کسی چیز کا انت نہیں ہوتا مگر آخر اس میں کیا مزا ہے جب آپ کا ضمیر خود کہہ بیٹھے کہ اماں! کیوں جھوٹ بول رہے ہو؟ مان لیا تم نے دوسروں کو مطمئن کر بھی دیا تو کیا؟۔۔۔ اس خودنوشت میں حیرت ناکیاں نہیں ہیں اور نہ کچھ محض زیب داستاں کے لئے لکھا گیا ہے ہاں قاری کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ضرور بیانات میں کچھ دلچسپ باتیں آگئی ہیں'' (صفحہ ۲۸۱) ڈاکٹر صاحب اپنے رفقاء پر جو یونیورسٹی کے اساتذہ ہیں ایسی الزام تراشیاں نہ کرتے تو ان کی خودنوشت میں کیا کمی رہ جاتی؟

احوال الرجال میں شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گیان چند جین، پروفیسر احتشام حسین اور مرحوم مصطفٰے زیدی کا ذکر دلچسپ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کا ذکر'' گیان چند صاحب ہر وقت نشہءعلم میں غرق رہنے والے آدمی تھے۔ وہ ایک معتبر محقق ہیں (صفحہ ۳۰۳) وہ سچ باتیں دوٹوک اور بے دھڑک

ہو کر کہتے ہیں جو لوگوں کو اچھی بھی نہیں لگتیں۔۔۔ ذات کے بنیا ہیں جیسا کہ وہ مزاحاً خود بھی کہا کرتے ہیں۔ اس لئے اپنا حساب چھوڑتے ہیں نہ کسی کا حساب اپنے اوپر باقی رکھتے ہیں۔ اگر کسی نے ذرا سا بھی احسان ان کے ساتھ کیا ہو تو وہ اس کا بدلہ جلد ہی چکا دیتے ہیں (صفحہ ۳۰۴) وہ ہندو ہیں مگر یہ صفت اقبال کے مردمومن کی ان میں موجود ہے اور کسی موقعہ پر اس سے گریز نہیں کرتے۔ تحقیق کے معاملے میں وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتے جب تک وہ اپنی آنکھ سے وہ بیان یا واقعے کو دیکھ یا پڑھ نہیں لیتے۔ (صفحہ ۳۰۵) گیان چند صاحب میں ایک قدرے پوشیدہ لہر بھی ہے جو اوپر سے معلوم نہیں ہوتی۔ وہ متعصب ہرگز نہیں ہیں یعنی مذہبی ''پکش پات'' ان میں نہیں۔ مگر وہ چکبست وشرر کے معرکے میں چکبست کے طرف داروں میں رہتے ہیں وہ اردو کے ہندو ادیبوں سے ضرور ''سہان بھوت'' یعنی ہمدردی رکھتے ہیں۔۔۔ بہت سے اردو کے ہندو ادیبوں کی طرح ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں شاید یہ بات پڑی ہے کہ عام اردو کے ادیب ہندو ادیبوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ یہ بات نہ انہوں نے کہیں لکھی ہے نہ اپنی گفتگو میں کبھی لاتے ہیں مگر مجھے یہ محسوس ہوتا رہا ہے'' (صفحہ ۳۰۸) اب تو ان کی کتاب چھپ کر سامنے آگئی ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بات کا ثبوت مانگنے کی ضرورت نہیں رہی۔

بہت دیر ہوئی کہیں پڑھا تھا کہ شمس الرحمٰن فاروقی انڈیا کی پوسٹل سروس میں تھے اور ان کے خلاف لکھنے والے ادبی رسالوں کو پوسٹل ڈیپارٹمنٹ سے رسالے بھیجنے کی رعایت نہیں دی جاتی تھی۔ ہمیں یہ بات عجیب لگی تھی مگر ڈاکٹر سید عقیل صاحب نے لکھا ہے کہ ان کے ''رسالہ شب رنگ نے رعایت دینے کی درخواست کی۔ شب رنگ کا رجسٹرڈ نمبر ایل ۸۳۹ تھا۔ بہت دنوں تک ڈیپارٹمنٹ سے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر طرح طرح کی انکوائری شروع ہوئی کبھی یہ کہ رسالہ رجسٹرڈ نہیں ہے کبھی یہ کہ دوسو سے کم ڈسپیچ ہوتا ہے اس لئے رعایت نہیں مل سکتی۔ کبھی کچھ کبھی کچھ۔ جب تمام جوابات بھیج دئے گئے تو ایک دن ایک انسپکٹر آیا اور بولا کہ آپ لوگوں کو پوسٹل رعایت نہیں مل سکتی کہ آپ ہمارے صاحب کے خلاف لکھتے رہتے ہیں'' (صفحہ ۲۴۱) اب جا کے یہ عقدہ کھلا کہ یہ اشقلہ ہمارے ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کا چھوڑا ہوا ہے۔ کیا عجب کہ کل کلاں کوئی صاحب ہمارے دوست

ضیاء جالندھری کے خلاف بھی اسی قسم کا کوئی الزام لگادیں۔ گانوں پر نام نہ دینے کا الزام تو مرحوم قتیل شفائی لگا ہی چکے ہیں اور یہ ان کے ایم ڈی پی ٹی وی ہونے کے زمانہ کی بات ہے۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ پوسٹل ڈیپارٹمنٹ میں گذرا ہے الحمدللہ کہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسا کوئی کارنامہ ان سے منسوب نہیں۔ ہاں ان کی ایک بات ہمیں خوب لگی کہ جب بھی محمد حسن عسکری کی وفات کے بعد ان کا نام لیتے تو ساتھ میں رحمتہ اللہ علیہ ضرور کہتے! (صفحہ ۲۲۷)

اور اب ایک سنکی طالب علم کا ذکر۔ ''اس زمانہ میں ایک قدرے سنکی طالب علم ادبی دلچسپیوں کے باعث میرے قریب آیا جس نے آگے چل کر دنیائے شاعری میں بڑا نام کمایا یہ تھے سید مصطفےٰ حسین زیدی جو بعد کو تیغ الہٰ آبادی اور پھر پاکستان میں مصطفیٰ زیدی کے نام سے مشہور ہوئے۔۔۔۔ ان کو ''بگو'' کہا جاتا تھا۔ اس لفظ کی وضاحت تو مشکل ہے مگر یوں سمجھئے کہ وہ جو کسی کی نہ مانے نہ پروا کرے نہ کسی اصول کا قائل ہو نہ کسی ضابطہء حیات پر عمل کرے بے حد جھگڑالو اور سنکی سولجر ٹائپ مگر اس لفظ میں نفرت نہیں محبت ہے۔ اور ایک طرح سے درگذر کرنے کا خیال بھی۔ یہ صورت مصطفیٰ زیدی کی اسکول ہی میں نہیں خود اس کے گھر میں بھی تھی۔ ناخن بے حد بڑھے ہوئے اور ان میں کالا میل جما ہوا۔ بال پیچھے کی طرف اتنے بڑھ جاتے کہ چوٹی گوندھنے کی حد تک جب پہنچنے لگتے اور ان میں سے جوئیں ٹپکنے لگتیں تو تیغ کے والد یا بھائی ان کو زبردستی پکڑ کر نائی کی دکان پر لے جاتے اور جب تک اصلاح گیسو نہ ہو جاتی وہ لوگ وہیں بیٹھے رہتے۔ اور جب اس حجامت کے بعد سکول آتے تو جیسے اون کتری ہوئی بھیڑ لگتے۔ (صفحہ ۱۲۲۔۱۲۳)۔ تیغ ''بے تکی نظمیں کہتا'' (صفحہ ۱۳۰) ''اپنے سے کمزور طالب علم کے ساتھ گھل مل جاتا اور لیاقت کا رعب جماتا'' (صفحہ ۱۳۵) ''اپنے متعلق سکینڈل پھیلانے کا شوق رکھتا تھا'' (صفحہ ۱۳۶) اس کے عشقوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے خوب نکتہ پیدا کیا ہے کہ ''ہندوستان میں اس نے جن لڑکیوں سے عشق کئے ان کے نام ''س'' سے شروع ہوتے تھے اور پاکستان میں جو لڑکی ان کی موت کا باعث بنی اس کا نام ''ش'' سے شروع ہوتا تھا'' (صفحہ ۱۵۵)۔ مصطفیٰ زیدی نے ایک لڑکے سورج سے بھی عشق کیا اور اس کے عشق میں خودکشی کی ناکام کوشش بھی کی۔ غرض ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کی خودنوشت میں ایسی دلچسپی کی بہت باتیں ہیں۔ اور ایسی باتوں

کو وہ اس ''تانترک'' کی طرح مہارت سے بیان کرتے ہیں جس نے ان کی جرمن بہو کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مٹی کو بیلے کا پھول بنا دیا تھا! (صفحہ ۱۷۴)۔

یہ خودنوشت غیر ضروری تفاصیل سے اٹی پڑی ہے اور خود مصنف کو اس بات کا احساس بھی ہو جاتا ہے کہ ''خیر بات اپنے مستقر سے دور چلی گئی'' (صفحہ ۷۶) مگر وہ ''یہ بھی ایک ضمنی بات'' (صفحہ ۱۷۵) اور ''بر سبیل تذکرہ'' (صفحہ ۱۹۵) کہہ کر اپنی رو میں لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کراچی کی تاریخ پر کئی صفحات (صفحہ ۸۶ تا 92) اسی عادت کا شاخسانہ ہیں۔

آخر میں کانگریس والوں نے جواہر لال نہرو کی پیدائش پر اس کی مدح میں جو شعر گھڑا تھا وہ لکھ دینے میں کیا حرج ہے ''تو انگلستان کے سب بندروں کا منہ ہوا کالا۔ ہوا موتی سے پیدا جب جواہر لال سالالا'' (صفحہ ۲۵) ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی؟

عمرِ رواں

حکومت پاکستان کے مرکزی پلاننگ بورڈ کے زرعی سیکشن چیف، سابق سکرٹری زراعت پنجاب اور عالمی تنظیم ایف اے او کے عہدیدار، جناب محمد شفیع نیاز کی خودنوشت ''عمرِ رواں''، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کی جانب سے دسمبر ۲۰۰۹ میں شائع ہوئی۔ جناب شفیع نیاز ضلع جالندھر کے ایک عام سے زمیندار کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ زرعی کالج میں تعلیم حاصل کی بی ایس سی کرنے کے بعد مختلف زرعی محکموں میں ملازمت کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ میں حکومت ہند کے ایک وظیفہ پر آکسفرڈ یونیورسٹی میں تعلیم کے لئے گئے۔ واپس آکر کچھ عرصہ زرعی کالج میں پڑھایا پھر ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔ یہ ایک عام آدمی کی بلند ہمتی اور اولوالعزمی کی دلکش داستان ہے۔

جناب شفیع نیاز کی خودنوشت کی یہی خوبی اسے دوسرے حکومتی عہدیداروں کی داستان سے مختلف بناتی ہے کہ نیاز صاحب نے کہیں اپنی قابلیت یا کارناموں کے باب میں دون کی نہیں لی حالانکہ انہیں پلاننگ کمشن کا رکن ہونے کی وجہ سے صدورِ مملکت اور دوسرے اکابر تک رسائی حاصل رہی۔ ان کے مزاج میں بھی کوئی ایسی ٹیڑھ نہیں جو عام طور سے حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں میں پیدا ہوجایا کرتی ہے۔ آپ نے اپنی خودنوشت کے آغاز میں فرمایا ہے کہ ''میں نے تنہائی میں اپنی سوچوں اور محفل میں اپنی زبان کی حفاظت کی ہے'' (عمرِ رواں صفحہ ۱۳) ان کی خودنوشت ان کی اس بات کی گواہی دیتی ہے۔ محفل میں جہاں انہیں کچھ کہنا بھی پڑا ہے آپ نے بڑے محتاط لفظوں میں بیان کیا ہے کہ کسی کی دلشکنی نہ ہو مگر اپنی اختلافی بات کہہ بھی گئے ہیں۔ پلاننگ میں ہونے کی وجہ سے اور پھر ایف اے او میں ہونے کی وجہ سے انہیں دنیا بھر کے سفر کرنے کا موقع ملتا رہا تاہم انہیں اس بات کی داد

دیتے ہیں کہ آپ نے ''سفرنامہ'' لکھنے کی عادت کو نہیں اپنایا نہ ہی ایسے اسفار کے بارہ میں ''مستنصر حسین تارڑیت'' دکھائی ہے حالانکہ انہیں جیسے ایک مرکزی حکومت کے عہدیدار جناب وقار بن الٰہی سرکاری دوروں پر گئے ہیں تو ان کی آرزو بھری رودادیں لکھ لکھ کر انہیں اپنی خودنوشت کا حصہ بنا دیا ہے۔

اس خودنوشت میں زیادہ تر رجال ایسے ہیں جو سب کے جانے پہچانے ہیں۔ شجاعت علی حسنی، زاہد حسین، اختر حمید خاں، نواب کالا باغ، معین قریشی، ممتاز حسن، ایف کے بندیال، ایم ایم احمد، مسعود نبی نور، مختار مسعود۔ مسعود نبی نور اور مختار مسعود تو ایران میں آر سی ڈی کے سکرٹری جنرل رہے۔ جب مختار مسعود ایران جانے لگے تو مسعود نبی نور نے ''انہیں کہا بس ایک ذرا سا کام کرنا ہے شاہ کو تخت سے اتارنا ہے'' اور مختار مسعود نے انقلاب ایران کی پوری آنکھوں دیکھی روداد قلم بند کر دی ہے۔ شفیع نیاز صاحب شاہ ایران کے زمانے میں ایران میں ایف اے او کے عہدیدار بن کر گئے اور خمینی صاحب کے انقلاب تک وہاں رہے مگر آپ نے اپنے کام سے کام رکھا۔ کہیں انقلاب ایران کے نتیجہ میں آنے والی تبدیلی کا شائبہ تک ان کی خودنوشت میں نظر نہیں آتا۔

احوال الرجال میں شجاعت علی حسنی ''ایک دن شام کو پانچ بجے ایک رپورٹ کے سلسلہ میں انہیں ملنے گیا تو وہ کچھ پریشان نظر آرہے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی (ان دنوں وزارت خوراک و زراعت کے وزرا تو علیحدہ علیحدہ تھے مگر سکرٹری ایک ہی تھے) تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا شفیع نیاز ایک شخص جس کے دو خاوند ہوں جن کا دفتر میں سامنا کرنا پڑتا ہو اور گھر پر دو بیویاں ہوں تو آپ قیافہ لگا سکتے ہیں کہ اسے دفتر میں بیٹھ کر کتنا خوش نظر آنا چاہئے'' (صفحہ ۸۳)

معین قریشی صاحب کا ذکر خیر: پہلے منصوبہ پر کام ہو رہا تھا کہ کمشن کے اکونامک سیکشن میں دو تین افسروں کی تعیناتی ہوئی ان میں ایک ''معین قریشی تھے نہایت قابل اور ذہین ارسٹوکریٹ۔'' چیئرمین نے کسی بات پر ناراض ہو کر ان کا تبادلہ ان کے سیکشن میں کر دیا مگر ان کا سیکشن ان کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ آپ نے معین قریشی سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں چیف سے یہ کہوں کہ آپ سے غلطی ہوگئی ہے اس سے درگذر کریں۔ اس پر چیئرمین نے ان کا تقرر واپس

اکیونا مک سیکشن میں کر دیا'' اس کے بعد کام بہت ہی تسلی بخش اور عمدگی سے چلتا رہا'' (صفحہ ۹۳) پھر معین قریشی انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ میں چلے گئے'' واشنگٹن میں ان سے ملتے رہے ان کی دعوتیں کرتے رہے'' مگر'' یہی معین قریشی وزیر اعظم بن کر تشریف لائے۔۔۔(میں نے ایف کے بندیال کے کہنے پر) وزیر اعظم کے دولت خانہ کے باہر رجسٹر پر اپنا نام اور پتہ لکھ دیا مگر مجھے افسوس ہے کہ ان کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں ہوا آخر ان کی نوے دنوں کی وزیر اعظمی ختم ہوئی'' (صفحہ ۱۱۶) نوے دن کی وزیر اعظمی میں وہ کس کس کو یاد رکھتے؟

ممتاز حسن صاحب کے بہت اوصاف ہم دوسروں کی زبانی سن چکے ہیں۔ ان کا فرمانا ہے:

'' ممتاز صاحب نہایت سادہ شفیق اور قابل افسر تھے کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اردو فارسی جرمن اور انگریزی پر عبور تھا آثار قدیمہ میں بڑی رغبت رکھتے تھے'' ۔۔۔ لاہور کی'' ایک میٹنگ میں پنجاب کی سکیمیں زیر غور تھیں۔ ایڈیشنل چیف سکرٹری شیخ اکرام الحق اور سکرٹری زراعت ملک خدا بخش بچہ شامل تھے'' ۔۔۔ شفیع نیاز صاحب نے وضاحت کے لئے سوالات کئے تو پنجاب حکومت کے افسران ناراض ہو گئے اور کہا'' ایسا لگتا ہے ہم شفیع نیاز کی عدالت میں بیٹھے ہیں۔'' اس پر ممتاز حسن نے کہا'' یہ سوالات پلاننگ کمشن کی جانب سے کئے گئے ہیں یہ صرف ہماری طرف سے آپ کے سامنے سوالات پیش کر رہا ہے'' اگر آپ ان کے تسلی بخش جوابات نہ دے سکے تو مجھے ڈر ہے آپ کی سکیم پاس نہیں ہو سکے گی'' اس پر دونوں حضرات کے غصہ میں کمی ہو گئی اور وہ دوبارہ تشریف رکھ کر میٹنگ میں حصہ لیتے رہے۔ یہ تھی ان کی بردباری کی مثال اور اپنے سٹاف کی قابلیت پر اعتماد'' (صفحہ ۱۱۶) شفیع نیاز صاحب یہی بات انہی لفظوں میں کتاب کے صفحہ ۹۸ پر بھی بیان کر چکے ہیں۔ اس قسم کی تکرار اور بھی دو چار مقامات پر ہوئی ہے جو پڑھنے والے کو کھٹکتی ہے معلوم دیتا ہے انہیں کتاب کے مرتب ہونے کے بعد اسے ملاحظہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔

نواب کالاباغ: جنرل ایوب نے ایک ایگریکلچرل کمیشن قائم کیا اس کے چیر مین نواب کالاباغ تھے۔ اس کمشن نے ایک رپورٹ تیار کی جو پلاننگ کمشن کے پاس بھی آئی۔ شفیع نیاز صاحب نے اس پر اختلافی ریمارک لکھے جب وہ نوٹ چیر مین جی احمد کے پاس گئے تو آپ نے فرمایا یہ رپورٹ

آپ کے دستخطوں سے واپس نہیں جائے گی کیونکہ'' اگر یہ آپ کے دستخطوں سے نواب کالاباغ کے پاس گئی تو آپ کی جان خطرہ میں پڑ جائے گی کیونکہ آپ نے ان کی کچھ تجاویز پر اتفاق نہیں کیا مگر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے'' (صفحہ ۱۰۴)

مرزا مظفر احمد: '' نہایت خاموش طبیعت کے مالک تھے اپنے کام میں مگن رہتے تھے پلاننگ کمشن کے افسران سے رابطہ کم ہی رکھتے تھے۔ سرتاج عزیز اور شاید ڈاکٹر محبوب الحق ان کے زیادہ قریب تھے۔ پلاننگ کمشن کے سکرٹری جناب قمر الاسلام نظام کی رہبری کرتے تھے۔ جناب ایم ایم احمد زیادہ دلچسپی بیرونی ممالک سے امداد کے لئے کنسورشیم کے لئے کام کرنے میں رکھتے تھے۔ اس وقت کے صدر یحیٰی خاں اور جنرل پیرزادہ جناب مرزا صاحب پر بہت اعتماد رکھتے تھے۔ اور بیشتر اقتصادی امور پر ان کی رائے لیتے تھے'' (صفحہ ۱۶۶) کمشن کے افسران سے'' رابطہ کم ہی رکھنے'' کا جملہ ازرہ تعریض لکھا گیا ہے حالانکہ ایک اچھے افسر کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنے افسران پر اس حد تک اعتماد کرے کہ بار بار انہیں بلا کر ان سے ملنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ پھر جناب قمر الاسلام بڑے قابل افسر تھے۔ وہ تو جاپان میں سفیر کے مرتبہ پر رہے اور راقم الحروف سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں وہ تو ایم ایم احمد کے باب میں رطب اللسان رہتے تھے کہ ایم ایم احمد ایک دفعہ کوئی کام سپرد کر دینے کے بعد بھول جاتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میرے کہے پر حرف بحرف عمل ہوگا۔

مسعود کھدر پوش کے بارہ میں ازرہ تعریض آپ نے اپنے ایک دوست کی بات بیان کی ہے کہ جب وہ پبلک سروس کمشن میں پیش ہوئے تو مسعود کھدر پوش کمشن میں سکرٹری زراعت کی حیثیت میں موجود تھے۔ ایک سوال پر امیدوار نے جواب دیا کہ وہ'' رینڈم سیمپل'' کے ذریعہ مفصلات کے متعلق رقبہ اور پیداوار کے تخمینہ لگانے کا کردار ادا کرے گا اس پر مسعود کھدر پوش نے سوال کیا'' یہ رینڈم کون ہے؟'' (صفحہ ۱۶۶) ایک سینئر آئی سی ایس افسر سے ایسی بات منسوب کرنا دور از کار بات لگتی ہے۔

اس کے بعد آپ نے لکھا ہے جب مسعود کھدر پوش ملتان یا ڈیرہ غازیخاں میں ڈپٹی کمشنر تھے تو لوگوں کو پنجابی میں نماز پڑھنے کی تلقین کیا کرتے تھے بلکہ عید کی نماز پنجابی میں پڑھانے کی کوشش کی تو

”لوگوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہیں تنگ و دو کرنا پڑی“ (صفحہ ۱۶۷) مسعود کھدر پوش کے باب میں شفیع نیاز صاحب نے محض سنی سنائی بات کہی ہے۔ یہ درست ہے کہ مسعود کھدر پوش نماز مادری زبان میں ادا کرنے کے مؤید تھے مگر ان جیسے آئی سی ایس افسر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ پبلک میں ایسی حرکت کرے گا جس میں رسوائی کا پہلو نکلتا ہو۔ مسعود کھدر پوش نواب شاہ میں تقسیم ملک سے قبل ڈپٹی کمشنر رہے قیام پاکستان کے بعد وہ اتنے سینئر تھے کہ ملتان میں ان کا ڈپٹی کمشنر لگنا بعید از قیاس ہے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی میں کمشنر تھے۔ پنجاب میں تو ممبر بورڈ آف ریوینیو رہے جو سکرٹری کے عہدے کا مرتبہ ہے۔

آپ جاپان تشریف لے گئے تو وہاں میز بانوں نے ”کعبے کے بیف سے ان کی تواضع کی“ (صفحہ ۱۵۰)۔ قبلہ! یہ کعبے کا بیف نہیں بلکہ ”کوبے بیف“ ہے اور کوبے ایک علاقہ کا نام ہے جو جاپان کی ساحلی بندرگاہ بھی ہے۔ اس علاقہ میں خاص طور سے ایسے بچھڑے پالے جاتے ہیں جنہیں پیدائش کے بعد سے ذبح ہو جانے تک پانی نہیں پلاتے صرف بیئر پلاتے ہیں اس لئے گوشت نرم اور رسیلا ہو جاتا ہے۔ امید ہے شفیع نیاز صاحب نے یہ رسیلا گوشت کھانے سے قبل بسم اللہ تو ضرور پڑھی ہو گی؟

۱۹۴۶ میں آپ جس جہاز سے تعلیم حاصل کرنے کو انگلستان جا رہے تھے اس میں ایک نوجوان عبدالسلام بھی تھا جس کو بعد میں ”پیس پرائز ملا“ (صفحہ ۶۰) ڈاکٹر عبدالسلام کو فزکس میں نوبل پرائز ملا تھا جو دنیا کا سب سے بڑا اور وقیع انعام ہے۔ حیرت ہے اتنے بڑے سرکاری افسر کو نوبل پرائز کے مالہ و ماعلیہ کا علم نہیں؟ پھر آپ نے اسی صفحہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ ”جہاز پر سلام کے استقبال کے لئے سر ظفر اللہ خاں آئے تھے جو اس وقت برطانیہ میں انڈیا کے ہائی کمشنر تھے کیونکہ ان میں مذہبی گہرا رشتہ تھا“۔ (صفحہ ایضاً) یہ بات درست ہے کہ سر ظفر اللہ اپنے کسی بھتیجے کو لینے جہاز پر آئے ہوئے تھے اسی جہاز سے سلام وہاں پہنچے ”سلام کے پاس بہت بھاری سامان تھا سر ظفر اللہ نے ان کا سامان اٹھانے میں ان کی مدد کی اور پھر انہیں سردی میں ٹھٹھرتا دیکھا تو اپنا ایک اوور کوٹ انہیں دے دیا جسے سلام نے عمر بھر ایک متاع عزیز جان کر اپنے ساتھ رکھا“ (میرے ابی۔ ڈاکٹر سلام کی بیٹی عزیزہ رحمان کا مضمون۔ مشمولہ مسلمانوں کا نیوٹن از زکریا ورک۔ مطبوعہ ٹورنٹو ۲۰۰۳۔ صفحہ ۵۲) مگر اس وقت سر ظفر

اللہ انڈیا کے ہائی کمشنر نہیں تھے فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے جج تھے اور برطانوی حکومت کی دعوت پر کسی اجلاس میں شرکت کے لئے انگلستان آئے ہوئے تھے۔

ایک اور غلط فہمی بھی دور کر دوں۔ وزارت خوراک و زراعت کے جائنٹ سکرٹری شیخ اعجاز احمد کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ ”سر ظفر اللہ وزیر خارجہ کے قریبی رشتہ دار تھے“ (صفحہ ۸۴) یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ شیخ اعجاز احمد علامہ اقبال کے سگے بھتیجے اور شیخ عطا محمد صاحب برادر اکبر علامہ اقبال کے صاحبزادے تھے سر ظفر اللہ سے ان کی دوستی تھی اور اعتقادی رشتہ بھی تھا مگر کوئی اور جسمانی رشتہ داری نہیں تھی۔ شیخ اعجاز احمد جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے گارڈین بھی تھے۔ سر ظفر اللہ کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے انہیں اپنی فلاحی ٹرسٹ کا رکن بنایا ہوا تھا اور وہ عمر بھر اس مرتبہ پر فائز رہے۔

اگر اس خودنوشت میں سنی سنائی باتوں پر اعتماد نہ کیا جاتا تو یہ خودنوشت واقعاتی لحاظ سے خاصی قابل اعتماد خودنوشت ہوتی کیونکہ پاکستان کی اقتصادی اور زرعی ترقی میں جناب شفیع نیاز کا حصہ ایسا نہیں کہ اسے نظر انداز کیا جائے۔ مصنف نے اتنے اعلیٰ سرکاری اور بین الاقوامی عہدوں پر کام کیا ہے اس لئے ان کی باتوں میں توثق ہونا چاہیے اور ہے۔ انہوں نے سیاست کو اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا اور یہ ایک سرکاری افسر کی شرافت کی دلیل ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خودنوشت بڑی قدر کی نگاہ سے پڑھی جائے گی۔

راہِ رواں

بانو قدسیہ کی لکھی ہوئی اشفاق احمد کی سوانح عمری ''راہ رواں'' دراصل بانو اور اشفاق احمد کی توام خودنوشت معلوم دیتی ہے کیونکہ دونوں میاں بیوی آپس میں اس طرح گندھے ہوئے ہیں کہ انہیں روایتی ''سیامی جڑواں بچوں'' کی طرح ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ ''راہ رواں'' کو سنگ میل لاہور والوں نے ۲۰۱۱ میں شائع کیا ہے۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ہمارے افسانوی ادب کے اہم نام ہیں۔ دونوں اپنی من موہنی شخصیتوں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں مقبول ومحبوب رہے مگر اشفاق احمد ریڈیو اور ٹیلیویژن کے منفرد اور ممتاز پروگراموں کی وجہ سے ''ٹیلی لٹریچر'' میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ریڈیو پران کے پروگرام تلقین شاہ اور ٹیلی وژن پران کے ڈرامہ سیریلز نے انہیں اتنی شہرت دی کہ انہیں ایک لیجینڈ بنا دیا اور کچھ ضعیف الاعتقاد لوگ انہیں عقیدت سے اور دوسرے انہیں حیرت وحسد وحسرت سے دیکھنے لگے۔

ان کی طبیعت شروع ہی سے متجسس تھی اور بانو کے قول کے مطابق ''وہ ساری عمر کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں رہے'' (راہ رواں صفحہ ۱۴۳)۔ جوانی میں وہ ''لڑکیوں کی طرح شرمیلے اور پٹھانوں کی طرح غیرت مند تھے'' (صفحہ ۱۵۳) مگر عمر بھر ساتھ نبھانے کے بعد بھی بانو کا یہی کہنا ہے کہ وہ ''میرے لئے مانوس اجنبی تھے'' (صفحہ ۷) کیونکہ ''بیوی کو اللہ نے حسد کے خمیر اور شوہر کو بے وفائی کے سوڈا بائی کارب سے گوندھا ہے'' (صفحہ ۴۶۹)

طالب علمی کے زمانہ کی رفاقت کا خلاصہ بانو نے یوں بیان کیا ہے کہ ''ہم دونوں کے بنیادی تضادات نے ہماری شخصیت پر خوف کی مہر لگا دی تھی'' (صفحہ ۵۳) اور دونوں اس غیر محسوس خوف کے

سائے میں چلتے چلتے ازدواجی رفاقت تک پہنچے۔ عمر بھر کا سفر طے کرنے کے اور اشفاق کے اٹھ جانے کے بعد بانو نے ڈرتے ڈرتے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور کہہ بھی دیا ہے کہ ''میری کتاب سچ کی دعوے دار نہیں'' (صفحہ ۱۸۷) شفو یعنی خاں صاحب اور قدسیہ چٹھہ یعنی کاکی' کی داستان قدم بقدم چلتی اشفاق اور بانو قدسیہ کی داستان بنتی ہے۔ کلاس میں پہلے روز ''ایک خوب صورت گورا چٹا اطالوی شکل وصورت کا نوجوان اندر داخل ہوا اس نے لٹھے کی شلوار نیلی لکیروں والا سفید کرتا اور پشاوری چپل پہن رکھی تھی وہ بڑی ملائمت کے ساتھ آگے بڑھا اور مردانہ قطار میں مولوی طوطا کے پاس بیٹھ گیا'' (صفحہ ۴۷) یہ گویا تعارف تھا۔ اس کے بعد اشفاق نے بانو کی توجہ حاصل کرنے کو بہت حیلے بہانے اختیار کئے۔ اشفاق نے پٹھانوں کی طرح غیرتمند ہونے کے باوجود قدسیہ سے سائیکل کے پنکچر ہو جانے کے بہانے ''دونی طلب کی'' (صفحہ ۵۱) بانو نے دے دی ''انہوں نے ہتھیلی بڑھائی دونی یوں وصول کی گویا کسی دربار سے خلعت سے نوازے گئے ہوں۔ پھر شان استغنا سے بغیر شکریہ ادا کئے لوٹ گئے۔ سفید ہتھیلی کے آگے پست سوال کی صورت بڑھنا اور بگڑے دل شہزادے کی طرح لوٹ جانا'' (ایضاً) قدسیہ چٹھہ کو آج تک یاد ہے اور یہ بھی کہ اشفاق کے اندر ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا جو بہت بعد کو تلقین شاہ اور اس کے بھی بعد بابوں سے لگاؤ اور عقیدت کی شکل میں رونما ہوا۔ بڑھاپے کی ماہیت و مالہ اور ماعلیہ پر اشفاق نے جو کچھ اپنی نوٹ بک میں لکھا ہے وہ بانو نے نو صفحات میں صفحہ ۵۴ سے ۶۳ تک درج کر دیا ہے حالانکہ کسی خودنوشت میں ایسی تفصیلات درج کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے ہاں یہ کتاب محض اشفاق کی سوانح حیات ہوتی تو ان کی طبیعت کو سمجھنے کے لئے اس بات کو تفصیل سے بیان کیا جا سکتا تھا۔ اور تو اور بانو نے کئی مقامات پر اس عادت کا ارتکاب کیا ہے۔ اشفاق کی اور اپنی امی کی خط وکتابت تمام وکمال درج کر دی ہے۔ (صفحہ ۱۱۹ تا ۱۴۵) ایک مقام پر اپنے موسیقی کے استاد کے استاد کدر پیا کی پوری کتاب درج کر دی ہے (صفحہ ۱۴۸ سے صفحہ ۱۵۹) پھر اشفاق صاحب کے اٹھ جانے کے بعد لوگوں نے جو مضامین لکھے وہ بھی شامل ہیں۔ ریاض محمود کا مضمون صفحہ ۲۵۶ سے ۲۶۹ تک پھیلا ہوا ہے۔ ہندو دیو مالا کے باب میں ۳۲۳ سے ۳۳۷ تک تفصیلات شامل ہیں غرض یہ کتاب بانو کی کتاب نہیں رہی بہت سے دوسروں کی کتاب بن گئی ہے اور ایسی تفصیلات سے مملو ہے

جن کا موضوع یعنی اشفاق اور قدسیہ سے دور کا تعلق بنتا ہے۔

مجھے خیال تھا اس خودنوشت میں ممتاز مفتی کا بہت ذکر ہوگا شہاب صاحب قدم قدم پر راستہ روکیں گے۔ ابن انشا در آئیں گے مگر اس باب میں بانو نے بڑی ہمت سے ان لوگوں کو کتاب پر حاوی نہیں ہونے دیا اور یہ بانو قدسیہ کی فنکارانہ چابک دستی ہے۔ ان کا ذکر تو ناگزیر تھا اور جہاں تہاں ہونا ہی تھا مگر ان لوگوں کے ذکر کو پیر تسمہ پانہ بننے دینا بانو کا کمال ہے۔ قاری کو حیرت اس مقام پر ہوتی ہے جہاں وہ احمد بشیر جیسے مستند بہادر نڈر اور بے خوف ادیب پر ''رشک اور حسد'' کا الزام لگاتی ہیں (صفحہ ۵۴۷) حالانکہ احمد بشیر ان سے زیادہ سینئر اور مانا جانا ادیب اور صحافی تھا۔ اسے الیکٹرانک میڈیا کی شہرت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس خاندان کی ایک بشریٰ انصاری ہی سب ٹیلیویژن والوں پر بھاری تھی۔

ہمارے ہاں کتابوں کی تقریب رونمائی میں جو کچھ لکھا اور پڑھا جاتا ہے اس کے بارہ میں بانو نے بڑی خوبصورت بات کہی ہے کہ میری کتاب امر بیل کی رونمائی ہوئی تو ''خاں صاحب، احسان اکبر، سہیل عمر اور اصغر ندیم سید نے بڑے پر مغز مضامین پڑھے اور جو خوبیاں بیان کیں وہ نہ کتاب میں تھیں نہ صاحب کتاب میں'' (صفحہ ۲۸۱) خدا معلوم احسان اکبر کی یہ لمبی ریش مبارک اس وقت تھی یا نہیں؟

بانو کو خودنمائی سے اتنا نفور ہے کہ وہ ہر بات لکھنے سے قبل سوچتی ہیں ''کہ کہیں یہ خودنمائی تو نہیں؟'' (صفحہ ۸) اگر کہیں کچھ کہا بھی ہے تو فوراً یہ بھی کہہ گئی ہیں کہ ''میری لن ترانیوں کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ہم کس قدر گنجے فرشتے تھے اور کس حد تک سفید کپڑوں میں ملبوس خوشامدی؟ شیخی خورے متکبر، خودغرض اور کسی شیطانی ٹولے کے رفیق تھے؟'' (صفحہ ۹) ''میرے آئی کیو میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ میں کوئی فیصلہ بھی تفکر کئے بغیر کر لیتی ہوں پھر اس impulsive فیصلہ کو توڑ نبھانے کے لئے صدق دل سے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتی ہوں عام طور پر اللہ میاں میری لاج رکھ لیتا ہے'' (صفحہ ۱۶۳)۔

اللہ میاں پر انہیں پکا اعتقاد ہے مگر اشفاق صاحب کے ایک چاہنے والے یحییٰ خاں صاحب ''

اشفاق کے پاؤں پر سجدہ کرتے تھے تو اشفاق برا نہ مانتے تھے'' (صفحہ ۵۰۱) مگر انہی خاں صاحب نے بانو کے پاؤں پر سجدہ کرنے کی حرکت کی تو بانو نے انہیں ٹوک دیا کہ یہ شرک ہے۔ بانو کو اپنے شوہر نامدار کو اس شرک کو قبول کر دینے پر ٹوکنے کی جرات کیوں نہ ہوئی؟ پتی ورتا ہے یا کچھ اور؟ صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی ہیں کہ ''خاں صاحب کسی اور سمت کے آدمی تھے وہ پتہ نہیں کیوں یہ گناہی بوجھ شوق سے اٹھاتے تھے'' (صفحہ ۵۰۰) پھر یہ سچ بات بھی درج ہے کہ آپ نے عمر بھر کے ساتھ میں اشفاق کو ''نمازوں اور ذکر میں زیادہ گھرے ہوئے نہیں دیکھا'' (صفحہ ۴۹۰)۔ اس حکایت درون خانہ سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ خود اشفاق احمد خان صاحب اپنے مرشدوں کو سجدہ کرتے تھے یا نہیں؟ ممتاز مفتی نے تو اپنے مرشد قدرت اللہ شہاب کے لئے ''لبیک'' لکھ دی ہے درآں حالیکہ حج کے موقع پر یہ تلبیہ صرف اللہ کے گھر کے طواف کے لئے مسنون ہے۔ اشفاق صاحب کی یہ خواہش بھی محل نظر ہے کہ ''مرنے کے بعد ان کا عرس ہوا کرے'' (صفحہ ۴۸۹) یہی وصیت ممتاز مفتی کی تھی (صفحہ ۵۱۳) ذاتی مسلک کے عنوان سے بانو نے ایک پورا باب ان کے معتقدات کے باب میں باندھا ہے اور ان کا یہ قول بھی درج کیا ہے کہ ''ہمارے گھر کو چاہیے ہر وقت سجدے میں رہے وہ کون سی نعمت ہے جو رب نے ہمیں نہیں دے رکھی۔ ہم اس سے اور کیا تقاضا کریں قدسیہ؟'' (صفحہ ۴۲۲) تس پر اپنے پاؤں پر سجدہ کروانا؟

اشفاق احمد خاں شہاب صاحب کی ایک جنبش قلم سے ۱۷ جون ۱۹۶۷ کو اردو سائنس بورڈ کے بیسویں گریڈ کے ڈائریکٹر جنرل بنا دئے گئے (صفحہ ۲۵۶) اور بینظیر کے پہلے عہد تک اس عہدے پر فائز رہے۔ بانو کو شہاب صاحب نے شاکر علی میوزیم کا ڈائریکٹر بنانے کا عندیہ دیا تو اشفاق نے بلطاف الحیل بانو کو منع کر دیا۔ اشفاق احمد اتنے تو ناشکرے نہیں ہو سکتے کہ اپنے محسن کا احسان بھول گئے ہوں؟ اس احوال میں اتنا ہی مذکور ہے کہ عفت بیمار تھیں تو اشفاق نے انہیں اپنے گھر میں مہمان رکھا اور بابا جی نور والے سے ان کا علاج بالغذا کرواتے رہے جو شخص خود کو سجدہ روا جانتا ہو وہ محسنوں کو کیسے بھول سکتا ہے؟ بانو کی صدق بیانی سے قاری کو یہ توقع ضرور تھی کہ وہ اس باب میں زیادہ لکھتیں۔

احوال الرجال میں شہاب صاحب۔ ممتاز مفتی ابن انشا اور رنگ برنگ کے بابوں کا ذکر تو ہے

ہی اپنے اساتذہ کا ذکر بھی بانو نے بڑے احترام سے کیا ہے پروفیسر غلام محی الدین اثر صاحب سے ہم نے بھی اکتساب فیض کیا ہے اس لئے اپنے استاد کے بارہ میں کچھ نئی باتیں بھی ہم نے جانی ہیں ''اثر صاحب مدراس میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ لیکن مہاجر بن کر یہاں آ گئے۔ اور اپنی ڈپٹی کمشنری کا رعب کبھی نہ جھاڑا۔ اثر صاحب آئی سی ایس تھے لیکن ان میں وہ شیخی اور خو بو نہ تھی جو عموماً اس کلاس میں ہوتی ہے'' (صفحہ ۴۸)۔ قبلہ اثر صاحب کی زندگی کا یہ پہلو ہم سے پوشیدہ تھا۔ بانو آپ کا شکریہ۔ اثر صاحب پر یہ الزام لگا کر کہ آپ اقبال کے اور پاکستان کے خلاف ہیں ان کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور سے بطور سزا بہاولنگر کے انٹرمیڈیٹ کالج میں کر دیا گیا تھا۔ اثر صاحب اس آزمائش سے بھی گذرے تھے۔ اور آخر آخر سول اینڈ ملٹری گزٹ ہی کے ہو کر رہ گئے تھے۔

بانو کی طبیعت کی فروتنی کی ایک گواہی ہمارے پاس ہے۔ ماڈل ٹاؤن میں بانو سر ظفر اللہ کی بیٹی کے ہمسائے میں تھیں ''سر ظفر اللہ کی کوٹھی ہمارے آنے تک ان کی بیٹی کی ملکیت بن گئی تھی۔ لیکن وہ لندن میں رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ پاکستان آتی اور ربوہ جاتی تو ان کی طرف سے محبت اور بھائی چارے کا بھرپور مظاہرہ ہوتا۔ ایک بار وہ مجھے ربوہ بھی لے گئی جہاں میں نے کالج کے ایک بڑے فنکشن میں شمولیت کی'' (صفحہ ۲۹۳)۔ یہ فنکشن کوئی معمولی فنکشن نہیں تھا گورنمنٹ جامعہ نصرت کالج کی کانووکیشن تھی جس میں بانو نے خطبۂ تقسیم اسناد دیا تھا۔ بانو قدسیہ نے اپنی انکساری میں اتنے بڑے اعزاز کو محض ایک معمولی رنگ دے دیا ہے حالانکہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ کسی کالج کا جلسۂ تقسیم اسناد کوئی معمولی تقریب نہیں ہوتی اور کسی معمولی شخصیت کو ایسے جلسوں میں خطبۂ اسناد پڑھنے کے لئے مدعو نہیں کیا جاتا۔ ہمیں بانو قدسیہ کی یہ فروتنی بہت خوش آئی ہے اس لئے خاص طور سے اس بات کا ذکر کر رہے ہیں۔

غرض راہ رواں اشفاق کی خوبصورت سوانح عمری اور بانو کی اس سے بھی زیادہ بامعنیٰ خودنوشت ہے مگر اس میں حمیدہ اختر حسین کی خودنوشت ہمسفر جیسا خلوص اور بے تکلفی نہیں غالباً بانو پر اشفاق کے اندر بیٹھے ہوئے بابے کا خوف زیادہ طاری رہا جس نے انہیں ان کے معتقدات پر قطعیت سے اظہار رائے کرنے سے روکے رکھا۔ بایں ہمہ یہ کتاب بانو قدسیہ کے اسلوب تحریر کا عمدہ نمونہ ہے جو

قاری کو انگلی پکڑ کر اپنے پسند کے رستوں پر لئے چلتا ہے۔

اتفاق یوں ہے کہ احمد بشیر کی بڑی صاحبزادی نیلم احمد بشیر کینیڈا کے راول ٹی وی کے ادبی پروگرام چہرے میں بطور مہمان تشریف لائیں۔ میں اس پروگرام کا میزبان ہوں میں نے نیلم سے بانو قدسیہ کی کتاب کا ذکر کیا اور ان سے پوچھا کہ بانو آپا نے احمد بشیر کے ذکر میں کچھ زیادتی نہیں کی؟ آپ اس باب میں کیا کہتی ہیں۔ نیلم نے کہا بہت اچھا ہوا کہ آپ نے یہ سوال پوچھ لیا بانو آپا نے ہمارے خاندان کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت سے بعید ہے۔ نہ ابا کے بارہ میں ان کی باتیں درست ہیں نہ میرے بارہ میں اور نہ ہی پروین عاطف کے بارہ میں۔ میں اس کتاب کے چھپنے کے بعد ان سے ملی تھی بانو آپا نے یہ کہا کہ انہیں کچھ یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کچھ لکھ دیا ہے کیونکہ اب ان کی یادداشت جواب دے گئی ہے۔ مزید برآں بانو آپا نے تحریری طور پر سارے خاندان سے معافی چاہی ہے اور اپنی باتوں پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔ یہ تحریری معذرت نامہ نیلم کے پاس موجود ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ یہ باتیں اپنے قارئین کے علم میں لانے کو یہاں درج کر دوں۔

❁

داستاں میری

پٹنہ کالج کے سابق پرنسپل، ممبر بہار پبلک سروس کمشن اور مشہور عالم خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر اقبال حسین کی خودنوشت ''داستاں میری'' ۱۹۸۹ میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کی جانب سے پہلی بار چھپی ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے ۱۹۸۶ میں یہ خودنوشت لکھنا شروع کی تھی گویا ڈاکٹر صاحب نے یہ خودنوشت رواروی میں نہیں لکھی بلکہ سوچ سمجھ کر باقاعدہ ایک تحقیقی منصوبہ کے مطابق تحریر کی ہے۔ کتاب کے آغاز میں خاندان نیورہ کی تاریخ اور بزرگوں کے حالات رقم ہیں اور کتاب کے اواخر میں خاندان نیورہ کے ان چھ ممتاز افراد کا ذکر خیر ہے جو ہائی کورٹ کے جج کے مرتبہ تک پہنچے۔ جسٹس سید شرف الدین، جسٹس سر سید علی امام، جسٹس سید حسن امام، جسٹس سید جعفر امام، جسٹس سید نقی امام اور جسٹس سید وصی الدین! گویا ایں ہمہ خانہ آفتاب است کا مضمون ہے۔ نواب امداد امام اثر اسی خاندان کے بزرگوں میں تھے۔ سید علی امام اپنے وقت کے مشہور قانون دان تھے گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کی نمائندگی کا شرف بھی انہیں حاصل ہوا اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست حیدر آباد کے صدر اعظم یعنی وزیر اعظم بھی رہے۔ اور یہ امتیاز بھی انہیں نصیب ہوا کہ ان کے دو بیٹے بھی ہائی کورٹ کے جج کے مرتبہ تک پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب نے خودنوشت کے سر آغاز کے طور پر داغ کا شعر درج کیا ہے کہ ''سناؤں کس کو جو کچھ عمر بھر آنکھوں نے دیکھا ہے۔ کہ طولانی بہت اے داغ ہے یہ داستان میری'' اور تقریباً پانچ سو صفحات کی یہ داستان طولانی بھی ہے اور معلومات افروز بھی۔ نہ صرف ان کے اپنے خاندان کی تاریخ درج ہے بلکہ بہار کے شرفاء کے رہن سہن اور تمدن و معاشرت کی تاریخ بھی ان کی نگاہ باریک بیں

سے اوجھل نہیں ہوئی۔ ''ہندو اور مسلمان شرفاء کا شعار تھا کہ اپنے گھروں سے بہت کم آیا جایا کرتے تھے۔ بازاروں اور گلی کوچوں میں آنا جانا کسر شان سمجھتے تھے اگر بالفرض کسی وجہ سے نکل پڑے تو عام لوگوں سے گفتگو کرنے کا کیا ذکر اپنے دوستوں سے بھی بہت کم ہم کلام ہوتے تھے اور ضروری کاموں سے فراغت کے بعد فوراً گھروں کو لوٹ جاتے تھے کیونکہ شرفا کا عام ذہن یہ بن چکا تھا کہ اس سے زبان اور طرز معاشرت میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔۔۔۔ عوام الناس محنتی سادہ لوح اور قوانین و ضوابط کے پابند تھے۔۔۔۔ مسلمانوں کی شان و شوکت اور مال و دولت انگریزوں کی بے ایمانی اور دست درازی کی نذر ہو چکی تھی۔۔۔۔ دیوالی اور محرم ہندو اور مسلمان دونوں مل کر مناتے تھے راقم نے اس منظر کی ایک دھندلی سی جھلک جنوری ۱۹۱۹ میں دیکھی تھی لیکن دسمبر ۱۹۸۱ میں جب راقم کو آخری بار مظفر پور جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ ان قدیم روایات سے مظفر پور کو کوئی واسطہ نہیں رہا وہ تمام چیزیں ختم ہو چکی ہیں اس کے برعکس اب یہ شہر بنیوں بقالوں اور سیاست دانوں کا اڈہ بن گیا ہے''
(داستاں میری صفحہ ۴)

ڈاکٹر صاحب نے خاندانی نظام کے خاتمہ کا بہت نوحہ کیا ہے اور یہ تک لکھ دیا ہے کہ ''افسوس کہ آج کل کے بہت سے نوجوان اپنے دادا کے نام سے بھی واقفیت نہیں رکھتے'' (صفحہ ۳۹) اس پر ہمیں امریکی مزاح نگار مارک ٹوین یاد آ رہا ہے اس کے زمانہ میں کسی فرانسیسی اخبار نویس نے طعنہ دیا کہ امریکن عجیب قوم ہیں ان میں سے ہر تیسرے آدمی کو اپنے دادا کا پتہ نہیں ہوتا۔ مارک ٹوین نے جواب دیا امریکی پھر بھی ان سے بہتر ہیں کیونکہ ہر دوسرے فرانسیسی کو تو اپنے باپ کا بھی پتہ نہیں ہوتا۔

اس بحث سے قطع نظر ہمیں تو اس خودنوشت سے کئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اردو کی پہلی ناول نگار خاتون رشیدۃ النساء ان کی نانی تھیں (صفحہ ۱۷)۔ رشیدۃ النساء کا ناول ''اصلاح النساء'' نذیر احمد کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا اور عورتوں کی معاشرت کی اصلاح کے خیال سے لکھا گیا تھا۔ اصلاح النساء کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۴ میں پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ رشیدۃ النساء نواب امداد امام اثر کی بہن تھیں۔

مشہور عالم خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ کے باب میں یہ بات بھی ان کی نانی اماں کی زبانی سنئے۔ فرماتی تھیں ''خدا بخش لائبریری کی جتنی نادر کتابیں ہیں اکثر و بیشتر چوری کر کے منگائی جاتی

تھیں۔خود خدا بخش خاں صاحب کا قول ہے کہ ''کتابوں کے جمع کرنے کا ہنر تعزیرات ہند کے قانون کے بالاتر ہو جاتا ہے اور اس کو للکارتا ہے''

جب انہیں کسی نادر اور عمدہ کتاب کا سراغ ملتا تو پہلے اسے عاریتاً یا قیمتاً لینے کی کوشش کرتے ناکامی کی صورت میں وہ کسی شخص سے اس کتاب کو چوری کرا کر منگا لیتے۔ جب ایسی کتابیں دستیاب ہو جاتیں تو اپنے گھر پشتہ والے مکان سے ان کتابوں کو ٹوکری میں رکھ کر اوپر سے کچھ کھانے پینے کی چیزیں رکھوا کر نانی مرحومہ کے گھر سبزی باغ نوکروں سے بھجوا دیتے اور تحفظ کے خیال سے خود پالکی پر آتے نانی موصوفہ اپنے نوکر کو کہتیں کہ دیکھو جو تحفہ کی ٹوکری خدا بخش کے یہاں سے آئی ہے پلنگ پر رکھ دو نوکر رکھ دیتا فرصت اور تنہائی کے وقت نانی ان کتابوں کو چھپا کر رکھ دیا کرتی تھیں خان بہادر خدا بخش کبھی کبھی تو ان کتابوں کو چار یا چھ ماہ کے بعد جب کہ گرفت کے امکانات ختم ہو جاتے تو منگوا لیتے یا خود آ کر لے جاتے۔'' (صفحہ۷۲) یہاں یہ بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے کہ خان بہادر خدا بخش خاں حیدر آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ان کے تقرر کا قصہ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنی خود نوشت میں مزے لے لے کر بیان کیا ہے (میری داستان صفحہ ۳۴)۔مولوی خدا بخش خاں صاحب سے قبل فرحت اللہ بیگ کے پھوپھا نواب سربلند جنگ چیف جسٹس تھے انہوں نے فرحت اللہ بیگ کو اپنے ہاں کوئی ملازمت دینے سے انکار کر دیا تھا ناگہاں نواب سرور جنگ کی سفارش پر مولوی خدا بخش خاں میر مجلس یعنی چیف جسٹس بن کر وارد ہو گئے اور نواب سربلند جنگ کی سربلندی دھری کی دھری رہ گئی۔ یہ بات بھی کہہ دوں کہ نواب سربلند جنگ کی ایک صاحبزادی قدسیہ بیگم ہمارے پاکستان آرمی کے پہلے جرنیل جنرل اکبر خاں رنگروٹ کی اہلیہ محترمہ تھیں (میری آخری منزل خود نوشت جنرل اکبر خاں صفحہ ۵۲) خان بہادر خدا بخش خاں کا تعلق سبزی اگانے والے قبیلہ سے تھا اس لئے سید اقبال حسین نے خمسہ ء چقندری کے نام سے پروفیسر عبدالغفور شہباز کا لکھا ہوا خمسہ بھی تمام وکمال درج کر دیا ہے جو خوب ہے مگر یہاں مکمل خمسہ کے درج کرنے کا کوئی محل نہیں۔عنوان ہے ''انسانی سرسبزی پر نباتاتی دنیا میں فطرتی شادمانی'' اس کا پہلا بند یوں ہے:

''نہ ہو حیدر آباد کیوں شادماں۔ کہ سرسبزیء عدل کا ہے سماں۔

ہے فالیز میں خوش دلی کا سماں۔ ملی خربزے کو چھری سے اماں۔

ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں'' (صفحہ۸۴)

ہمارے ہاں تو ریڈیو کے نظام دین کو ایک بے ضرر سا فقرہ کہہ دینے کی پاداش میں اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے تھے کہ ''جب سبزیاں اگانے والے کرسیوں پر جا براجیں تو پیاز کو مہنگا ہونا ہی ہوگا'' ۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز خوش قسمت نکلے کہ ہمارے ''دورِ زیاں'' میں پیدا نہ ہوئے ورنہ اپنے خمسہ ء چقندری کی پاداش میں نہ جانے کتنے کوڑوں کی سزا پاتے۔ہم تو خان بہادر خدا بخش خاں کے ممنون احسان ہیں کہ ان کی محنت و مشقت سے ایک نایاب لائبریری وجود میں آئی اور اب تک صدقہ ء جاریہ کے طور پر ان کے فیض کو عام کر رہی ہے۔اور حکومت بھی اس کی قدر دان ہے۔ ''ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو خدا بخش لائبریری میں آئے اور اس کے بانی کی قبر پر پھول چڑھائے'' (صفحہ۱۸۹) ہمارے سربراہان مملکت کو لائبریریوں میں جانے کی فرصت کہاں؟

آزادی کے بعد کی باتیں کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ انگریزوں کے دور میں ''بہار کے مسلمانوں کے لئے ۱۵ سے ۲۰ فیصد تک نشتیں مخصوص تھیں ۔۔۔ہم لوگوں کے زمانہ میں بھی بہار کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کو ڈپٹی کلکٹری منصفی وغیرہ کی جگہیں مل جایا کرتی تھیں مگر۔۔۔اب مسلمانوں کو اتنی ملازمتیں بھی نہیں دی جا رہی ہیں جن کے وہ آبادی کے لحاظ سے حقدار ہیں'' (صفحہ ۱۳۳) ادھر ''پیر موہانی کے قبرستان کا عالم یہ ہے کہ اس قبرستان میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقے کے مردے دفن کئے جاتے ہیں'' (صفحہ۱۹۵) یعنی مرنے کے بعد برابری کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ہریجنوں کے ساتھ برابری کی صورت یہ ہے کہ ''گاندھی جی کی یاد میں پرارتھنا کے بعد ایک ہریجن طالب علم نے ''پھڑھی'' (اسے تبرک کہہ لیجئے) تقسیم کی دو برہمن اساتذہ نے ہریجن کے ہاتھ سے لینا قبول نہ کیا'' (صفحہ۱۹۹)۔

اب کچھ دلچسپ باتیں۔ سید نجم الدین ریاست بتیا کے دیوان تھے ایسے حسن پرست تھے کہ ایک بدشکل ریل والے سے ٹکٹ خریدنے سے انکار کر دیا کہ میں ایسے بدشکل آدمی سے ٹکٹ بھی خریدنے کا روادار نہیں (صفحہ۱۰) مسٹر وشنت رائے وائس چانسلر عقیدت کے اظہار کے لئے ''میز پر اپنے گورو

کے نقش پا کا فوٹو رکھتے تھے" (صفحہ ۲۳۳) علی گڑھ کے نامور پروفیسر ہادی حسن کا تعلق شیعہ فرقہ سے تھا مگر جب انہیں مدرسہ بورڈ کا نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی کا رکن بنایا گیا تو معلوم ہوا انہیں فقہ جعفریہ سے کوئی واقفیت نہ تھی (صفحہ ۲۸۱) ڈاکٹر عظیم الدین احمد (والد محترم کلیم الدین احمد) سری کرشن کو اپنے وقت کا اوتار (ہادی) سمجھتے تھے" (صفحہ ۳۶۶) شہنشاہ جارج پنجم کی وفات ہوئی تو پٹنہ کی مساجد میں ان کے لئے دعائے مغفرت کی گئی (صفحہ ۱۵۲) مدرسہ بورڈ کے امتحانات میں نقل کرنے والوں نے "احادیث اور تفاسیر کے اوراق بیت الخلا میں چھپا کر رکھے ہوئے تھے" (صفحہ ۲۷۹)

جسٹس جعفر امام کو رہنے کے لئے جو مکان دیا گیا وہ سانپوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی بیگم نے بہت واویلا کیا کہ انہیں کوئی اور مکان دیا جائے مگر انتظامیہ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس پر انہوں نے سپیرے بلوائے اور بہت سے زہریلے سانپ پکڑوا کر ایک جالی دار بکس میں بند کر کے وزیر تعمیرات کے گھر بھجوا دئے کہ ہم تو ان سے بہت مستفیض ہو چکے اب آپ کی باری ہے (صفحہ ۴۷۳) محکمہ تعمیرات فوراً حرکت میں آ گیا۔

احوال الرجال میں پروفیسر عبد القادر کا ذکر خیر ہے کہ وہ قادیانی جماعت کے پرجوش مبلغ رہے (صفحہ ۵۳) یہ بات ہم نے پہلی بار جانی ہے کہ آپ فارسی کے نامور سکالر تھے۔ ان کے نواسے اور ہمارے دوست مرزا حنیف احمد نے فارسی کا ورثہ اپنے نانا سے پایا ہے۔ آپ کے صاحبزادگان پروفیسر عباس بن عبد القادر اور ڈاکٹر عقیل بن عبد القادر سے تو ہم شناسا تھے کیونکہ دونوں کو احمدی ہونے کی وجہ سے شہید کیا گیا تھا۔ پھر شمشاد علی خاں آئی سی ایس کا ذکر ہے (صفحہ ۵۷) شمشاد علی خاں سر ظفر اللہ خاں کے خسر تھے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی کا ذکر ہے (صفحات ۱۵۲۔۱۵۵۔۲۰۹) سر سید علی امام کا ذکر ہے، سر حسن امام کا ذکر ہے۔ جناب یوسف امام کا ذکر ہے مگر ہم نے یہ تینوں نام تحدیث نعمت میں پہلے سے پڑھے ہوئے تھے۔ یوسف امام صاحب کا ذکر "میری تعطیلات شروع ہو گئیں اور میں سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس سفر میں میرے رفیق مسٹر یوسف امام تھے۔ مرزا پور یوپی کے رہنے والے تھے مزاج امیرانہ تھا۔۔۔ ہندوستان واپسی پر کھدر پوشی اختیار کر لی مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔۔۔ کولون میں شام کے وقت دریا کا منظر بہت دلفریب ہوتا ہے ہم دریا کے کنارے جا رہے تھے اور بجلی

کی روشنی میں دریا کا لطف اٹھا رہے تھے کہ مسٹر یوسف امام یکلخت رک گئے اور کہا بھائی کہاں جاتے ہو؟ میں نے کہا کہیں خاص تو نہیں بس دریا کی سیر ہی مقصود ہے کہنے لگے سیر تو ہو گئی بس دیکھ لیا پانی ہے اور بہہ رہا ہے اب واپس چلیں" (تحدیث نعمت صفحہ ۹۷) سر حسن امام تو ترک موالات کے سلسلہ میں وکالت ترک نہ کرنے پر ظفر علی خاں کی ایک نظم کا موضوع بھی بنے جو ۲۰ فروری ۱۹۲۲ کے زمیندار میں چھپی:

وہ کون ہے جو نہیں آجکل اسیرِ فرنگ؟ ۔ سی آر داس نہیں یا ابو الکلام نہیں؟
بہ حیرت اس پہ کہا ایک دوست نے مجھ سے ۔ کہ اس گروہ میں شامل حسن امام نہیں۔
اگر حرام موالات مجھ غریب پہ ہے ۔ تو ایسے چوٹی کے لیڈر پہ کیوں حرام نہیں؟
کہا یہ دوست سے میں نے وہ مرغ دانا ہیں ۔ حریصِ دانہ ہیں لیکن حریصِ دام نہیں
نہیں یہ قائد قوم اپنی قید کا قائل ۔ "شمار دانہ تسبیح میں امام نہیں" (صفحہ ۴۷)

ڈاکٹر اقبال حسین صاحب کی یہ خودنوشت بہار کے مسلمانوں کی مستند تاریخ کے حوالے سے یاد رکھی جائے گی۔

بلا جواز

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی خود" اپنے بارہ میں" لکھی ہوئی کتاب "بلا جواز" الوقار پبلیکیشنز واپڈا ٹاؤن لاہور کی طرف سے ۲۰۰۹ میں چھپی اور اب مجھ تک پہنچی ہے۔ تاخیر سے پہنچنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ کتاب بہت "بھاری" ہے۔ کاغذ بھی دبیز ہے اور جلد اس سے بھی زیادہ دبیز اور سخت۔ میرے دیرینہ کرمفرما دوست نے خرید تو تب ہی لی تھی جب میں نے انہیں لکھا تھا کہ فرمان صاحب کی خودنوشت چھپی ہے حاصل کر لیں۔ حاصل کرنے کے بعد ان کا پیغام آیا کہ یہ کتاب تو کسی ایسے آدمی کے ہاتھ بھیجنا پڑے گی جو دیگر سامان سے خالی ہو ایسا "فارغ السامان" ڈھونڈے سے نہیں ملتا خیر کتاب کل ہی مجھ تک پہنچی ہے اور میں نے شوق کے ہاتھوں اسے لیا اور اس سے بھی زیادہ اشتیاق سے اسے پڑھا ہے۔ میرا اصول ہے کہ میں کسی خودنوشت کا مطالعہ کرنے سے قبل دوسروں کے یا مصنف کے اپنے لکھے ہوئے تبصرے یا شذرے نہیں پڑھتا۔ کتاب الف سے یے تک پڑھنے کے بعد اگر محسوس کروں کہ مجھے صرف اپنی رائے پر انحصار نہیں کرنا چاہئیے دوسروں کی رائے بھی دیکھ لینی چاہئیے تو پڑھتا ہوں ورنہ اپنا تبصرہ خواہ میرے مرحوم دوست شیخ منظور الٰہی کے لفظوں میں "تشنیع و توبیخ" پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو چھپنے کو بھیج دیتا ہوں اور اس کی اک نقل صاحب کتاب کو اگر اس کا پتہ دستیاب ہو ضرور بھیجتا ہوں۔

فرمان صاحب کی کتاب کے سلسلہ میں یہ اصول مجھے توڑنا پڑا کیونکہ ان کا ارشاد تھا کہ "اپنے بارے میں ہونے کے باوصف یہ خودنوشت نہیں ہے۔ خودنوشت کے طور پر لکھنے کے لئے میرا ذہن کبھی آمادہ نہیں ہوا وجہ یہ ہے کہ اردو کی خودنوشتوں کے بارہ میں میری رائے کچھ اچھی نہیں ہے" (بلا

جواز صفحہ ۸) میں ٹھٹک گیا اور پہلے ان کا وہ شذرہ پڑھا جو آپ نے اردو کی خودنوشتوں کے باب میں لکھا اور کتاب کے اواخر میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا دعویٰ ہے کہ "اس وقت تک اردو میں جتنی خود نوشتیں لکھی گئی ہیں میری نظر سے گذری ہیں" (صفحہ ۳۹۶) اس لئے آپ نے اس مفروضہ کی بنیاد پر بتایا ہے کہ اردو کی خودنوشتوں میں کیسی کیسی بے اعتدالیاں اور کمزوریاں ہیں۔ پھر خود ہی سوال کیا ہے کہ آخر ایک معیاری خودنوشت میں کیا ہونا چاہئیے جواب یہ ہے مذکورہ بالا بے اعتدالیوں کے سوا سب کچھ ہونا چاہئیے۔ (صفحہ ایضاً)۔ اردو کی خودنوشتوں کے بارہ میں راقم الحروف کی کتاب "پس نوشت" (مطبوعہ لاہور ۲۰۰۳) پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر داؤد رہبر صاحب نے بھی یہی فرمایا تھا کہ چاہیے کہ صاحب کتاب خود خودنوشت لکھ کر دکھائیں کہ اچھی خودنوشت کیسی ہوتی ہے۔ (پس نوشت اور پس پس نوشت۔ صفحہ ۲۱)۔ اس صراحت کے باوجود ان کی خودنوشت آئی ہے مگر آپ نے اس کو خودنوشت کہنے سے گریز کیا ہے کیا اسے خودنوشت نہ کہہ کر ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب اس "بلا جواز" خودنوشت کے اندر در آنے والی "بے اعتدالیوں" سے بری الذمہ ہو پائیں گے؟ ان کا فرمانا ہے کہ بعض خودنوشتوں میں "خودنوشت کے لائق کسی قسم کا کوئی مواد سرے سے ہوتا ہی نہیں اس نوع کی خودنوشتیں عموماً ان اہلِ قلم کی ہوتی ہیں جن کے حالات زندگی یا تجربات میں حقیقتاً کوئی ایسی قابل توجہ بات ہوتی ہی نہیں جو بیان کرنے کے لائق ہو" ------ "اس قسم کی خودنوشتوں کا پیٹ بھرنے کے لئے عام طور سے ادبی کانفرنسوں سیمیناروں مذاکروں مشاعروں کی مفصل رودادوں کا اندراج کیا جاتا ہے"۔ (صفحہ ۳۹۳)۔

"بلا جواز" میں نہ صرف "بسلسلہ جشنِ فرمان" امریکہ اور کینیڈا کی کانفرنسوں کی مفصل رودادیں درج ہیں بلکہ بعض مقامات پر تو دوسروں کی لکھی ہوئی رپورٹیں بھی زینت قرطاس ہیں اور کم وبیش چالیس پچاس صفحوں کو محیط ہیں۔ فرمان صاحب نے اپنی شاعری پر ڈاکٹر اے بی اشرف کا لکھا ہوا طویل مضمون تک درج کر دیا ہے (صفحہ ۸۸ تا ۱۱۳) جناب نیاز فتحپوری "نگار" کے سلسلے میں قمر زمانی بیگم اور طاہرہ دیوی شیرازی کے معموں کی مکمل تفصیل بیان کرنے کے حق میں نہ تھے پھر بھی آپ نے درج کر دی ہے (صفحہ ۱۷۱ تا ۱۸۱) فرمان صاحب اس بارے میں کیا فرمائیں گے؟ میرے منہ

میں خاک کیا فرمان صاحب کے ہاں بھی خودنوشت کے لائق مواد کی کمی تھی؟

باایں ہمہ ''بلاجواز'' از بسکہ مصنف کے نزدیک ان کی خودنوشت نہیں اس میں انہوں نے اعتراف فرمایا ہے کہ ان کے لئے ''پوری سچائی تو کیا نصف سچائی کے ساتھ تصویر کا دوسرا رخ دکھانا ممکن نہیں'' (صفحہ۹) اس اعتراف کی موجودگی میں ان کی خودنوشت کا جائزہ لیتا ہوں۔ فرمان صاحب نے ''میں'' سے شعوری طور پر اتنا پرہیز کیا ہے کہ کتاب کے پہلے پچاس صفحات میں ان کا اسم گرامی دلدار علی ہی مذکور نہیں ہوا۔ نہ ساری کتاب میں کہیں ان کے سن پیدائش کا اتا پتا ملتا ہے۔ پہلی بار ان کی شادی کے منظوم کارڈ میں ان کا نام دلدار علی فرمان لکھا ہے اور کارڈ ان کے اور ان کے برادر بزرگ کے مشترکہ زور قلم کا نتیجہ ہے ورنہ فرمان صاحب ''شعر و ادب کو شوق فضول'' (صفحہ۶۰) سمجھتے تھے۔ آپ سکول میں حساب میں اتنے لائق تھے کہ امتحان کی کاپی پر لکھا ہوتا تھا کوئی سے سات سوال حل کیجئے اور فرمان صاحب جوابی کاپی پر لکھ دیتے تھے ''کوئی سات سوالات دیکھ لیجئے'' (صفحہ۸۶ مکرر صفحہ۱۳۴) آپ نے اپنا شجرہء نسب درج کرنے کے بعد اپنے باب میں یہ لکھا ہے کہ کہ میں ''فطرۃً آدمی ہوں، تادیباً انسان ہوں، مذہباً مسلمان ہوں، نسبتاً سید ہوں، مسلکاً حنفی ہوں، مشرباً بریلوی ہوں، عقیدۃً مؤحد ہوں، ذوقاً شاعر ہوں مزاجاً صوفی ہوں'' (صفحہ۶۳) ایک بات ہم ایزاد کئے دیتے ہیں کہ فرمان صاحب اول و آخر پاکستانی ہیں اس کا ثبوت ان کے دورہء ہندوستان کے دوران ملتا ہے جہاں میزبانوں نے ان سے کہا تھا کہ ''آپ پہلے پاکستانی مہمان ہیں جو اول و آخر پاکستانی معلوم ہوتے ہیں'' (صفحہ۲۵۲) حالانکہ شان الحق حقی صاحب اور ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی صاحب بھی ان کے شریک سفر تھے۔

ان کے اجداد جنگ آزادی میں سرگرم رہے بعض کو سر عام پھانسی کی سزا ہوئی۔ بعض ہم وطن دوسرے اکابر کے ہمراہ جد و جہدِ آزادی میں شریک رہے۔ ان کے وطن کوڑا جہاں آباد کے ''حکیم نصرت حسین مولانا محمود حسین کے ساتھ مالٹا میں اسیر رہے'' (صفحہ۱۵) راقم الحروف نے ازراہ تجسس مولانا حسین احمد مدنی کا سفرنامہ مالٹا دیکھا کہ فرمان صاحب نے بھی کئی دوسرے نام نہاد ''محقق خود نوشت نگاروں'' کی طرح بے پر کی تو نہیں اڑائی۔ مگر مدنی صاحب کے ہاں مذکور ہے کہ ہمارے

ساتھیوں میں کوڑا جہاں آباد کے ''حکیم نصرت حسین تھے۔ صرف وہی انگریزی بول سکتے تھے'' (سفر نامہ اسیر مالٹا صفحہ۱۰۷) اس لئے انگریزوں کے ساتھ انہی کی وساطت سے گفتگو ہوتی تھی۔ ان کی حکمت و طبابت کی وجہ سے افسران بھی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرمان صاحب نے محض سنی سنائی باتیں درج نہیں کیں باقاعدہ تحقیق کر کے باتیں لکھی ہیں۔

ہمیں تو ان کی یہ بات بھی خوش آئی کہ ان کے ایک دلی دوست کا نام فرمان تھا جن کا انتقال ہو گیا تو سید دلدار علی نے ان کے نام کو اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ اس سلسلے میں بڑے مزے کا فقرہ آپ نے لکھا ہے کہ ''انہی کا نام زندہ ہے مجھے تو کوئی جانتا بھی نہیں'' (صفحہ۳۷) مشفق خواجہ کے احوال میں بھی خوب بات آپ نے لکھی ہے کہ ''مشفق خواجہ اور میں اتنے قریب ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی تعریف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے'' (صفحہ۷۸) غالباً مشفق خواجہ کے خودنوشتوں میں توغل کے پیش نظر آپ کو بھی خودنوشتوں کے دیکھنے کا موقع ملتا رہا ہوگا۔ عین ممکن ہے آپ نے مشفق خواجہ کا ایم اے کا مقالہ جو اسی موضوع پر تھا ملاحظہ بھی فرمایا ہو۔

''سلسلہء نالش و مقدمات'' والے باب میں آپ نے اپنے ایک رفیق کار کے قریبی عزیز کا ذکر کیا ہے جو ٹریفک پولیس میں ایس پی تھے۔ اور ان کا شمار بہت دبنگ اور مشہور افسران میں ہوتا تھا اصغر ان کا اسم گرامی تھا۔۔۔۔ وہ بہت سخت گیر افسر تھے۔ اور مختلف صوبوں میں رہے اتفاق یوں ہے کہ اصغر نام کے ایک پولیس افسر پنجاب کی تاریخ میں بلکہ نواب کالاباغ کے عہد کی تاریخ میں بہت سخت گیر سمجھے جاتے تھے اور عرفاً انہیں ہلاکو خاں کہا جاتا تھا۔ پنجاب کے ایک آئی جی پولیس نے ان کے باب میں لکھا ہے ''مجھے بطور آئی جی پنجاب جو سب سے بڑا پرابلم تھا وہ اصغر خاں ہلاکو خاں تھا وہ اپنی طبیعت کا آدمی تھا سیاست دان زیادہ ہے پولیس افسر کم ہے۔ اس کی طبیعت میں سختی ہے جرائم پیشہ لوگوں پر اس کا رعب شعب ہے'' (جو میں نے دیکھا۔ خو: نوشت راؤ عبد الرشید صفحہ۱۶۸) خدا معلوم فرمان صاحب اسی اصغر خاں کا ذکر فرما رہے ہیں یا کسی اور کا۔ فرمان صاحب کے بیان کردہ کیس میں ان ایس پی صاحب کے رویہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہی کا ذکر خیر ہے۔ کیونکہ ٹریفک کا ایس پی ہوتے ہوئے تھانے پہنچ گئے۔ تفتیش کے لئے جو پولیس والے گئے تھے انہیں معطل کیا جن لوگوں نے

ان کے رفیق کی کار کو ٹکر ماری تھی انہیں حوالات میں ڈلوایا اور جوتے لگوائے اور دو تین روز تک ان کی ضمانت نہ ہونے دی۔ حالانکہ ان میں ایک صاحب چیمبر آف کامرس کے صدر تھے۔ (صفحہ ۱۹۸)

دیکھئے لوگوں کی نیک نامی یا بدنامی کس طرح تاریخ کا حصہ بن جایا کرتی ہے اور تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ قبلہ فرمان صاحب کا خیال تو یہ ہے "اگر یہ قول سچ ہے تو تاریخ کا اپنے آپ کو دہراتے رہنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ عموماً تاریخ سے بہت کم سبق لیتے ہیں" (صفحہ ۳۸۸)

فرمان صاحب بیجنگ یونیورسٹی میں تشریف لے گئے تو صدر شعبہ پروفیسر شان یون نے ان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ وہ ان کی شاگرد ہیں (صفحہ ۳۲۵) ظاہر ہے قبلہ فرمان صاحب کو اس بات سے بہت مسرت ہوئی ہوگی۔ ہمیں بھی جاپان کی اوساکا یونیورسٹی میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت میں چار سال پڑھانے کا موقعہ ملا تھا اس زمانے کے ہمارے شاگرد پروفیسر ماتسومورا اب اردو کے شعبہ کے صدر ہیں۔ پچھلے برس ہمارے ایک پاکستانی رفیق کار نے ان سے پوچھا کیا آپ پروازی صاحب کو جانتے ہیں؟ تو پروفیسر ماتسومورا کا جواب تھا جی ہاں میں نے اردو کی الف بے انہیں سے سیکھی ہے۔ ہمارے رفیق نے پروفیسر ماتسومورا کا جواب ہمیں ای میل سے بھیجا تو ہمیں بہت خوشی ہوئی اس لئے ہم فرمان صاحب کے دل کا حال سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تو شاگردوں کی خوش خلقی ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کو یاد رکھتے ہیں ورنہ اس نفسانفسی کے دور میں کون کسی کو یاد رکھتا ہے؟

احوال الرجال والے حصہ میں مولانا حسرت موہانی کا، قبلہ نیاز فتحپوری صاحب کا ذکر تو ہونا ہی چاہئے تھا اور ہوا ہے مگر "اپنے بارے میں لکھی گئی کتاب" کا تقاضا تھا کہ اپنے عہد کے دیگر اکابر ادب کے بارہ میں بھی فرمان صاحب کچھ ارشاد فرماتے مگر آپ نے "بلاجواز" کسی کا ذکر نہیں فرمایا مبادا ان کی بلاجواز کو مکمل خود نوشت سمجھ لیا جائے!

کتاب ڈاکٹر سید معین الرحمن مرحوم کے نام معنون ہے اور انہی کے صاحبزادے نے الوقار پبلشکیشنز کی جانب سے چھاپی ہے۔ جہاں وقار معین نے اپنے ابا کے دوست کی کتاب کو دبیز کاغذ اور جلد بندی کی وجہ سے اتنا وزنی بنانے کی کوشش کی ہے وہاں کتابت کی بے شمار غلطیوں کی وجہ سے اسے اہلِ علم کی نگاہ میں بہت ہلکا بھی بنا دیا ہے۔ اردو کی غلطیاں تو تھیں ہی حدیث مبارکہ اَلدَّالُ عَلَی

الخیرِ کَفَاعِلِه کو جانے کیا سے کیا لکھ دیا ہے (صفحہ ۱۶۷) اے کاش پبلشرز اس معاملہ میں اتنے تساہل کا شکار نہ ہوتے۔

جوش صاحب کی مشہور زمانہ نظم جو جوش صاحب نے ۸ مارچ 1952 کو ان کے اہتمام میں ہونے والے کراچی کے مشاعرہ میں ارشاد فرمائی تھی تمام و کمال درج ہے اس کا پہلا اور آخری بند ضرب المثل بن چکا ہے۔ "بلاجواز" درج کرتا ہوں:

"اے ہم نشین فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ
بربط سے کیوں بلند ہوئی ہے فغاں نہ پوچھ
رودادِ جام و تختیِ پیرِ مغاں نہ پوچھ
کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ
کیا کیا نہ گل کھلے روشِ فیضِ عام سے
کانٹے پڑے زبان میں پھولوں کے نام سے۔
سرو سہی نہ ساز نہ سنبل نہ سبزہ زار
جیحوں نہ جام جم نہ جوانی نہ جوئے بار
بلبل نہ باغباں نہ بہاراں نہ برگ و بار
گلشن نہ گلبدن نہ گلابی نہ گلعذار
اب بوئے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ
وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ۔" (صفحہ ۱۱۸-۱۱۹)

بے تیغ سپاہی

ایس ایس جی کے لفٹیننٹ کرنل عبدالقادر ستارہ جرات کی خودنوشت ''بے تیغ سپاہی'': جنگ ۷۱ اور قید ہند کی روداد علم وعرفان پبلشرز اردو بازار لاہور والوں کی جانب سے اپریل ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ مجھے اس کتاب کی اطلاع ملی تو میں نے اپنے دوست اور شاگرد بریگیڈیر لطیف سے کہا کہ وہ کتاب حاصل کر کے مجھے بھیج دیں۔ انہوں نے میرے اعتماد کی لاج رکھی اور بصرف کثیر یہ کتاب مجھے کوریئر کے ذریعہ بھیج دی۔ پڑھی تو خیال آیا کہ میرے خوامخواہ کے اشتیاق نے ایک عزیز پر اتنا بوجھ ڈال دیا یہ کوئی ایسی کتاب تو نہ تھی کہ فی الفور اس کا حاصل کرنا ضروری ہوتا۔

لفٹیننٹ کرنل عبدالقادر ۷۱ کی جنگ میں شریک تھے اور سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ہندوستان میں جنگی قیدی رہے۔ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ قید سے فرار کی کوشش کی خود تو کامیاب نہ ہو سکے ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحمن فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور نیپال کے راستے واپس پاکستان پہنچ گئے۔ ''بے تیغ سپاہی'' میں جنگ کے دوران ان کے کارناموں اور بھارتی قید سے ان کے فرار کی کوششوں کی داستان رقم ہے۔

لفٹیننٹ کرنل عبدالقادر کا تعلق ایس ایس جی کے اس گروپ سے تھا جس میں پاکستانی فوج کے سابق سربراہ اور پاکستان کے سابق صدر پرویز مشرف بھی شامل تھے۔ بے تیغ سپاہی کے ابتدائیہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ ''میں حیران ہوں کہ پرویز مشرف جسے ہم شرفو کہتے تھے کس طرح اپنے بھولے پن کے خول سے نکل کر ایک جابر حکمران بن گیا'' (بے تیغ سپاہی صفحہ ۸) پرویز مشرف کے بھولے پن

کا ثبوت دینے کے لئے آپ نے یہ لکھا ہے کہ کسی ہوٹل میں کسی ٹورسٹ لڑکی سے سامنا ہوا تو مشرف شرما کر پیچھے ہٹ گیا۔ کرنل صاحب کا خیال ہے کہ اس تبدیلی کے بارہ میں کوئی بعد کا مؤرخ لکھ سکے گا یا خود مصنف کی سوانح عمری اس راز سے پردہ اٹھائے گی۔ اتفاق یوں ہے کہ پرویز مشرف کی خودنوشت جس کو انگریزی میں IN THE LINE OF FIRE کا نام دیا گیا ہے چھپ چکی ہے اس میں تو پرویز مشرف نے اپنے آپ کو خاصہ شرمیلا مگر عاشق مزاج اور پڑوسی لڑکیوں کو دل دے بیٹھنے والا اور خطوط لکھنے والا ثابت کیا ہے (In the Line of Fire page 29) یہی نہیں اپنی شرارتوں اور زبردستیوں بلکہ داداگیری کے واقعات کھل کر بیان کئے ہیں۔ مزید برآں ایک سینئر سول سرونٹ جناب جیون خاں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ پرویز مشرف ''پردہ کے پیچھے صحبت یار اور مے پرستی تک روا رکھتے تھے'' (جیون دھارا: قصر سلطانی کے سائے تلے صفحہ ۳۹۴) خیر یہ تو ان کے ذاتی معاملات ہیں مگر کرنل صاحب کا خیال واثق ہے کہ ہماری فوج میں ترقی صرف انہی کو ملتی ہے جو ایسی عادتیں رکھتے ہوں اور اصطلاحاً socialable ہوں اور انگریزی خوب بول سکتے ہوں (صفحہ ۴۷)۔ مشرقی پاکستان میں انہیں ستارہ جرات کا اعزاز دیا گیا تو انہیں ''فخر کی بجائے شرم محسوس ہوئی کہ انجام کار ہم نے اپنے ازلی دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال کر مسلمانوں کی صدیوں کی فتوحات اور روایات پر پانی پھیر دیا'' (صفحہ ۵۵)۔

کتاب کا دیباچہ جنرل حمید گل کا لکھا ہوا ہے کہ یہ کتاب ''ایک سچے اور کھرے سپاہی کی داستانِ عزم و وفا ہے۔ میں بطور سپاہی اعتراف کرتا ہوں کہ میں وہ سب کچھ نہ کر سکا جو بے تیغ سپاہی کے مصنف نے کر دکھایا'' (صفحہ ۱۶)

کتاب میں جگہ بجگہ مصنف کے اپنی فوج کے بارہ میں خیالات بیان ہوئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے خیال میں ایس ایس جی یعنی سپیشل سروسز گروپ کے خلاف فوج کی ہائی کمان میں تعصب تھا ''افسر چاہتے تھے کہ بریگیڈیئر ابوبکر عثمان مٹھا کی مخالفت کی جائے اور ایس ایس جی والوں کے دماغ ٹھکانے رکھے جائیں'' (صفحہ ۲۱) پھر آپ نے لکھا ہے ''بہت کم لوگوں کو اس بات کا پتہ ہے کہ ۱۹۶۵ کی جنگ میں کشمیر کے چھمب جوڑیاں سیکٹر پر اکھنور برج کی طرف پیش قدمی اس وجہ سے

ملتوی کر دی گئی تھی کہ کشمیر فتح کرنے کا کریڈٹ جنرل اختر کی بجائے جنرل یحییٰ خاں کو دیا جائے اکھنور برج جو ہماری تیزی سے پیش قدمی کرتی ہوئی ۶ پنجاب، ۱۵ پنجاب، اور ۱۵ ایف ایف کمپنی، جنہیں ہیوی میڈیم اور فیلڈ آرٹلری اور ٹینک رجمنٹ کی سپورٹ حاصل تھی، سے صرف پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا اور ہندوستانی یونٹیں بہت پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ اس پل پر قبضہ پوری لڑائی کا پانسہ پلٹ سکتا تھا'' (صفحہ ۷۳)۔ اسی تسلسل میں آپ نے لکھا ہے کہ ''ہمارے کیمپوں میں ستر فیصد کرنل ایسے تھے جو اس قابل نہیں تھے جو کسی آزاد قوم کے سپاہی کہلانے کے مستحق ہوں''۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے جنرل گل حسن کی خودنوشت میں مرقوم وہ رپورٹ نہیں پڑھی جو جنرل نوازش نے اردن سے بریگیڈئر ضیاء الحق کے بارہ میں بھیجی تھی کہ یہ شخص کسی مسلمان فوج کا افسر ہونے کے قابل نہیں اس کا کورٹ مارشل کیا جائے اور جنرل مٹھا کے مطابق یحییٰ خاں نے وہ سگنل جی ایچ کیو کی پی ایس اوز کی میٹنگ میں پڑھ کر سنا دیا تھا اور تلے بیٹھے تھے کہ وہ ضیاء الحق کا کورٹ مارشل کر کے رہیں گے جنرل مٹھا نے لکھا ہے۔ ''میں یہ پڑھ کر سخت حیران ہوا ہوں کہ یحییٰ نے ضیاء کو کیسے چھوڑ دیا کیونکہ یحییٰ نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ ضیاء کو ضرور سزا دی جائے گی'' (بمبئی سے جی ایچ کیو تک۔ خودنوشت جنرل مٹھا۔ صفحہ ۵۵۳۔۵۵۴) ۔مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے اس شخص کو بھٹو کے ہاتھوں چیف آف سٹاف بننا تھا پھر اسی کے ہاتھوں بھٹو نے تختہ دار تک پہنچنا تھا۔ اس نے پاکستان پر مسلط ہونا تھا اور اس ملک کو کلاشنکوف اور اسلام کے نام پر دہشتگردی کا تحفہ دینا تھا۔

بے تیغ سپاہی کے مصنف کو اپنے ساتھی قیدی افسروں سے شکایت تھی کہ وہ ہندوستانی فوجیوں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے تھے ''سینئر کرنیل مایوسی اور لاچاری کا شکار تھے فرار ہونے یا ہندوستانیوں سے اپنا حق مانگنے کے بھی خلاف تھے۔ الغرض ناکارہ بھوسہ بن کر رہ گئے تھے'' (صفحہ ۷۲) ایک میجر ایک ہندوستانی سیکنڈ لیفٹیننٹ سے اٹینشن ہو کر بات کر رہے تھے کہ سر مجھے السر کی تکلیف ہے مجھے دودھ ضرور ملنا چاہیئے'' (صفحہ ۹۹) ''کرنل رضا گنتی کرنے والے صوبیدار میجر کے سامنے اٹینشن ہو جاتے تھے'' (صفحہ ۱۱۹) خود مصنف نے جرات اور مردانگی دکھائی۔ فرار ہونے کی کوشش میں ناکام ہوئے زخمی بھی ہوئے تکلیفوں کا شکار بھی ہوئے مگر حوصلہ نہیں ہارا۔ جب ان لوگوں نے ان کی وردیوں

پر کراس لگانا چاہے تو سینہ سپر ہو گئے اور کراس نہیں لگوایا اس جرم میں سزا بھی پائی مگر اپنی بات پر ثابت قدم رہے۔ جب ہندوستان میں انہیں ایک رسالہ دکھایا گیا جس میں قیدیوں کی بیویوں نے غیر ملکی سفارت کاروں کے سامنے اپنے شوہروں کی رہائی کی عرضداشت پیش کی تھی تو تصویر کے نیچے لکھا تھا کہ ''قیدیوں کی بیویوں نے غیر ملکی سفارت کاروں کو اپنی شلواریں اور ساڑھیاں دکھائیں'' (صفحہ ۱۲۱) تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ آپ نے اپنے گھر والوں کو خط لکھا کہ کوئی اس قسم کے جلوسوں میں شامل نہ ہوں نہ رہائی کی اپیل وغیرہ کرے۔

قیدیوں کی واپسی ہوئی تو اکثر لوگ خوش تھے مگر ان کا بیان ہے کہ ''میرا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا'' (صفحہ ۱۵۴) کہ میں نے کون سا کارنامہ انجام دیا ہے دشمن کے سامنے بغیر لڑے ہتھیار ڈالنے کا؟

واپسی پر انہیں ترقی بھی ملی مگر ان میں جو تبدیلی آئی وہ یہ تھی کہ دیندار ہو گئے۔ داڑھی بڑھا لی۔ ذکر کے ایک حلقہ کے رکن بن گئے۔ اس کیفیت کو آپ نے اللہ کا بلاوا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کتاب کے اواخر میں آپ نے ضیاء الحق سے نظام اسلام کے نفاذ کی توقعات وابستہ کیں مگر انہیں پورا نہ ہوتے دیکھا کیونکہ وہ شخص اس معاملہ میں مخلص نہیں تھا۔ جہاد افغانستان میں شرکت کی تمنا کی مگر فوج میں ہونے کی وجہ سے حصہ نہ لے سکے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پاکستان میں ٹیلیفون کے نظام سے وابستہ رہے اور اس سلسلے میں کچھ مفید کام بھی کیے۔ مگر کتاب کے اواخر میں ان کے ناپختہ افکار در آئے ہیں جن کے بیان نے وہ تاثر جو ایک بے خوف اور صائب الرائے شخصیت کا بنتا ہے کمزور کر دیا ہے۔ خدا کا بلاوا محض بے دریغ داڑھیاں بڑھا دینے سے پورا نہیں ہوتا عملی طور پر ایک خوش خلق اور خوش اخلاق دیندار انسان بننے سے پورا ہوتا ہے۔ اللہ ان کے ساتھ ہو۔

سب کچھ ممکن ہے

ہندوستان کی پولیس سروس کی محترمہ کرن بیدی، اپنی ملازمت کے دوران دہلی کے جیل خانہ جات کے انسپکٹر جنرل کے وقیع اور ممتاز عہدے پر فائز ہوئیں اور جیل کے نظام اور قیدیوں کے حالات کی اصلاح کی حقیقت پسندانہ سعی کی۔ ان کی سعیءمشکور کے بعد انہیں دنیا بھر کے جیل خانہ جات کے دورے کرنے کے مواقع میسر آئے۔ کتاب کے اندرونی فلیپ پر لکھے گئے شذرہ میں بتایا گیا ہے کہ انہیں '' اقوام متحدہ میں ہندوستان کی نمائندگی، جرائم کی روک تھام منشیات سے نجات، قید خانے کی اصلاحات اور خواتین کے مسائل پر امریکی یوروپی اور ایشیائی فورم پر نمائندگی کا اعزاز ملتا رہا''۔ ڈاکٹر کرن بیدی نے اپنے ان تجربات کو ''سب کچھ ممکن ہے'': ''دنیا کی سب سے بڑی جیل کی کایا پلٹ'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ داستان ۲۰۰۵ میں دہلی سے انگریزی میں شائع ہوئی اور انیس الرحمن اور نجم سعید خاں صاحب نے اسے اردو میں ترجمہ کیا ہے اس کتاب اور ان کے سی ڈی رامز کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی انڈیا وژن فاؤنڈیشن کے نام وقف کردی گئی ہے۔ گویا یہ کتاب ایک صدقہءجاریہ ہے۔ اگرچہ کرن بیدی کی خودنوشت سوانح عمری نہیں مگر ان کی ملازمت کے ایک حصہ کی کہانی ہے جو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کا مقصد حیات بن گئی ہے۔

کرن بیدی کا کہنا ہے کہ ''اس کتاب کا لکھنا ماضی کو دیانت داری کے ساتھ یاد کرنے کے مترادف تھا'' (سب کچھ ممکن ہے۔ صفحہ ۱۴) ''اس کتاب کا لکھا جانا مقدر تھا اس کے لکھنے کی دراصل کوئی تجویز نہیں تھی کام کے ذریعہ خوشیاں بانٹنے کا عمل ہی اس کی تصنیف کا ذریعہ بن گیا'' (صفحہ ۱۵) اسارت یا قید انسانی زندگی کا تلخ ترین تجربہ ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے بھی محض اللہ کی خاطر یتیموں

مسکینوں کی خبر گیری کے ساتھ اسیروں کی خبر گیری کے عمل کو بہت مستحسن اور نیکی کا عمل قرار دیا ہے کیونکہ اسیر سے زیادہ بے بس اور کوئی نہیں ہوتا۔ وَ یُطعِمُونَ الطَّعَامَ علیٰ حُبِّہٖ مِسکیناً وَّ یتیماً وَّ اسیراً (سورۃ دہر) مجھے یاد ہے میرے والد مرحوم تقسیم ہند کے وقت سیاسی قیدی کے طور پر ہندوستان میں روک لئے گئے تھے جب سال ڈیڑھ سال کے بعد رہا ہو کر آئے تو ہر اس نماز میں جس میں بالجبر تلاوت کی جاتی ہے ہمیشہ سورۃ دہر کی ابتدائی آیات کی بالالتزام بڑے درد کے ساتھ تلاوت فرمایا کرتے تھے کیونکہ جس غیر انسانی ماحول میں رہ کر اور بے رحمانہ سلوک کا شکار ہو کر آئے تھے اس نے انہیں بہت دردمند بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر کرن بیدی نے اسی بے رحمانہ ماحول کو بدلنے کا نیک کام کیا اور قیدیوں کو شرف انسانی کا مستحق جانا اور اس سلسلہ میں دوررس اصلاحات کیں جو رہتی دنیا تک ان کے لئے اجر عظیم کا باعث بنتی رہیں گی۔

کتاب کا دیباچہ عزت مآب دلائی لامانے لکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ''ذاتی سطح پر میں نے ہمیشہ اس بات پر اپنا یقین قائم رکھا ہے کہ جو لوگ قید و بند کی سزا کاٹ رہے ہیں انہیں ہماری ہمدردی کی ضرورت ہے وہ ہمارے معاشرہ کا حصہ ہیں ---- میں کرن بیدی کی اس لئے عزت کرتا ہوں کہ وہ بھولے بھٹکے لوگوں کو ایک بار پھر معاشرہ کا حصہ بنانا چاہتی ہیں ان کی آبادکاری چاہتی ہیں وہ ان کے لئے ایک مہذب ماحول کی تشکیل کر رہی ہیں''۔ کرن بیدی کی کتاب ایک ایسے ہمدرد فرد کی داستان ہے جس نے قیدیوں کے درد کو محسوس کیا ان پر بیتنے والی تکالیف کا ادراک کیا ان کے ذہنوں میں پلنے والے خدشات اور محرومیوں کو جانچا پرکھا اور پھر اپنے تمام تر وسائل اور اختیارات استعمال کرتے ہوئے ان کی فلاح و بہبود کو اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ ہمارے ادب میں اسارت کے موضوع پر مولانا حسین احمد مدنی کی ''اسیر مالٹا'' اور مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' جیسی کتابیں موجود تھیں مگر قیدیوں کو در پیش آنے والے مسائل و حالات پر دور جدید میں حمید اختر کی کتاب ''کال کوٹھری'' نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ سب کتابیں اسیروں کی جانب سے لکھی گئی تھیں۔ کرن بیدی کی کتاب اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ یہ کتاب اسیروں کی جانب سے نہیں اسیروں کو قید و بند میں پابند رکھنے والے کی جانب سے لکھی گئی ہے اس میں صرف قیدیوں کی نگرانی کے مسائل ہی نہیں ان انسانوں کی داستان بھی بیان کی

گئی ہے جنہیں دوران اسارت انسان ہی نہیں سمجھا جاتا اور ان سے وہ سلوک روا رکھا جاتا ہے جس کا سوچ کر بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کرن بیدی انسپکٹر جنرل جیل خانہ مقرر ہوئیں تو جیل میں افسر بن کر داخل نہیں ہوئیں انسان بن کر داخل ہوئیں اور اس عزم کے ساتھ داخل ہوئیں کہ وہ ''دنیا کی سب سے بڑی جیل کی کایا پلٹ دیں گی'' اور انسانی سعی کی حد تک اس میں کامیاب و کامران رہیں۔

جیل میں قیدیوں سے ہمدردی سے پیش آنا ہی قیدیوں کے لئے اچنبھے کی بات تھی۔ کرن بیدی جیل کے معائنے کے لئے گئی ہیں تو ''وہاں جو لوگ صحن میں موجود تھے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے لیکن وہاں موجود شاف نے اپنی چھڑیاں دکھا کر انہیں دور ہی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔۔۔ (آئی جی نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا) مجھے ان قیدیوں کی کھوکھلی نگاہیں دیکھ کر حیرت ہوئی جو چاروں جانب سے مجھے گھور رہی تھیں میں ان کے روبرو کھڑی ہوگئی'' (صفحہ ۲۹) اس کے بعد آپ نے قیدیوں کے ساتھ مل کر ایک فلمی نغمہ گایا جس کے بول کچھ یوں تھے کہ ''اے مالک تیرے بندے ہم۔ ایسے ہوں ہمارے کرم۔ نیکی پر چلیں'' (صفحہ ۳۱) گویا نئے آئی جی نے قیدیوں اور نگرانوں کے درمیان ایک انسانی رشتہ قائم کر دیا۔ اس رشتہ کا بہت فائدہ ہوا اور محترمہ کرن بیدی کو اپنے بہت سے اصلاحی کاموں میں کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ کتاب جہاں قیدیوں کے تعاون پر روشنی ڈالتی ہے وہاں جیل کے نظام اور اس نظام کو چلانے والوں پر کھل کر تنقید بھی کرتی ہے کہ وہ اپنے ذرا سے فائدہ کی خاطر انسانوں سے غیر انسانی سلوک روا رکھتے ہیں۔ ایک واقعہ آپ نے خاص طور سے بیان کیا ہے کہ ایک بدمعاش قیدی نے ایک افسر کو گالیاں دیں اس کی قمیض پھاڑ دی تو سب افسروں نے مل کر اس کی خوب ٹھکائی کی اس کا ردعمل یہ ہوا کہ آپ نے ان افسروں کو بلا کر کہا ''گینگسٹر افسر کے ساتھ گالی گلوچ کرنے لگا اور تشدد پر اتر آیا لیکن تم نے کیا کیا؟ تم تو آفیسر ہو تم نے بھی کیا وہی نہیں کیا؟ کیا قانون کے محافظ اور قیدی میں کوئی فرق نہیں؟ تم کس طرح ان سے اپنے برتاؤ میں فرق کرتے ہو؟ قیدی جیل میں قانون توڑنے کی سزا بھگتنے آتا ہے اور تم کیا کرتے ہو؟ اس طرح کا برتاؤ کرنے کی اجازت تمہیں کس نے دی ہے؟ کیا اس مخصوص قیدی کو راہ پر لانے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا؟ کیا انتقامی تشدد ہی ایک راستہ تھا؟'' (صفحہ

۱۴۱) ان تمام باتوں کے باوجود آپ نے افسروں کی عزت نفس اور حفاظت کا پورا ذمہ لیا اور اس کے انتظامات کئے تا کہ ایسے واقعات کا اعادہ نہ ہو۔

اپنی تجویز کردہ اصلاحات کے لئے انہیں حکومتی کارندوں کے سرخ فیتے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جیل کی اصلاح کے لئے نام نہاد کمشنوں کی رپورٹیں بھی مرتب ہوتی اور دیمک کی غذا بنتی رہیں مگر یہ اپنے مشن میں ثابت قدم رہیں۔ اور اس بات پر مطمئن کہ قیدی رہا ہوتے وقت بہتر انسان بن کر نکلتے ہیں اور معاشرہ کا عضو معطل بن کر نہیں رہ جاتے۔

قیدیوں کی بہبود ان کی تعلیم ان کی ہنرمندی اور ان کے اندر بہتر انسان بن جانے کی آرزو پیدا کر دینا ہی کرن بیدی کی بڑی کامیابی رہی اور اپنی اس کوشش پر وہ بجا طور پر مفتخر بھی ہیں اور مطمئن بھی۔ یہ کتاب اپنے معلوماتی مواد کے علاوہ انسانی ہمدردی اور خلوص کی وجہ سے بھی ادب میں یادگار رہے گی۔ اے کاش ہمارے جیل خانوں کے کرتا دھرتا بھی ایسے ہی اخلاص و وفا کا اظہار کرنے والے ہوتے۔

گھومتی ندی

علی گڑھ یونیورسٹی کے فارسی کے وظیفہ یاب پروفیسر جناب وارث کرمانی کی خودنوشت ''گھومتی ندی'' کے عنوان سے رام پور رضا لائبریری قلعہ رام پور یوپی والوں کی جانب سے ۲۰۰۶ میں پہلی بار شائع ہوئی۔ جناب وارث کرمانی یوپی کے مشہور قصبہ دیوا شریف میں ایک تعلقہ دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی نابالغ ہی تھے کہ ان کے والد محترم کا انتقال ہو گیا اور ان کا تعلقہ شیخ پور کورٹ آف وارڈ میں چلا گیا۔ سادات نٹہور کے ایک فرد سید نثار حسین زیدی جو اس وقت ڈپٹی کلکٹر تھے ان کے گارڈین مقرر ہوئے جن کے ہاں اور جن کی نگرانی میں ان کی پرورش ہوئی۔ خودنوشت میں پہلی بار ان کا ذکر آیا تو میں نے خیال کیا کہ یہ سید صاحب ہمارے خاندان یلدرم کے قریبی نہ ہوں وہی بات نکلی۔ جب ۱۹۴۱ میں علی گڑھ میں داخل ہوئے تو سجاد حیدر یلدرم کے چھوٹے بھائی نصیر حیدر صاحب اور ان کے خاندان کے ساتھ رہے اس طرح اس خاندان سے ان کے قریبی مراسم اور زیادہ مستحکم ہو گئے۔ زہرا حیدر، قرۃ العین حیدر، حمیرا آپا وہ سارے کردار جو قرۃ العین حیدر کی خودنوشت ''کار جہاں دراز ہے'' میں قاری کے سامنے آچکے ہیں ان کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ان کے دیباچہ نگار ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی صاحب نے کتاب کے ''پیش لفظ'' میں استعجاب کا اظہار کیا ہے کہ ''یہ نہیں معلوم کہ پروفیسر کرمانی نے گومتی ندی کا نام گھومتی ندی کہاں سے لیا ہے''؟ اگر دیباچہ نگار نے کتاب اواخر تک پڑھی ہوتی تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ بات قرۃ العین حیدر کی کہی ہوئی ہے ''عینی نے مجھے بتایا کہ گومتی ندی کا نام بہت پہلے شروع زمانے میں گھومتی ندی تھا۔۔۔اسے میں نے اپنی سوانح حیات کا نام رکھنے کا فیصلہ کر لیا'' (گھومتی ندی صفحہ ۳۸۴)۔ حالانکہ انہیں کی ۳۷ برس کی عمر میں کہی ہوئی قرۃ العین حیدر کی ایک ہجو

بعنوان ''درہجو قرۃ العین حیدر گفتہ'' (صفحہ ۱۷) درج ہے جو ان کے قول کے مطابق عینی نے اپنے ''مضمون'' اور کتاب کار جہاں دراز میں درج کی ہے مگر ہمیں تو کتاب ''کار جہاں دراز میں'' وہ نظم کہیں ملی نہیں۔ شاید کتاب مرتب کرتے وقت قرۃ العین نے وہ ہجو نکال دی ہو۔

میں دیباچہ نگار سے واقفیت نہیں رکھتا مگر ان کی ایک اور بات نے بھی مجھے بہت الجھن میں ڈالا ہے کہ ''پروفیسر وارث کرمانی کی خودنوشت جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' سے کہیں زیادہ ادبی اور دلچسپ ہے'' (پیش لفظ صفحہ د) گستاخی معاف میں اردو کی مثل برتنے کو تھا ''کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی'' مگر پھر یہ خیال آڑے آگیا کہ وارث صاحب تو سوائے اودھ کی مقامی زبان کے کسی اور زبان کی سند ہی کو نہیں مانتے۔ (صفحہ ۲۳۳) عمر بھر ''ہائے میری زبان ہائے میرا وطن'' (صفحہ ۱۹۹) کہتے رہے۔ رہے ہم، تو ہمیں ان کی طرح فارسی پر اتنا عبور کہاں کہ ان کو مطمئن کرنے کی خاطر فارسی کی سند لائیں؟ چہ نسبت خاک را۔۔۔ یا بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا! میں نے یادوں کی برات پر نہایت کڑی تنقید لکھی تھی اور اسے کمزور خودنوشت کہا تھا مگر یہ بات کہے بغیر میں نہیں رہ سکا تھا کہ ''یادوں کی برات'' اردو ادب میں اپنی زبان کی لطافت و امارت اور مصنف کی خوش لہجگی کے باعث یاد رکھی جائے گی اور اس پنج عیبی شاعر کی نثر کا جیتا جاگتا نمونہ بنی رہے گی'' (پس نوشت اور پسِ پس نوشت صفحہ ۱۵۶) ''گھومتی ندی'' تو پڑھنے والے کو چکرا دیتی ہے۔ خودنوشت ہونے کے لحاظ سے اس خودنوشت کا شمار اردو کی کمزور ترین خودنوشتوں میں ہوگا اور اس کمزوری کا انہیں خود بھی احساس ہے ''میں پھر اپنی سرگزشت سے ہٹے جا رہا ہوں'' (صفحہ ۱۳۵) ''میں پھر جذبات میں بہہ گیا'' (صفحہ ۱۴۳) ''جو حصہ سوانح حیات نہیں وہی قابل توجہ اور باعث دلچسپی ہو سکتا ہے'' (صفحہ ۱۵۰) لکھتے ہوئے میں ''آگے پیچھے جست لگاتا رہتا ہوں'' (صفحہ ۱۷۹) اس بے ہنگم جست بازی کا نتیجہ یہ ہؤا کہ خودنوشت جن بنیادی کوائف کا تقاضا کرتی ہے وہی اس میں موجود نہیں۔ یہ تو معلوم ہؤا کہ آپ عمر عزیز کے دس سال ''رئیسانہ عیاشیوں'' میں ضائع کرنے کے بعد اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی پہنچے جب ان کا صاحبزادہ بھی اسی یونیورسٹی کا طالب علم تھا مگر آپ نے کس کس مضمون میں تخصص کیا؟ انگریزی کا ایم اے کرنے کا ذکر ہے۔ فارسی کے شعبہ سے آپ پروفیسر ہو کر وظیفہ یاب ہوئے مگر فارسی کی تحصیل

کن اساتذہ سے کی کس میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی؟ ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ میں لوگوں سے کہہ دیتا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر صاحب یا میاں صاحب کہیں۔ گویا آپ نے تحقیقی کام بھی کیا ہوگا۔ قاری کو بتا دینے میں کون سا امر مانع تھا؟ آپ کی زندگی کے یہ سب کوائف اخفاء میں رہتے ہیں۔ اور خودنوشت ان بنیادی کوائف کی متقاضی ہوتی ہے۔

اپنی طرف سے آپ نے یہ جدت روا رکھی ہے کہ مختلف ابواب کے عنوان ایسے چن لئے جن سے اس باب کے مندرجات کا ہرگز اندازہ نہیں ہوتا۔ ''خوشبوئے پیرہن''۔ ''سایہ باغباں''۔ ''ارضِ کنعاں''۔ ''بازارِ مصر''۔ ''کنارِ آب جیہوں'' وغیرہ۔ یہ کام ان کے دیباچہ نگار کو کرنا پڑا ہے۔ جس نے ان ابواب کی تفصیل اپنے پیش لفظ میں بیان کی ہے۔

میرے لئے ایک اور بات بھی حیرت کا موجب بنی کہ کہیں یہ مذکور نہیں کہ یہ خودنوشت قسط وار لکھی گئی تھی یا کتابی صورت میں مرتب ہوئی تھی؟ ایک جگہ آپ نے لکھا ہے کہ ''گھومتی ندی کی اس قسط کو یہیں تک رکھنا چاہتا ہوں'' (صفحہ ۱۷۱) اس کا مطلب ہے کہ آپ نے یہ خودنوشت قسط وار لکھی تھی شاید کہیں چھپتی بھی رہی ہو اس بات کا ذکر کتاب کے آخر میں ہوتا ہے کہ یہ خودنوشت قسط وار ''شب خون'' میں چھپتی رہی (صفحہ ۳۸۳)

اپنی شاعری کے بارہ میں ان کا ارشاد ہے کہ ''جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے مجھے کسی قسم کا پندار یا غلط فہمی نہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ میں فیض اور جذبی کے ہمعصروں اور آج کے شاعروں کے درمیان کھڑا ہوں'' (صفحہ ۱۵۷) ابھی بقول خود ان کے ہاں کوئی پندار موجود نہیں اور آپ کا عالم یہ ہے کہ جہاں تہاں اپنے ہی اشعار سند میں پیش کرتے ہیں۔ سرِ آغاز بھی اپنے ہی شعر سے کیا ہے اس کے بعد صفحہ ۲۰، صفحہ ۲۷، صفحہ ۴۳ اور صفحہ ۱۹۵ تک اپنے ہی اشعار کو سند کے طور پر درج کرتے چلے جاتے ہیں جسے اہلِ ادب ''کم ذوقی'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ جذبی کی بات آپ نے درج کر دی ہے کہ ''تم شاعری کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو شاعری تمہارے بس کی بات نہیں'' (صفحہ ۱۶۰) غالباً جذبی کی بات کی تردید کرنا چاہتے ہیں مگر اپنے جو شعر آپ نے سند میں دئے ہیں وہ جذبی کی صاف گوئی کی گواہی دیتے ہیں۔

دانشور کرمانی صاحب نے فیض سے جو بات منسوب کی ہے وہ کم از کم ہمارے لئے تو قابل فہم نہیں کیونکہ ایسی بات فیض کے مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ لکھتے ہیں ''میں فیض سے پاکستان کے سربر آوردہ شاعروں کے بارہ میں پوچھتا تو ان کی شگفتہ مزاجی ختم ہو جاتی اور مایوسانہ انداز میں کہتے ایسے ہی چلتے پھرتے شاعر ہیں'' (صفحہ ۱۵۹) فیض کا کوئی بھی جاننے والا اس بات کی تردید کر سکتا ہے۔

آپ روس کے دورہ پر تشریف لے گئے تو وہاں ان کی ملاقات تاجیک شاعر ترسوں زادہ سے ہوئی ان سے خوب گھل مل کر فارسی بولتے رہے۔ ان کی اس فارسی گوئی نے ہمیں حمید اختر کی یاد دلا دی۔ حمید اختر نے اپنی کتاب ''آشنائیاں کیا کیا'' میں لکھا ہے ''لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی ۱۹۴۹ کی پہلی کانفرنس میں تاجکستان کے شاعر ترسوں زادہ اور موسیٰ ایبک بھی آئے ہوئے تھے۔ لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے کمرے میں احمد ندیم قاسمی ہاجرہ مسرور خدیجہ مستور سید مطلبی فرید آبادی صفدر میر عبداللہ ملک خود میں اور کچھ دوست انجمن کی سرگرمیوں کے بارہ میں باتیں کر رہے تھے۔۔۔ مرزا ترسوں زادہ نے پہلا سوال انجمن کے بانی کے بارے میں کیا۔ اس سوال کا جواب سب نے اجتماعی طور سے دیا کہ سید سجاد ظہیر انجمن کے بانی ہیں۔

''او کجاست؟'' ترسوں زادہ نے سوال کیا

''زیر زمین است''۔ سید صاحب نے فرمایا اس پر ترسوں زادہ اور ایبک دونوں نے انا للہ پڑھی اور فاتحہ کے لئے ہاتھ بلند کئے''۔۔۔ بڑی مشکل سے انہیں باور کروایا گیا کہ وہ مرے نہیں بلکہ زیر زمین رہ کر کام کر رہے ہیں۔ اس پر ترسوں زادہ نے سادگی سے فرمایا اچھا تو ''پنہاں است'' (آشنائیاں کیا کیا۔ صفحہ۱۴) خدا معلوم وارث کرمانی صاحب اور ترسوں زادہ کہاں کہاں کیسی کیسی فارسی سے دوچار ہوئے ہونگے؟ وہاں جس ڈاکٹر سے فارسی بگھاری وہ بھی درج ہے۔ ڈاکٹر سے ملنے گئے تو ڈاکٹر نے پوچھا ''چہ کسالت دارید؟'' یعنی کیا بیماری ہے آپ نے جواب دیا ''سرما خوردگی دارم'' یعنی سرما خوردگی میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر نے فرمایا ''سرما خوردگی؟ یعنی زکام شدہ'' اچھا تو آپ کو زکام ہوگیا ہے'' (صفحہ ۲۱۲)

ایران میں تو آپ ایک دختر ایران 'پری وش' سے جوش صاحب کی طرح معاشقہ آخر الزماں

بھی فرماتے رہے اور فارسی میں خط وکتابت کرتے رہے۔'' یہ خط فارسی کی جاں لیوا زبان میں ہوتے تھے اور فارسی ہی کے شعروں سے مزین ومرصع جن کے اثرات ایسا لگتا تھا کہ تیموری عہد کے میرے تمام بزرگوں کے دل کے آر پار ہوتے ہوئے گذر جائیں گے'' (صفحہ ۳۴۱)

احوال الرجال میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شلیندرا اور قرۃ العین حیدر کا ذکر ہے۔ عینی والا حصہ شاید قارئین کے لئے نیا ہو اس لئے درج کرتا ہوں'' قرۃ العین میرے بچپن کی دوست ہیں اور ایک ہی خاندان میں پرورش کی وجہ سے میرے لئے حقیقی بہن کا درجہ رکھتی ہیں۔۔۔ وہ جب علی گڑھ آئیں تو آپا زہراء کے یہاں مہمان رہیں تو علی گڑھ کے حلقوں میں ایک شور سا میں نے سنا اور بہت سے ادیبوں اور پروفیسروں کو ان کی تصنیف آگ کا دریا کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔۔۔ تب میں چکر میں پڑا کہ یہ عینی اتنی بڑی لکھنے والی ہوگئی ہے بلکہ میرے دل میں رشک پیدا ہوا اور عینی کے مداحوں پر دل ہی دل میں حقارت بھی تھوڑی سی کنمنانے لگی کہ میں خود اس لڑکی کی عمر اور علم میں برابر کا درجہ رکھتا ہوں میں انہیں بجھائی نہیں دیتا''؟ (صفحہ ۳۸۲) اس پس منظر میں ان کی تہتر سال کی عمر کی لکھی ہوئی عینی کی ہجو بھی دیکھ لی جائے تو لطف دے گی:

'' قرۃ العین ہیں ادب میں دخیل۔ جیسے ملک عرب میں اسرائیل

شہر دہلی میں حشر برپا ہے۔ متفکر ہیں سب فہیم وعقیل

اک قیامت ہے آگ کا دریا۔ نذرِ آتش ہوئی ہے فکرِ جمیل

کاش پڑھتیں ''فسانہ ءآزاد''۔ جس میں کیا کیا رموز ہیں تحلیل

دیکھ لیتیں ''طلسمِ ہوشربا''۔ ہضم کرتا ہے جو غذائے ثقیل

اس کے برعکس آپ نے کی ہے۔ ان صحیفوں کی بے طرح تذلیل

آپ کے سامنے ہے شرمندہ۔ لحنِ داؤد ونغمہ ءجبریل

وحشت واختلاج وآہ وفغاں۔ آپ کی ناولوں کی ہے تاویل

آپ کے صفحوں میں ہیں پوشیدہ۔ دعوت خورد ونوشِ عزرائیل۔'' (صفحہ ۷۲)

ان تمام باتوں کے باوصف ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ملک غلام نبی صاحب نے اپنی خود نوشت

میں لکھا ہے کہ ایک بار سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کرتے ہوئے ایک مصرعہ بھول رہے تھے سامعین میں سے کسی نے اٹھ کر وہ مصرعہ سنا دیا تو شاہ جی نے فرمایا'' سبحان اللہ خیرات بھی ملی تو کہاں سے ملی۔'' (ایک صدی کی کہانی صفحہ ۲۲۰) ہمیں بھی وارث کرمانی صاحب کی جانب سے'' شنیدہ کے بود مانند دیدہ''! جیسے مشہور عالم مصرعے کے پہلے حصہ کی خیرات ارزانی ہوئی ہے'' ترا دیدہ و یوسف را شنیدہ''۔ (صفحہ ۲۹۳) سبحان اللہ مکمل شعر سہل ممتنع کی کتنی خوبصورت مثال ہے۔'' ترا دیدہ و یوسف را شنیدہ۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔'' ہم اس خیرات کے لئے ان کے شکر گذار ہیں۔

سوہاوہ میری بستی میرے لوگ

ٹورنٹو کے بزرگ ادب دوست لوگوں میں جناب اطہر رضوی کا نام نامی بہت نمایاں ہے۔ اتفاق یوں ہے کہ آپ ان دنوں اس ہیچمدان سے کچھ کھچے کچھے سے ہیں مگر میں تو خودنوشتوں پر کام کرنے والا آدمی ہوں اس لئے جو خودنوشت جہاں سے ملے جس سے ملے جیسی ملے بطمانیت قلب حاصل کرتا ہوں اور بالاستیعاب پڑھتا ہوں۔ رضوی صاحب نے قبلہ کرنل انور احمد صاحب کو مشہور محقق سلطانہ مہر کے شریک حیات جناب جاوید اختر چوہدری کی جانب سے تہدیہ کردہ کتاب ''سوہاوہ میری بستی میرے لوگ'' دی۔ کرنل صاحب نے اس کتاب میں بے احتیاطی سے درآنے والی طباعتی اور کتابتی بے قاعدگیوں سے زچ آکر وہ کتاب میرے حوالہ کردی۔ سوہاوہ میرے آبائی وطن گوجر خان یعنی پوٹھوہار کا ایک غیر معروف قصبہ ہے مگر میرے لئے اجنبی نہیں۔ میں نے اس کتاب میں اپنے وطن کی خوشبو پائی تو کتاب کو پڑھنا شروع کیا کہ اگرچہ یہ خودنوشت تو نہیں ہے مگر ایک شخص کے خودتحریر کردہ احوال وآثار تو اس کتاب میں موجود ہیں۔

جناب جاوید اختر چوہدری پچھلے پینتیس برسوں سے انگلستان میں مقیم ہیں (صفحہ ۸) اس لئے وطن اور وطن کے ساتھ ان کی محبت ان کے ہر جملہ سے پھوٹی پڑتی ہے۔ کتاب کا محرک تو ان کے وہ دوست راجہ محمد اقبال ہوئے جن کا تعلق قبیلہ بنگیال سے تھا (اور حسن اتفاق کہ راقم الحروف بھی گوجر خاں کے مشہور گاؤں چنگا بنگیال کا متوطن ہے) مصنف سے دوسرا رشتہ یوں بن گیا کہ جناب جاوید اختر چوہدری قصبہ قاضیاں کے ہائی سکول کے سابق طالب علم ہیں (صفحہ ۲۸۴) اور میں بھی اسی سکول کا طالب رہا ہوں مگر اس وقت یعنی ۱۹۴۸ میں یہ سکول مڈل سکول تھا اور قاضی محمد اکرم اس کے ہیڈ ماسٹر

تھے۔ غرض ان دو رشتوں نے کتاب کو پڑھنے اور اس پر لکھنے کی تحریک کی۔ یہ خودنوشت بھلے ہی نہ ہو سوہاوہ اور اہلِ سوہاوہ کی ثقافتی اور سماجی تاریخ تو ضرور ہے۔ ان کے اجداد کے حالات ہیں اردگرد کے تاریخی مقامات کا ذکر ہے اور تو اور سلطان شہاب الدین غوری کے نو دریافت شدہ مزار پر تعمیر شدہ مرمریں مقبرہ کی تصویر بھی ہے۔

جاوید اختر صاحب نے اپنے بچپن کے حالات وواقعات کو بیان کرنے میں خاصی تفصیل سے کام لیا ہے اور اس سلسلہ میں صرف اپنی ہی نہیں دوسروں کی یادداشت پر بھی بھروسہ کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں وہ خطوط بھی آپ نے درج کردئے ہیں جو آپ نے مختلف دوستوں کو معلومات حاصل کرنے کی غرض سے لکھے مگر شرمندہء جواب نہ ہوئے۔ اگرچہ پینتیس برس سے بیرون ملک مقیم ہیں مگر اپنے وطن کے سیاسی حالات سے بے خبر نہیں۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ وابستہ کی جانے والی امیدوں اور ناامیدیوں کا نوحہ بھی ہے حتیٰ کہ اپنے مزدور ساتھی منظور کی مزاحمت پر اس کو خراج پیش کرنے کی غرض سے جو نظم آپ نے لکھی وہ بھی درج کردی ہے۔ (صفحہ ۲۰۳)

جاوید اختر چوہدری صاحب نے اپنے حالات میں یہ تو لکھ دیا کہ ''مال روڈ پر عمر سنز کے دفتر میں بطور ٹائپسٹ کام کرتے تھے'' (صفحہ ۳۲۱) مگر زندگی کی دیگر تفصیلات موجود نہیں کب ملک چھوڑا کیوں چھوڑا؟ اگر کہیں یہ ذکر ہے بھی تو صفحات کی ادل بدل کی وجہ سے سامنے نہیں آتا کہ پڑھتے پڑھتے اچانک معلوم ہوتا ہے کہ صفحات کے نمبر تو ٹھیک ہیں مندرجات ادل بدل ہوگئے ہیں اور بعض جگہ تو غائب بھی ہوگئے ہیں۔

جسٹس منیر نے اپنی خودنوشت میں ہمارے ہاں کے جاہل ملاؤں کے مروج کردہ ''وٹوانی'' کے غیر مہذب فعل کا بہت مضحکہ اڑایا تھا (''زندگی کی شاہراہیں اور پگڈنڈیاں'' ۔صفحہ ۱۵۷) جاوید اختر نے بھی اس رواج کی بھد اڑائی ہے (صفحہ ۲۳۲) مگر پوٹھوہار میں یہ بہت عام بات ہے اور لوگ صدق دل سے اس فعلِ قبیح کو ایمان کا حصہ جانتے ہیں۔

آپ ۲۰۰۲ میں راولپنڈی گئے تو جنرل شفیق الرحمٰن کو تہدیہ کی ہوئی ذاتی کتابوں کو کباڑئے کے ہاں بکتے ہوئے پایا (صفحہ ۳۴۴) ایسا تو ہمارے تجربہ میں بھی آچکا ہے کہ سر عبدالقادر کو تہدیہ کی گئی ایک

کتاب ہم نے کباڑئے کے ہاں سے خریدی۔ ان دنوں جناب منظور قادر مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے، ہم نے ایک خط انہیں لکھا کہ کیا سر عبدالقادر کی اولاد ادب سے اتنی بے بہرہ ہوگئی ہے کہ ان کی ذاتی کتابیں کباڑیوں کے ہاں بک رہی ہیں۔ جناب جسٹس منظور قادر وہ کتاب حاصل کرنے کے لئے ربوہ میں ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے اور معذرت اور وضاحت بھی کی کہ سر عبدلقادر کی سب کتابیں پنجاب پبلک لائبریری کو تحفۃً دی جا چکی ہیں خدا معلوم یہ ایک کتاب کباڑئے کے ہاں کیسے پہنچ گئی؟ منظور قادر جب تک جئے ہمارے ساتھ محبت اور مروت کا سلوک کرتے رہے۔

احوال الرجال میں وزیر آغا کی فروتنی اور انکساری کا قاسمی صاحب کی ادب نوازی کا ذکر ہے ساتھ میں اس قضیہء نامرضیہ کا بھی جو ان کی وفات کے بعد ختم ہو جانا چاہئے تھا مگر فتح محمد ملک نے قاسمی صاحب کے خطوط چھاپ کر اسے پھر سے تازہ کر دیا ہے۔ اے کاش فتح محمد ملک جیسے سمجھدار آدمی نے ایسی حرکت نہ کی ہوتی۔ لاہور کے دیگر ادیبوں سے ملاقات کا سرسری سا احوال درج ہے۔ کراچی کا سفرنامہ ہے جسے آپ نے خود ''روداد سفر بھی آپ بیتی کا ایک گوشہ ہے'' (صفحہ ۳۳۶) قرار دیا ہے۔ کراچی کے ادبا میں کچھ سلطانہ مہر کے اساتذہ کا ذکر ہے کچھ دیگر شعرا کرام کا۔

غرض سوہادہ کی یہ تاریخ خاصے کی چیز بن گئی ہے اگر اس کی طباعت کے اہتمام میں تساہل نہ برتا جاتا تو اس کی افادیت زیادہ ہو جاتی۔

کتاب کے آغاز میں بہت سے دوستوں کی تقریظیں دیباچے لکھوانے اور شامل کرنے کا رواج بڑھ رہا ہے اے کاش کوئی اس رجحان پر بند باندھ سکے۔ کیا سلطانہ مہر کو بھی یہ بات کھٹکی نہیں؟

یادوں کے چراغ

کشمیر کے ممتاز قانون دان، سیاست کار، جج، شیخ عبداللہ کی وزارت کے وزیر اور بعد کو ہندوستان کی دور افتادہ شمالی ریاستوں آسام اور گوہاٹی وغیرہ کے سابق گورنر جناب ڈی ڈی ٹھاکور کی خودنوشت My Life and Years in Kashmir Politics کے عنوان سے چھپی۔ اس کے اجراء کی صدارت ہندوستان کے سابق وزیر اعظم جناب آئی کے گجرال نے اپریل ۲۰۰۵ میں کی۔ ابتدائی رسم سابقہ وزیر اعظم وی پی سنگھ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی تھی گویا ہندوستان کے چوٹی کے رہنماؤں نے اس کتاب کو مناسب اہمیت دی۔ ٹھاکور صاحب کا کہنا ہے کہ میری آبائی ریاست یعنی کشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے اس لئے اس خودنوشت کا ترجمہ اردو میں بھی ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان کی خواہش پر تین اردو دان حضرات نے جن میں دیباچہ نگار جناب محمد حسین نائیک بھی شامل ہیں اس کا اردو ترجمہ ''یادوں کے چراغ'' کے نام سے کیا جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی والوں نے ۲۰۰۶ میں شائع کیا۔ پونے چھ سو صفحے کی یہ کتاب کشمیر کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی امور کی عمدہ تصویر کشی کرتی ہے۔ میرے لئے دلچسپی کا باعث ہندوؤں کے رسوم و رواج اور تہواروں کا بیان ہے جن کا ذکر میں نے پہلی بار پڑھا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کے ہاں بھی ہندو معاشرت کی جھلکیاں ملتی ہیں مگر وہ ہندو معاشرہ لکھنؤ کا معاشرہ ہے جس پر اودھ کے کلچر کی گہری چھاپ ہے۔ ٹھاکور صاحب جموں کے باسی ہیں اور خالص ہندوانہ ماحول کے پروردہ ہیں اس لئے ان کی تصویر کشی خالص اور بے لوث ہے۔ اردو ترجمہ بولنے کی زبان میں ہے مگر لکھتے ہوئے الفاظ کے صحیح ہجوں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ سراہا کو سراحا لکھا گیا ہے (صفحہ ۲۴) خاص کی بجائے خاس مرقوم ہے (صفحہ ۲۹) شروع میں مجھے ایسے غلط

ہجوں نے بہت پریشان کیا مگر جب بار بار اور تواتر کے ساتھ ایسے ہی ہجے آنے لگے تو میں نے یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا کہ اتنا ہی کیا کم ہے کہ ترجمہ اردو میں ہے اور سمجھ میں آ رہا ہے۔ آسام کے گورنر تھے تو فرماتے ہیں "حکومت کی بھاگ دوڑ میرے ہاتھوں میں تھی" (صفحہ ۴۹۷) تو قاری سمجھ لیتا ہے کہ ان کی مراد باگ ڈور سے ہے۔ کتاب کی زبان خالص ہندی کا مزاج رکھتی ہے "پرارتھنا سویکار ہو چکی تھی" (صفحہ ۱۶) کہ یہی ان کی مادری زبان تھی۔

ٹھاکور صاحب ایک درمیانہ درجہ کے خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے تعلیم بھی عام سکولوں میں پائی۔ سری پرتاپ کالج تک پہنچے ابھی تعلیم ختم نہیں کر پائے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا مگر ان کے سوتیلے بھائی نے دلاسا دیا کہ تعلیم جاری رکھیں اور آپ نے تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں کیا۔ کشمیر کے ولی عہد کرن سنگھ ان کے کلاس فیلو تھے (صفحہ ۹۴) مگر کلاس میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے آتے اور عام طلبا سے میل جول نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ بعد کو اپنے علاقہ سے پارلیمنٹری انتخاب میں اپنے رقیب ڈاکٹر کرن سنگھ سے آپ نے پچھتر ہزار ووٹ زیادہ حاصل کئے (صفحہ ۴۲)

ٹھاکور صاحب قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت کے پیشہ میں خاصے کامیاب رہے۔ انہیں کشمیر ہائی کورٹ کا جج بنایا گیا تو آپ نے نہایت ایمانداری اور دیانت سے انصاف کا ترازو سنبھالے رکھا۔ ان کے سکول کے زمانہ کے محسن پنڈت ہری بھگت ایک مقدمہ میں ان سے سفارش کرنے تشریف لائے تو آپ نے سفارش نہیں مانی اور اس مقدمہ کی سماعت سے ہی انکار کر دیا (صفحہ ۱۵) اور بھی دو چار مقامات پر آپ نے سفارش ماننے سے انکار کے واقعات بیان کئے ہیں (صفحات ۲۰۸ اور ۲۰۹) جج ہونے کے دوران آپ نے اپنی سماجی سرگرمیوں سے بھی مکمل انقطاع اختیار کر لیا تھا کہ یہی ہمارے ہاں انصاف کی روایت رہی ہے۔ آپ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ "جوڈیشری کو ججوں کی بے صبری جلد بازی اور تکبر سے خطرہ لاحق ہوتا ہے" (صفحہ ۲۱۱) اس سلسلہ میں آپ نے بڑے کرب سے ہندوستان کے چیف جسٹس کا قول درج کیا ہے کہ "ملک کے بیس فیصد جج صاحبان بد دیانت ہیں" (صفحہ ایضاً) ادھر ہمارے ہاں سپریم کورٹ کے ایک چیف جسٹس نے "دوسرے چیف جسٹس (سید سجاد علی شاہ) کے لئے بے ایمان اور بے اصولا" کے الفاظ علی الاعلان

استعمال کئے تھے (جج بولتا ہے۔ خود نوشت جسٹس اجمل میاں صفحہ ۱۷۰)۔ جب آپ عملی سیاست سے ریٹائر ہو گئے تو بھی آپ نے کرناٹک ہائی کورٹ کا اس لئے کوئی کیس نہیں لیا کہ ان کے صاحبزادے جسٹس ٹی ایس ٹھاکور وہاں ہائی کورٹ کے جج تھے اور گوہاٹی ہائی کورٹ میں اس لئے پیش نہیں ہوئے کہ وہاں آپ گورنر رہ چکے تھے (صفحہ ۵۲۷)۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں نے جو در حقیقت بہت بڑی بڑی باتیں ہیں اس خود نوشت کو دلچسپ اور سبق آموز بنا دیا ہے۔

شیخ محمد عبداللہ اور مرزا افضل بیگ میں اختلافات پیدا ہوئے اور یہ خلیج وسیع ہوتی گئی اس کی ایک وجہ یہ تھی "مرزا افضل بیگ نے اپنے کتے کا نام شیر کشمیر رکھا ہوا تھا" (صفحہ ۳۴۳) شیخ محمد عبداللہ نے اپنے بیٹے فاروق عبداللہ کو اپنا جانشین بنایا تو دلیل یہ دی کہ "موتی لال نہرو نے بھی تو اپنے بیٹے جواہر لال کو اپنا جانشین بنایا تھا" (صفحہ ۳۶۱)

کشمیر کی دستور ساز اسمبلی کے ایک رکن مولوی عطاء اللہ سہروردی تھے انہوں نے اسمبلی میں تقریر کی اور فرمایا کہ "اب وقت آ گیا ہے کہ ریاست جموں کشمیر کو مکمل اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا کام شروع کیا جائے اور اسے سارے ہندوستان میں پھیلایا جائے۔ شیخ عبداللہ نے انہیں ڈانٹا اور تنبیہہ کی" (صفحہ ۳۵۸)

کشمیر کی تاریخ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے ۱۹۳۱ کی حد فاصل کا بہت ذکر کیا ہے اور اسے سیاسی اتھل پتھل کا نام دیا ہے مگر اس سلسلہ میں شیخ عبداللہ کی مساعی کے ساتھ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی مساعیء جمیلہ کا کہیں ذکر نہیں۔ البتہ مہاراجہ کے کشمیر سے فرار کو "مہاراجہ کی ہجرت کے نام سے موسوم کیا ہے" (صفحہ ۱۱۶۔۱۱۷) اور اس بات کا بھی "ملک کی ساری فضائی طاقت کو جموں کشمیر میں فوج پہنچانے کے لئے تعینات کیا گیا تھا" (صفحہ ۱۱۹)

آپ نے شاہجہاں کے عہد میں چشمہ ویری ناگ کے قریب ایک کتبہ پر کندہ کئے گئے۔ اس شعر کا حوالہ بھی دیا ہے کہ "اگر فردوس بر روئے زمین است۔ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است"۔ ساتھ میں ٹامس مور کی شہرہ آفاق بات آپ نے درج کی ہے کہ "اگر عورت ایک اجاڑ اور ویران جگہ کو پر فضا بنا سکتی ہے تو اندازہ لگایئے کہ وہ کشمیر کو کیسی جنت کا نمونہ بنا دے گی۔ قدرت نے وادیء کشمیر کو

وہاں کے لوگوں کے لئے تحفہ بنایا تھا مگر بدقسمتی سے یہ ان کے لئے مصیبت اور استحصال کا موجب بن گئی" (صفحہ ۸۰) ڈوگرہ راج میں کشمیریوں کا جو استحصال ہوا اس کا ذکر ٹھاکور صاحب نے کیا ہے مگر کم کم کیا ہے۔ ان جیسے منصف انسان سے زیادہ کی توقع تھی۔

آپ ہالینڈ کے دورے پر گئے تو وہاں عالمی عدالت انصاف کے ہندوستانی جج سردار نگندر سنگھ تھے آپ نے انہیں عدالت دکھائی اور بتایا کہ مقدمہ کے دوران جج صاحبان اپنی مرضی کی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں یا نیند کرتے ہیں جبکہ وکیل اپنی تقریر پڑھتے رہتے ہیں۔ "پاکستان کا ظفر اللہ اپنی داستان پڑھا کرتا تھا" (صفحہ ۳۷۱) خدا معلوم آپ کو خاص طور سے پاکستان کے ظفر اللہ کا ذکر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ شاید اس لئے ہندوستان سیکیوریٹی کونسل میں اپنا کشمیر کا کیس مظلوم بن کر لے کر گیا تھا مگر ظفر اللہ نے انہیں ظالم بنا کر کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس سکرٹری ایلن کیمپبل جانسن اپنی کتاب مشن ود ماؤنٹ بیٹن میں "گورنمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں ہونے والی ۱۷ فروری ۱۹۴۸ کی سٹاف میٹنگ کی روداد لکھتے ہوئے لکھتے ہیں" ہماری سٹاف میٹنگ میں ماؤنٹ بیٹن نے کشمیر کی مایوس کن صورت حال کا جائزہ لیا اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں لے جانے سے کم از کم فوری جنگ کا خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر ایک نیا خطرہ ابھر رہا ہے۔ جس کی حقیقت کو جاننا یہاں ہمارے لئے تو آسان ہے مگر لندن کی حکومت یا لیک سکسیس میں موجود مندوبین کے لئے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ حکومت ہند اور سیاسی لحاظ سے بیدار لوگوں کے ذہن میں بہت سے خدشات جنم لے رہے ہیں جنہیں مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو انڈیا اور برطانیہ کی حکومتوں کے خوشگوار تعلقات میں بہت بری طرح رخنہ پیدا ہو سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ اقوام متحدہ اس بنیادی مطالبے ہی کو تسلیم کرنے میں تاخیر اور تعویق کر رہی ہے کہ "کشمیر پر باہر سے حملہ کیا گیا ہے" اور اس بات پر یہاں بڑی تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے امریکی اور برطانوی مندوبین وارن آسٹن اور نوئیل بیکر' نامعلوم وجوہات کی بنا پر شرمناک طور پر پاکستان کے حق میں ہیں اس کا لازمی اور قدرتی نتیجہ مایوسی ہے"۔

"ادھر تعلقات عامہ کے میدان میں ہماری کارکردگی میری توقعات سے کہیں بڑھ کر مایوس کن ہے۔ پریس والوں کو مجبور کر کر کے آئنگر کی تقریروں کے بڑے بڑے نہ ہضم ہونے والے حصے

چھاپنے پر مجبور کیا گیا تھا اور وہ بھی جب ان تقریروں پر کئی کئی دن گذر چکے تھے۔ شیخ عبداللہ کی شخصیت اور لیک سکسیس کے طریق کار میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکی اور اس کا ہندوستانی وفد کو بڑا نقصان اٹھانا پڑا مزید برآں پاکستان کے مندوب ان کے وزیر خارجہ ظفر اللہ خاں تھے جو اقوام متحدہ کے روزمرے کا وسیع تجربہ رکھتے تھے اور کئی بار اس کا کامیاب تجربہ کر چکے تھے وہ اس میدان میں جتنے شائستہ ورواں تھے بھارت کے مندوب اتنے ہی الجھے ہوئے اور ناموزوں تھے!" (مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ صفحہ ۲۸۶ ۲۸۷)۔ اس لئے ٹھاکور صاحب کی یا جسٹس نگندر سنگھ کی ناراضگی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔

اندرا گاندھی نے انہیں بتایا کہ ایک سعودی بادشاہ ہندوستان کے دورے پر تشریف لائے تو بار بار تاکیدی احکامات دئے گئے کہ وہ پرہیزی کھانا کھاتے ہیں اس لئے اس کا خاص اہتمام کیا جائے گا۔ ان کے اپنے باورچی اور متعلقہ لوگ آئے کھانا تیار ہوا لگایا گیا مگر" بادشاہ اپنے سعودی کھانے کھانے کے بعد ہندوستانی کھانوں پر پل پڑے اور سب کچھ کھا گئے" (صفحہ ۵۳۹)۔

۱۹۸۶ کے الیکشن کے بعد وی پی سنگھ پر وزیر اعظم بننے کے لئے بہت دباؤ تھا مگر" وی پی سنگھ اپنی رہائش گاہ سے بھاگ کر روپوش ہو گئے۔ بعد کو انہیں بتایا کہ وہ اس لئے روپوش ہوئے تھے کہ وہ ہفتہ میں دو بار ڈایالیسیز پر ہیں اور کسی طور سے قوم کی توقعات پر پورا نہیں اتر سکتے تھے" (صفحہ ۵۴۴) حیرت کی بات ہے کہ ایسے لوگ بھی ابھی دنیا میں باقی ہیں جو قومی مفاد کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں؟ ہمارے ہاں تو مفلوج و معذور لوگ اقتدار سے چمٹے رہتے تھے۔

غرض ڈی ڈی ٹھاکور صاحب کی یہ خودنوشت دلچسپ اور معنی نگر خودنوشت ہے۔ آخری باب "دنیا کے بارے میں میرے تاثرات" کے عنوان سے ہے اور زندگی کے باب میں ان کی چھوٹی چھوٹی حکیمانہ باتوں کا آئینہ دار ہے جو آپ نے اپنے تجربات سے سیکھی ہیں۔

لطف اللہ کی آپ بیتی

انیسویں صدی کی ابتدا یعنی ۱۸۰۲ میں پیدا ہونے والے ایک ہندوستانی مسلمان، لطف اللہ کی انگریزی میں لکھی گئی خودنوشت ''لطف اللہ کی آپ بیتی'' کے عنوان سے ۱۸۵۷ میں لندن سے شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت مصنف کی زندگی کے پہلے بیالیس برسوں کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نے اپنی انگریزی خودنوشت کا مسودہ کرنل سائیکس کو ۱۸۵۷ میں لندن بھیجا جسے کرنل سائیکس نے لطف اللہ کے شاگرد مسٹر ایڈورڈ ایسٹ وک کے سپرد کر دیا اور مسٹر ایسٹ وک نے اسی سال اسے لندن سے طبع کروا دیا۔ ایک سال کے اندر اندر اس کتاب کے تین ایڈیشن چھپے۔ اس کتاب کا عکس ۱۹۸۷ میں یعنی سوا صدی کے بعد دہلی سے چھپا مگر اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر مبارک علی نے ۱۹۹۶ میں فکشن ہاؤس لاہور سے شائع کیا ہے۔

لطف اللہ، مالوہ کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کا سلسلہء نسب پندرہ واسطوں سے بابا فرید گنج شکر تک پہنچتا ہے۔ صغر سنی ہی میں باپ کے سایہ سے محروم ہونے کی وجہ سے بہت مصائب کا شکار ہوا۔ والد جس درگاہ سے وابستہ تھے اس کے دیگر وابستگان اسے درگاہ کی آمدنی سے محروم رکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اسے ڈبو کر جان سے مار دینے کی کوشش بھی کی اس وقت جب لطف اللہ جان بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا بلکہ ڈوب ہی چکا تھا ایک نیک دل برہمن نے اس کی جان بچائی اور اسے اس کی والدہ کے پاس لے آیا۔ ماں نے اپنی چوڑیاں اور دس روپے برہمن کو شکریہ کے طور پر دیئے مگر اس نیک دل برہمن نے کوئی معاوضہ لینے سے انکار کر دیا (لطف اللہ کی آپ بیتی صفحہ ۳۳)۔ ان حالات میں لطف اللہ اپنی ماں اور ماموں کے ساتھ ہجرت کر کے پہلے بڑودہ اور پھر

اجین چلا گیا وہاں اس کی ماں نے جس کی عمر اس وقت ۲۷ سال تھی اپنے بھائی کے اصرار پر شادی کر کے اپنا گھر بسا لیا۔ (صفحہ ۴۱)۔ یہ ماحول بھی اسے راس نہ آیا اور وہ جہاں گردی پر نکل کھڑا ہوا۔ لطف اللہ نے اپنی محنت سے انگریزی عربی اور فارسی سیکھی اور انگریزوں کو اردو پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔ اس کی انگریزی، عربی، مراٹھی اور فارسی کی مہارت اس کے کام آئی اور وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے ساتھ بہ طور استاد اور مترجم وابستہ ہو گیا۔ ایڈورڈ ایسٹ وک جس نے لندن سے اس کی خودنوشت چھپوائی تھی اس کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کا شاگرد اور دوست تھا۔ اس کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ خود انگریز اس سے پوچھتے تھے کیا تمہارے ماں باپ میں سے کوئی ایک انگریز ہے؟ (صفحہ ۱۳۴) لطف اللہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے متوسلین سے وابستگی کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے سارے ہندوستان میں گھومنے پھرنے کا موقع مل گیا۔ سورت، بمبئی، پھر سندھ کے مختلف مقامات پر وہ ایسٹ انڈیا کے فوجیوں کے ہمراہ گھومتا پھرتا اور اپنے فرائض سر انجام دیتا رہا۔ میران سندھ کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو معاہدہ کیا اس کا فارسی ترجمہ لطف اللہ نے ہی کیا تھا اور معاہدہ پر دستخطوں کے وقت بھی وہاں موجود تھا۔

۱۸۴۳ میں سورت کے نواب افضل الدین خاں کے انتقال پر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپردازوں نے نواب کے وارثوں کو وراثت سے محروم کر دیا تو نواب کے داماد نواب جعفر علی خاں نے اپنی شکایات کے ازالہ کے لئے لندن جانے اور وہاں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں سے دادرسی کا فیصلہ کیا۔ لطف اللہ اسی سلسلہ میں جعفر علی خاں کے ساتھ مترجم اور مشیر بن کر گئے تھے۔ اس خودنوشت کا آخری باب ان کے سفر لندن سے وابستہ ہے۔

یہ خودنوشت انیسویں صدی کے ہندوستان کی بھرپور تصویر کشی کرتی ہے۔ ہندوؤں مسلمانوں کے تمدن اور جاگیرداری نظام کے زوال، مرہٹہ گردی، مرکزی نظام اقتدار کی کمزوری، ملک میں پھیلی ہوئی ہمہ گیر افراتفری، مسلمانوں کے ڈوبتے ہوئے اقتدار اور انگریزوں کے پھیلتے ہوئے مقبوضات کا آنکھوں دیکھا حال اس سے بہتر انداز میں کہیں بیان نہیں ہوا غالباً اسی لئے جب ۱۸۵۷ میں یہ کتاب لندن میں چھپی تو ایک سال کے اندر اندر اس کے تین ایڈیشن نکل گئے۔ حق تو یہ تھا کہ یہ کتاب اردو

میں بہت پہلے منتقل کردی جاتی مگراب آ کے ہوئی ہے اور ہماری تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔

اس خودنوشت کا ذکر پہلے پہلے ہم نے مشفق خواجہ کے ایک کالم میں پڑھا۔ مشفق خواجہ نے ڈاکٹر مبارک علی کے کئے ہوئے ترجمہ پر تنقید کی تھی اور اسے ناقص اور غیر مستند قرار دیا تھا کیونکہ مشفق خواجہ کے سامنے ۱۹۸۷ سے دہلی سے شائع شدہ انگریزی کتاب موجود تھی جس پر ڈاکٹر اکبر علی کا مقدمہ تھا۔ خواجہ صاحب ہی نے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کے ایک مقالہ کا حوالہ بھی دیا ہے جنہوں نے ''سورت میں لطف اللہ کی شاندار حویلی اور ان کا شاندار کتب خانہ دیکھا تھا جس میں انگریزی فارسی اور عربی کی ہزاروں نادر و نایاب کتابیں تھیں'' (خامہ بگوش کا کالم مورخہ ۱۶ جنوری 1997)۔ لطف اللہ کی یہ خودنوشت ۱۸۴۳ تک کے حالات کو محیط ہے خود ان کا کہنا ہے کہ ''۱۸۴۴ سے ۱۸۵۴ کے دور کو میں نے نہیں چھیڑا۔ اس عرصہ میں میں نے کئی نشیب و فراز دیکھے ان کی تفصیل کے لئے مجھے دوسری کتاب لکھنی ہوگی میرا ارادہ ہے کہ یہ میں اس وقت لکھوں گا جب میں ملازمت سے فارغ ہو کر اپنے وقت کا مالک ہوں گا'' (صفحہ ۲۵۲) مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ لطف اللہ نے خودنوشت کا دوسرا حصہ لکھا یا نہیں؟ اس خودنوشت کے اواخر میں درج ہے کہ ''۱۵ جنوری ۱۸۴۷ کو میری بیوی ہیضہ کی بیماری میں مبتلا ہو کر دار فانی (سے) سدھاری۔۔۔ ۱۲ جولائی ۱۸۴۷ کو بروز پیر میری شادی ولایت خانم سے ہوئی جو نجیب النساء بیگم کی منہ بولی بیٹی تھی اس خاتون سے میرے ایک لڑکا اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں میری گھریلو ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں میری عمر کافی ہو چکی ہے میری آمدنی میری فیملی کی ضروریات سے کم ہے لیکن میں نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے ہر چیز اس پر چھوڑ دی ہے'' (صفحہ ۲۵۳)۔ اگر ڈاکٹر مدنی کی بات درست ہے تو لطف اللہ کے حالات یقیناً سدھر گئے ہوں گے اور انہوں نے واپس اپنے وطن میں پہنچ کر اپنا مکان اور شاندار کتب خانہ بنوایا ہوگا۔

اس خودنوشت کے مندرجات نہایت دلچسپ ہیں۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کے تمدن پر اتنی تفصیل سے کسی نے روشنی نہیں ڈالی جتنی اس خودنوشت میں موجود ہے۔ مسلمانوں کے ہاں ختنوں کا رواج یہودیوں سے آیا تھا اور لطف اللہ کے قول کے مطابق ''اس پر تمام مسلمان، سوائے دہلی کے شاہی خاندان کے پوری طرح عمل کرتے ہیں'' (صفحہ ۴۰)۔ ایک پندرہ سالہ ہندو بیوہ کے ستی ہونے کا

آنکھوں دیکھا حال بھی ہے (صفحہ ۱۳۱) سمندر میں سفر کرتے ہوئے کشتی کے ایک جانب نمکین پانی کی لہر کا اور دوسری طرف میٹھی لہر کا ذکر ہے (صفحہ ۱۶۱) سندھی اور بلوچی لوگوں کی وطن پرستی کا بیان بھی ہے اور ان کی مجبوریوں کا احوال بھی۔ کہیں کہیں ہلکے مزاح کا چھینٹا بھی مل جاتا ہے ''سندھ میں مرغ زیادہ مذہبی ہیں کیونکہ صبح کے علاوہ رات کو بھی بانگیں دیتے ہیں'' (صفحہ ۱۶۵)

انگلستان کے سفر کے دوران لطف اللہ مصر میں رکے اور دوران سفر اسلام پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہے۔ حجاز سے آگے گذرنے کے بعد جب نماز کے لئے مغرب کی بجائے مشرق کی جانب رخ کیا تو انہیں بہت طنز و تعریض کا نشانہ بننا پڑا کہ انگریزوں کے ساتھ رہ کر کافر ہو گئے ہیں بھلا کعبہ اپنی سمت کیسے تبدیل کر سکتا ہے؟ (صفحہ ۲۲۸) لندن میں بھی لطف اللہ کا وقت بیکار نہیں گذرا۔ اہم مقامات پارلیمنٹ ہاؤس اور میوزیم دیکھے۔ ملکہ کے ہاں انہی دنوں ایک شہزادے کی ولادت ہوئی تھی اسے اپنے آقا کی جانب سے تہنیت کا پیغام ونڈسر کاسل میں جا کر دیا۔ (صفحہ ۲۵۱) مستشرقین سے ملے۔ اپنے شاگردوں کے علاوہ معززین سے ملاقاتیں کیں اور اپنے سمندر پار سفر کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ غرض یہ خودنوشت بڑی دلچسپ اور معلومات افزا خودنوشت ہے امید ہے ہماری اردو خودنوشتوں میں اپنی تاریخی معلومات کی وجہ سے اہم خودنوشت سمجھی جائے گی۔

زندگی ایک سفر۔احوالِ خود

امریکہ میں مقیم ، پاکستان کی وزارت خارجہ کے وظیفہ یاب کارکن جناب صلاح الدین ناصر نے اپنی خودنوشت ''زندگی ایک سفر: احوالِ خود'' کے عنوان سے مرتب کی ہے جسے رودادپبلی کیشنز اسلام آباد نے ۲۰۱۰ میں شائع کیا ہے۔صلاح الدین ناصر ۱۹۲۹ میں ہندوستان کی ریاست پٹیالہ میں پیدا ہوئے اوراپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے پاکستان میں آباد ہوئے۔میٹرک کرنے کے بعد کراچی میں بر ماشیل کی ملازمت کرلی پھرراولپنڈی جی ایچ کیو میں ملازم ہوئے۔انقرہ میں پاکستانی ملٹری مشن سے وابستہ رہے۔مقابلہ کا امتحان پاس کر کے وزارت خارجہ میں منتقل ہو گئے اور مسقط اور نیو یارک میں پاکستان مشن سے وابستہ رہے اب وظیفہ یابی کے بعدورجینیا میں مقیم اوراپنے اعیال واحفاد کے درمیان مطمئن زندگی بسر کررہے ہیں۔ان کی اہلیہ محترمہ طویل عرصہ سے نابینا ہونے کے باوجودان کی ہمدم ودمساز ہیں۔

اس خودنوشت کومحض اس لئے خودنوشت کہا جاسکتا ہے کہ اس میں صلاح الدین ناصر کے احوال مذکور ہیں ورنہ فنی لحاظ سے اس کتاب میں خودنوشتوں والی کوئی فنی خوبی موجودنہیں۔جس طرح ہر کلام موزوں شعر ہوتا بھی ہے اورنہیں بھی ہوتا اسی طرح یہ خودنوشت بھی ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے'' کے زمرے میں آتی ہے۔ابتداحمد یہ کلام سے ہوتی ہے پھرنعت مبارک درج ہے پھر احوال خود کا بیان شروع ہوتا ہے۔درمیان میں ان کی شاعری کا چرچا شروع ہوجاتا ہے پھر شاعری کے فن پران کے ناپختہ تنقیدی افکار راہ روکتے ہیں۔وظیفہ یابی کے بعدان کی شعری کاوشوں کی تقریبات اجراء کی رودادیں ہیں پھرنعتیہ مشاعروں کی پوری تاریخ درج ہے پھران کے مضامین ہیں اوراواخر میں ان کی

زندگی کا نچوڑ حکمت کی باتیں ہیں۔یہ ساری چیزیں جس طرح اس کتاب کا حصہ بنی ہیں اس نے اس خودنوشت کو کمزورفنی خودنوشت بنادیا ہے۔اے کاش صلاح الدین ناصر صاحب صرف احوال خود والا حصہ خودنوشت کے طور پر علیحدہ مرتب کر کے زیورطبع سے آراستہ کرتے۔باقی چیزیں اپنی علیحدہ حیثیت سے چھپتیں!

صلاح الدین ناصر کی شخصیت کا جو پہلوسب سے زیادہ نمایاں ہوکرابھرتا ہے وہ ان کی دینداری اور مذہب سے وابستگی ہے۔فرائض کی انجام دہی میں مستعدی اور دیانت داری بھی ان کے ہاں موجود ہے اوریہی وہ صفات ہیں جو ہمارے سرکاری ملازمین میں الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔ہمارے ہاں مذہب سے گہری وابستگی رکھنے والوں کا تصور عام طور سے تنگ نظراور متعصب لوگوں کا تصور ہے مگرالحمدللہ صلاح الدین ناصراس تعصب کا شکارنہیں۔مسجدوں اور تبلیغی اداروں سے انہیں شغف ہے مگران اداروں سے منسلک لوگوں کی مفاد پرستانہ روشیں انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں اور جہاں بات کہنے کا موقعہ آتا ہے جرات سے بات کہہ بھی جاتے ہیں۔آپ نے اپنے علماء کی ہٹ دھرمی کی بات خوب کہی ہے کہ ''مولوی صاحب نے اپنے عالم باعمل ہونے اور چاند دیکھنے کی حدیث شریف پر سختی سے کاربند رہنے کے ضمن میں فرمایا دیکھئے دنیا کہتی ہے کہ زمین گول ہے مگر میں نہیں مانتا کیونکہ میرے آقا صلی اللہ علی وسلم نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ زمین گول ہے'' (زندگی ایک سفرصفحہ ۱۸۲)۔

ان کی دین سے وابستگی جہاں مستحسن نظرآتی ہے وہاں ان کی اس بات پر حیرت بھی ہوتی ہے کہ ضیاء الحق کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقعہ ملنے کواپنی سعادت خیال کرتے ہیں ''ضیاء الحق ظہراور کبھی کبھی عصر کی نماز بھی (فارن آفس میں پڑھتے تھے) ان کے ساتھ نماز پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوتی تھی'' (صفحہ ۱۰۸) حالانکہ جس شخص نے پاکستان میں عموماًاور ساری دنیا میں خصوصاً اسلام کے پرامن مذہب ہونے کے تصور کوناقابل تلافی نقصان پہنچایا وہ ضیاء الحق تھااور پاکستان اب تک اس ظالم اور منافق شخص کے کرتوتوں کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔بھٹو کے زوال کے بعد کا منظرانہی کا بیان کردہ ہے کہ ضیاء الحق نے اقتدارسنبھالاتو ''کوثر نیازی کی کتاب 'دیدہ ور' پھاڑ پھاڑ کرجلائی گئی'' (صفحہ ۱۰۱) تاکہ ضیاء الحق کے عتاب سے بچاجائے ایسے کینہ پرور شخص کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقعہ ملنا کیسی سعادت

ہے؟

ان کی ملازمت کا بیشتر حصہ وزارت خارجہ میں گذرا اس لئے ہمارے سفارت کاروں کے بارے میں ان کے تبصرے خاصے کی چیز ہیں۔ جمشید مارکر صاحب جیسے ذہین سفارت کار کا ذکرِ خیر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی (صفحہ ۱۲۱) مارکر صاحب ہمارے اوساکا یونیورسٹی جاپان کے وزیٹنگ پروفیسر ہونے کے زمانے میں وہاں پاکستان کے سفیر کبیر تھے ہم نے بچشم خود ان کی کامیاب سفارت کے کارنامے دیکھے ہیں۔

ہمارے مولوی لاؤڈ سپیکر سے جس طرح ناجائز فائدہ اٹھاتے اور شہریوں کے امن و امان میں خلل ڈالتے ہیں اس کا ذکر بھی آپ نے صفحہ ۲۴۹ پر کیا ہے۔ ہمیں جنرل اکبر خاں رنگروٹ کی خود نوشت یاد آرہی ہے جس میں آپ نے لکھا ہے کہ ’’قائداعظم نے انہیں حکم دیا کہ وہ نماز عید کے موقعہ پر عوام سے خطاب کرنا چاہیں گے اس کے لئے مسجد میں لاؤڈ سپیکر لگایا گیا تو تین مولوی دوڑتے ہوئے آئے اور اڑ گئے کہ ہم مسجد میں اس شیطانی آلہ کو استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ جب لاؤڈ سپیکر کی تار جوڑی گئی تو مولویوں کو جھٹکا لگا تو دھم سے لیٹ گئے۔۔۔ پھر کسی نے اعتراض نہیں کیا‘‘ (میری آخری منزل صفحہ ۱۰۷) وہی شیطانی چرخہ اب نفرت پھیلانے کے لئے مولویوں کا بڑا آلہء کار ہے۔

غرض صلاح الدین ناصر صاحب کی یہ کتاب فنی لحاظ سے ناقص خود نوشت ہونے اور اپنے ہی اشعار کو جا بجا سند کے طور پر پیش کرنے کی کم ذوقی کے باوجود مصنف کے اخلاص کی وجہ سے پڑھنے والوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے۔

❁

خوں بہا

مشہور ڈرامہ نگار، ادیب اور مفکر حکیم احمد شجاع کی مختصر خود نوشت ’’خوں بہا‘‘ ۱۹۹۱ میں آتش فشاں پبلکیشنز لاہور کی جانب سے تیسری بار چھپی اس کی تصویری نقل میرے دوست ڈاکٹر داؤد رہبر نے مجھے بھیجی ہے۔ یہ کتاب پہلی بار کوئی اڑتالیس برس قبل چھپی تھی۔ منیر احمد منیر نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ اس کی تبویب حکیم صاحب نے کچھ یوں کی تھی ’’تاثرات‘‘۔ ’’تصورات‘‘۔ ’’تجلیات‘‘ اور ’’تبرکات‘‘ کے عنوانات ان کی شاعری کو محیط تھے ’’تخیلات‘‘ کا باب ان کے تجربات و مشاہدات کی بھٹی میں ڈھلے ہوئے اقوال پر مبنی تھا آخری باب ’’پچھلے پچاس برس‘‘ کے تحت ان کی یادداشتیں مجتمع تھیں۔ پچھلے پچاس برس کے ساتھ حصہ اول ۱۸۹۳ سے ۱۹۱۵ درج تھا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ میں اور دوسرا ۱۹۵۰ میں شائع ہؤا‘‘ (پیش لفظ صفحہ ۷)۔ خود حکیم صاحب نے تعارف کے عنوان سے لکھا ہے ’’پچھلے پچاس برس کی یہ سرگزشت اس لحاظ سے ایک قیمتی یادداشت ہے کہ اس میں ضمناً ان لوگوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ ہے جن کے کارناموں کی درخشانی سے ہندوستان کی مجلسی اور سیاسی تاریخ کے اوراق منور ہیں اور اس میں تلمیحاً ایسے واقعات و حالات قلم بند ہوگئے ہیں جن کے اثرات ہمارے وطن کی عظمت کے امتیازی نقش و نگار اور ہماری پرانی تہذیب کے خط و خال ہیں۔ نقادان ادب کی رائے میں یہ روداد، اسلوب نگارش اور انداز بیان کے اعتبار سے مستقل ادبی تاریخی وقعت رکھتی ہے اسی لئے میں نے مشاہدات و تاثرات کے اس باب کو بھی اپنی زندگی کا ایک شعر سمجھ کر ایک مستقل عنوان کے تحت اس کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں۔ گفتہ آید در حدیثِ دیگراں۔‘‘ (صفحہ ۱۱) حکیم صاحب نے حدیث دیگراں کو اپنے احوال کے بیان کے لئے چنا

ہے۔اے کاش اس کا دوسرا حصہ بھی لکھا گیا ہو یا لکھا گیا ہوتا اور چھپ کر دنیا کے سامنے آجاتا تو اس دور کی تہذیبی تاریخ کا بے بہا مرقع ہوتا۔ حکیم صاحب کا تعلق لاہور کے اس معروف گھرانے سے تھا جس کے ساتھ لاہور کے اکابر سر عبدالقادر سر اقبال سر شہاب الدین خواجہ رحیم بخش خواجہ کریم بخش خواجہ امیر بخش خلیفہ نظام دین شیخ گلاب دین مولوی احمد دین (صاحب سرگزشت الفاظ) اور شیخ گلاب دین مؤلف (قانون شریعت ورواج) کے گہرے تعلقات اور اٹھنا بیٹھنا تھا (صفحہ ۱۶)

ان کے عم زاد بھائی حکیم امین الدین بیرسٹرایٹ لاء نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جس کی روداد شورمحشر نامی مجلے میں شائع ہوتی تھی۔ مشہور ادیب خان احمد حسین خاں اس کے مدیر تھے۔ اقبال نے اپنی گورنمنٹ کالج کے طالب علمی کے زمانے کی پہلی غزل اسی مشاعرہ میں پڑھی اور اسی مجلہ میں چھپی اس کا شعر اب تک زبان زد خلق ہے موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے۔ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے۔ (صفحہ ۱۳)۔

حکیم صاحب کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب ابھی ان کی عمر ڈھائی برس کی تھی۔ والدہ نے جو نصیحت انہیں کی وہ آب زر سے لکھ رکھنے کی ہے کہ ''اس طرح پڑھا کرو۔ گھر میں اور گھر سے باہر ایسے رہا کرو کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ تمہارا باپ تمہارے سر پر موجود نہیں'' (صفحہ ۱۸) ان کی آٹھ بہنیں تھیں اور یہ اکیلے بھائی تھے۔ اپنے خاندان میں اکلوتی نرینہ اولاد ہونے کی وجہ سے چچا نے بھی نہایت محبت وشفقت سے ان کی پرورش اور تربیت کا خیال رکھا۔ سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں تعلیم پائی۔ اس دوران مولانا ابوالکلام آزاد ان کے استاد مولوی غلام رسول سے ملنے کو ان کے سکول تشریف لائے۔ اس وقت مولانا کی عمر سولہ سال کی تھی اور خبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر تھے۔

مولوی غلام رسول نے مولانا سے کہا ''میرے شاگردوں کو بھی ایک دو لفظ پڑھا دیں تا کہ وہ آپ کی شاگردی کی سعادت سے بہرہ مند ہو جائیں'' یہ سنتے ہی علم وفضل کا ایک بحر مواج تھا کہ ابل پڑا۔۔۔'' (صفحہ ۲۶) مولانا ابوالکلام آزاد نہایت صغر سنی ہی میں مسند ارشاد پر فائز ہو گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ ''میں ۱۹۰۴ میں پہلی بار مولانا شبلی سے بمبئی میں ملا۔ جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھے گھنٹے تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت

انہوں نے مجھ سے کہا تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں؟ میں نے کہا نہیں میں خود ہوں'' (خودنوشت مولانا ابوالا کلام آزاد صفحہ ۱۵۲) ان کی عمر کے بارے میں لوگوں کا استغراب قائم تھا اس لئے سولہ سال کی عمر کا جو واقعہ حکیم صاحب نے لکھا ہے وہ بعید از قیاس نہیں۔ اس وقت سے یہ خود کو مولانا کا شاگرد جانتے ہیں۔ اور واقعی ان کی تحریر پر یا مولانا ابوالکلام کا اثر ہے یا آغا حشر کاشمیری کا۔

۱۹۰۹ میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے اس کے بعد علی گڑھ کالج اور علی گڑھ کالج کا مشن ان کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ علی گڑھ میں دیگر رفقاء کے علاوہ تین شہزادے بھی ان کے ساتھ تھے نواب حمید اللہ خاں بھوپال، نواب احمد سعید خاں چھتاری اور پنجاب کے گورنر اور وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں۔ اس سرگزشت پر ۱۹۱۵ تک کی حد فاصل حکیم صاحب نے ڈالی ہے مگر ''میاں کے مہمان'' کی حیثیت سے حمید اللہ خاں سے ملنے بھوپال گئے ہیں تو اس کا تفصیلی حال بھی درج ہے حالانکہ یہ سفر ۱۹۲۲ میں کیا گیا تھا۔ اسی طرح آپ کی بیان کردہ قرآن حکیم کی تفسیر ''افصح البیان فی مطالب القرآن'' ۱۹۴۲ میں مکمل ہوئی (صفحہ ۵۵) اس کا بھی تذکرہ موجود ہے۔

اب ان کے احوال الرجال کا تذکرہ۔ اس خودنوشت میں جہاں اپنے خاندانی ملازموں کا تذکرہ بڑے احترام سے کیا ہے (صفحہ ۲۷) وہاں علی گڑھ کے ایک حجام اور ایک پوسٹ مین کا ذکر بھی موجود ہے (صفحہ ۳۷) علی گڑھ کے ساتھیوں میں مسعود حسین کمبوہ کا ذکر خیر ہے جو عرف عام میں مسعود ٹامی کے نام سے جانے جاتے ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ ہر علیگ نے کیا ہے۔ پاکستان کے سابق گورنر جنرل ملک غلام محمد صاحب کا ذکر بھی ہے وہ ان کے طالب علم ہم عصر تھے جنہیں حیدرآباد کے مشتاق احمد خاں نے اپنی خودنوشت میں انہیں ان کی لمبی ناک کی وجہ سے ''لارڈ نوز بری'' کے نام نامی سے یاد کیا ہے۔ (کاروان حیات صفحہ ٦٨) مولانا سہا کا ذکر ہے جو ''بہت پست قامت لاغر اور نحیف البدن ہیں مگر خدا نے تمام جواہر کمال ان کی ذات میں کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں اکثر لوگ انہیں دیکھ کر طفل صغیر سن کا دھوکا کھا جاتے ہیں'' (صفحہ ۷۷) جوش صاحب نے بھی ان کے محاسن کا مبالغہ آمیز تذکرہ کیا ہے مگر سالک صاحب کی بات ان کی شخصیت کو واضح کرنے کو بس ہے۔ اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں ''قید سے میری رہائی کے بعد سید احمد شاہ بخاری نے دہلی مسلم ہوٹل میں دعوت

طعام دی۔ جس میں سب احباب جمع ہوئے۔ میں کمرے کے دروازہ میں کھڑا سب سے علیٰ قدر تعلق مصافحہ ومعانقہ کرر ہا تھا کہ اتنے میں حکیم احمد شجاع اور مولانا سہا حیدر آبادی تشریف لائے۔ مولانا سہا آگے آگے تھے۔ میں سمجھا حکیم صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ میں نے مولانا کے شانے کو تھپتھپا کر اور چمکار کر کہا '' بیٹے وہاں جا کر گاؤ تکیے کے پاس بیٹھ جاؤ'' مولانا نے اپنا دلفریب چہرہ اٹھا کر مجھ پر کڑی نگاہ ڈالی۔ حکیم صاحب نے فوراً فرمایا '' سالک صاحب ان سے ملئے مولانا سہا حیدر آبادی نہایت بلند پایہ شاعر اور ادیب ہیں اور کچھ مدت سے انہوں نے میرے غریب خانے کو مشرف کر رکھا ہے'' (سرگزشت صفحہ ۱۸۱)۔ اس کے علاوہ مولانا سالک نے ایک فکاہیہ میں بھی ان کا ذکر کیا تھا جو مجھے یاد تو ہے مگر اس کا حوالہ درج کرنا ممکن نہیں سالک صاحب نے لکھا تھا '' مولانا سہا کرسی پر بیٹھے اپنے پاؤں ہلا جھلا رہے تھے میں نے کہا بیٹا بزرگوں کی محفل میں تہذیب سے بیٹھا کرتے ہیں کسی نے ٹوکا اور بتایا کہ آپ بھی غضب کر رہے ہیں یہ مولانا سہا ہیں۔ یہ سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ میں اٹھا تو مولانا بھی اٹھے میں سمجھا ابھی اور بھی اٹھیں گے''۔

حکیم صاحب آغا حشر کے شاگرد رہے انہی کے اسلوب میں بے شمار ڈرامے لکھے اور اپنا لوہا منوایا مگر تھیئیٹر کی دنیا ہی اجڑ گئی اس لئے نہ آغا حشر کے ڈرامے رہے نہ ان کے شاگرد۔ ان کا پہلا پہلا تعارف آغا حشر سے ۱۹۱۱ میں ہوا اور ۱۹۳۵ میں ان کی وفات تک قائم رہا۔

حکیم فقیر محمد لاہور کے مشہور عالم حکیم تھے ان کے دست شفا کا بہت شہرہ تھا مگر ان کی زبان ایسی صاف ستھری اور ادبی زبان تھی کہ بڑے بڑے ادیب ان کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ حکمت کے علاوہ پھبتی کہنے میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں '' اردو زبان پر کچھ اس طرح شیدا تھے کہ میں نے انہیں کبھی اردو کے سوا کسی دوسری زبان میں بات کرتے نہیں سنا۔ فن طبابت میں انہیں وہ دستگاہ تھی کہ دودمان شریف خانی کے کوکبِ اقبال مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں بھی ان کی ذکاوت تشخیص اور طریقہء علاج کی تعریف کیا کرتے تھے۔ خطاطی میں ان کو وہ ملکہ حاصل تھا کہ مریض ان کے نسخوں کا صحیح نستعلیق پڑھ کر ہی رو بصحت ہو جایا کرتے تھے۔۔۔ ضلع جگت پھبتی میں استاد تھے'' (صفحہ ۵۹) چراغ حسن حسرت نے بھی ان کا خاکہ لکھا ہے اور ان کی شخصیت کی تصویر کھینچ کر رکھ دی

ہے۔ حسرت لکھتے ہیں۔ '' معلوم ہوتا ہے حکیم صاحب نے پھبتیوں کا ایک علیحدہ قرابادین مرتب کر رکھا تھا جس میں ہر مرض کے لئے علیحدہ علیحدہ پھبتیاں مخصوص کر دی گئی تھیں۔ کچھ چھوٹی کچھ بڑی، کچھ ہلکی پھلکی کچھ بھاری بھر کم، کچھ مشتہی، کچھ مقوی، کچھ قابض، کچھ ملین، کچھ دافع طحال و ورمِ جگر، کچھ محللِ اورام، کچھ شربتِ انار کی طرح میٹھی، کچھ شاہترہ چرائیتہ کے جوشاندہ کی طرح کڑوی۔ وہ جیسا موقع سمجھتے تھے مناسب بدرقہ کے ساتھ استعمال کراتے تھے اور مریض کو بہت فائدہ ہوتا تھا'' (مردم دیدہ صفحہ ۶۹)۔ غرض حکیم احمد شجاع کی یہ مختصری خودنوشت اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی کیفیات وشخصیات کی عمدہ تصویر ہے۔ اس کی زبان آغا حشر کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اور ابوالکلام آزاد کے اسلوب میں رنگے ہوئے ادیب کی زبان ہے جس میں اہل زبان کا سالوچ اور اہلِ دل کی سی شیفتگی ہے۔

❁

علی گڑھ سے علی گڑھ تک

ڈاکٹر اطہر پرویز نے ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' کے عنوان سے اپنی یادداشتیں قلمبند کیں جنہیں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی نے پہلی بار ۱۹۷۷ میں شائع کیا۔ یہ یادداشتیں ہر چند کہ ان کی خودنوشت نہیں کہلاتیں مگر ان کی شخصیت کے تاروپود علی گڑھ کے گرد اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ انہیں علی گڑھ سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کا بھی یہی معاملہ تھا ان کی خودنوشت بھی دراصل ان کی نہیں علی گڑھ کی خودنوشت تھی۔ حال ہی میں راقم الحروف کو علی گڑھ کے بعض احباب کی خودنوشتیں پڑھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کا موقعہ ملا ہے علی گڑھ والوں کے اندر علی گڑھ رچا بسا ہوا ہے یا یہ لوگ علی گڑھ کی شخصیت کے اندر اس طرح مدغم ہوگئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا یا جدا سمجھنا ممکن اور روا نہیں رہا۔

علی گڑھ میں صرف مسلم یونیورسٹی ہی نہیں تھی یہ قصبہ ہی مسلمانوں کی تاریخ آزادی کا ایک جزو لاینفک تھا یہ علیحدہ بات ہے کہ تقسیم ملک کے وقت اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث اسے پاکستان کا حصہ بنانا ناممکن تھا اسی لئے قیام پاکستان کے بعد اس قصبہ کو اور قصبہ کے مسلمانوں کو بے پناہ مشکلات کا سامنا ہوا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی گردش میں آئی اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے مدبر نے اسے سنبھالا یہ انہی کی سعیء جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اب تک مسلم کی پہچان اس کے ساتھ منسلک ہے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز ۱۹۴۱ میں اس یونیورسٹی سے متعلق ہوئے گویا ۱۹۴۷ کے پرآشوب اور ہیجان خیز دور کے وہ عینی شاہد ہیں۔

میں نے کسی خودنوشت میں پڑھا تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو قیام پاکستان سے قبل

کانگریس سے وابستہ اور قیام پاکستان کے سخت خلاف تھے علی گڑھ کی ایک تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ مجھے کہا گیا تھا کہ اگر علی گڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا چاہتے ہو تو علی گڑھ کی جامعہ مسجد میں تقریر کرنا اور اگر ہندوستان بھر کے مسلمانوں سے مخاطب ہونا چاہتے ہو تو علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرنا۔ اب ڈاکٹر اطہر پرویز صاحب کی خودنوشت بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے ''علی گڑھ مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ہمیشہ سے کرتا رہا ہے یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت بھی نظر آتی ہے اور ان کی کمزوری بھی اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا مسلمان کیسے سوچتا ہے تو پھر آپ کو کشمیر سے راس کماری اور آسام سے پنجاب تک سفر کرنے کی ضرورت نہیں آپ دہلی سے ۸۴ میل دور علی گڑھ آجایئے'' (علی گڑھ سے علی گڑھ تک صفحہ ۵)۔

جناب بشیر حسین زیدی وائس چانسلر نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ''شمشاد مارکیٹ فرلانگ بھر لمبے ایک ایسے بازار کا نام ہے جو ہندوستان کے ہر چھوٹے قصبے میں نظر آتا ہے'' (صفحہ ۲) اس کتاب کا محور بھی وہی چھوٹا سا بازار ہے جسے شمشاد کہا جاتا ہے مگر صاحب بعض چھوٹے بازار یا سڑکیں بھی تو غضب ڈھایا کرتی ہیں۔ کرشن چندر کا افسانہ ''چھ فرلانگ لمبی سڑک'' ہمارے ہاں کے لاہور کی ایک چھوٹی سی سڑک ہے جو انارکلی سے شروع ہو کر کچہری روڈ تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے مگر اس کا ماحول اور اس کی معنویت ختم نہیں ہوتی۔ یہی حال شمشاد مارکیٹ کا ہے۔ اطہر پرویز نے اس بازار کو مرکز بنا کر علی گڑھ کی زندگی کے گرد پرکار سے ایسا دائرہ کھینچا ہے جس میں علی گڑھ کے لوگ علی گڑھ کے اساتذہ علی گڑھ کے طلبا سب کچھ سمٹ کر آگیا ہے۔

اطہر پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ اس کہانی میں فلیش بیک بہت ہیں کچھ مربوط کچھ غیر مربوط'' (صفحہ ۱۰) اور اسی غیر مربوط ''فلیش بیک'' کی وجہ سے یہ کتاب بہت دلچسپ بن گئی ہے۔ مجاز اور عصمت کی بات دہرادینے میں کوئی حرج نہیں ''مجاز علی گڑھ کے عاشق بھی تھے معشوق بھی۔۔۔ مجاز نے عصمت چغتائی کا خاکہ لکھا تھا کہ گرلز کالج کی لڑکیاں مجاز پر جان چھڑکتی تھیں اور ان کے نام کا قرعہ ڈالا کرتی تھیں کہ مجاز کی شادی کس سے ہوگی؟ یہ ان لڑکیوں کا مرغوب مشغلہ تھا۔۔۔ ۱۹۳۶ کی بات ہے میری ملاقات الہ آباد کے اسٹیشن پر مجاز سے ہوئی وہ بمبئی سے آرہے تھے۔۔۔ کہنے لگے ارے

میاں اس المیہ پر نظر نہیں پڑی کہ میرے نام گرلز کالج کی لڑکیاں قرعے ڈالا کرتی تھیں اور سنو یہ عصمت بھی ان قرعوں میں شریک ہوتی تھیں۔ لیکن ٹریجیڈی یہ کہ ایک طرف تو ہمارے نام کے قرعے پڑتے تھے اور دوسری طرف ہم لڑکی کی شکل دیکھنے کو ترستے تھے یہ لڑکیاں واقعی ظالم ہوتی ہیں عشق ہم سے کرتی ہیں اور شادی شاہد لطیف سے'' (صفحہ ۲۶)۔

دوسرا فلیش بیک سیاسی رہنما محمد علی جناح کا ہے ''جناح صاحب یونین ہال میں ایک جلسے سے خطاب کر کے نکلے اس کے بعد انہیں شہر کی جامع مسجد کے ایک جلسہ میں جانا تھا وقت کی تنگی تھی۔ یہ طے ہوا کہ جناح صاحب یونین کے کمرے میں لباس تبدیل کر لیں۔ ان کے سکرٹری کار سے اٹیچی کیس لے کر کپڑے نکالنے کمرے میں گئے اور کپڑے نکال کر اندر رکھ آئے۔ جب جناح صاحب کپڑے بدلنے کمرے میں گئے تو فوراً سوٹ ہاتھ میں لئے ہوئے نکلے اور وہیں سے سکرٹری سے مخاطب ہوئے 'یہ کپڑا نہیں لیڈر والا کپڑا مانگتا'۔۔۔ اس کے بعد جب وہ کپڑے پہن کر نکلے تو شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھے'' (صفحہ ۳۱)۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ نواب مزمل اللہ خاں کا نام گویا توام نام ہے۔ ان کا ذکر تو جہاں تہاں موجود ہے مگر ان کے صاحبزادے نواب رحمت اللہ خاں شیروانی کا ذکر بھی بڑا دلگداز ہے۔ مزمل منزل کے صدر پھاٹک کے پاس دودھ پور سے آنے والی سڑک کے تراہے پر پان والی کوٹھی کے بائیں جانب ایک تکونے پارک کی شکل میں زمین پڑی ہوئی تھی کلکٹر نے وہ زمین انہیں یعنی ڈاکٹر اطہر پرویز اور ان کے رفقاء کو ذاکر حسین سکول بنانے کے لئے دینے کا ارادہ کیا۔ اس کی اطلاع دینے کو یہ اپنے دوستوں کے ہمراہ نواب رحمت اللہ خاں شیروانی کے ہاں گئے۔ نواب صاحب کچھ ناراض سے نظر آئے۔۔۔ ''آپ یہاں سڑک پر بچوں کا سکول کھولیں گے مزمل منزل والی سڑک پر''؟ پہلے تو مجھے ان کا یہ انداز برا لگا لیکن دوسرے ہی جملہ نے اس اثر کو زائل کر دیا نواب صاحب نے فرمایا کل خدانخواستہ کسی گاڑی سے اسکول کا کوئی بچہ کچلا گیا تو لوگ یہی کہیں گے کہ نواب صاحب کی کوٹھی کے سامنے حادثہ ہوا۔ اسکول آپ بنائیں گے بدنامی مزمل منزل کی ہوگی۔ میں اس کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔ پھر بولے یہ آخر اتنی بڑی زمین جو میری کوٹھی میں ہے یہ کس دن کام آئے گی؟ جتنی زمین کی

ضرورت ہو لے لیجئے اور کام شروع کر دیجئے اور جب تک عمارت نہ بن جائے میرا ڈرائنگ روم استعمال کیجئے مگر ذاکر صاحب کے نام پر اسکول ضرور کھلنا چاہیے اور اس کے دروازے ہر مذہب وملت کے لئے کھلے ہونے چاہئیں'' (صفحہ ٦٨)۔ اس کو کہتے ہیں ماں باپ کے نام کو زندہ رکھنا! اگر باپ علی گڑھ پر دل وجان سے فدا تھا تو بیٹا پیچھے کیسے رہتا؟ ہمارے ہاں پنجاب کے دو علم دوست زمینداروں کا ذکر تو قدرت اللہ شہاب اپنی خودنوشت شہاب نامے میں کر چکے ہیں اور یہ ان کے ڈپٹی کمشنر ہونے کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک زمیندار نے سکول بنانے کے لئے زمین دینے کا وعدہ کیا۔ دوسرا زمیندار فریادی بن کر آیا کہ صاحب آپ کیا غضب کر رہے ہیں میرے علاقہ میں سکول کیوں کھول رہے ہیں؟ ڈی سی نے کہا آپ بھی زمین دے دیجئے میں آپ کے مخالف زمیندار کے علاقہ میں بھی سکول بنوا دوں گا۔ مگر اس کے بعد دونوں میں سے ایک بھی لوٹ کر نہیں آیا؟۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا!

علیگڑھ کے وائس چانسلروں کا ذکر خیر بھی اسی فلیش بیک کا حصہ ہے۔ ''میں سوچتا ہوں کہ علی گڑھ کا ذکر ہو اور وائس چانسلر کا ذکر نہ آئے تو بات کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ علی گڑھ میں وائس چانسلر اصل چیز ہوتی ہے۔ پروفیسر خورشید الاسلام اپنے تقرر کا واقعہ سناتے ہیں ان کے لیکچرر کی سیلیکشن کمیٹی ہوئی تو ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد نے ان کو اپنی کوٹھی پر بلایا جہاں اور باتیں کیں وہاں یہ نصیحت بھی کی کہ 'ہم نے تمہاری لیاقت دیکھ کر تمہارا تقرر کر دیا ہے اب محنت سے اپنا کام کرو اپنی تقریر کے فن سے یونیورسٹی کو فائدہ پہنچاؤ لیکن یاد رکھنا علی گڑھ میں رہنا ہے تو دو کے خلاف کبھی کچھ مت کہنا۔ ایک تو اللہ میاں کے خلاف دوسرے وائس چانسلر کے خلاف۔ سمجھے وائس چانسلر کے'۔ انہوں نے وائس چانسلر پر اتنا زور دیا کہ بچارے اللہ میاں پس پشت رہ گئے'' (صفحہ ۱۴۵)۔

ساحر لاہور سے ہندوستان گئے تو انہیں الہٰ آباد میں لمبے عرصہ تک انڈر گراؤنڈ زندگی گذارنا پڑی کیونکہ کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے پولیس کو مطلوب تھے (صفحہ ۱۵۳) پھر وہ بمبئی چلے گئے اور ان کے گیت سارے ہندوستان میں گونجنے لگے۔ مجاز کی بہن اور جاں نثار اختر کی بیوی صفیہ اختر کی حاضر جوابی کی ایک بات ہم نے پہلی بار ان کے ہاں پڑھی ہے ''علی گڑھ کی نمائش میں پشاور سے ایک دکان آیا کرتی تھی ''بھائیوں کی دکان'' اس پر سرمہ کاجل اور لڑکیوں کی ضرورت کا سامان ملا کرتا تھا صفیہ اپنی کچھ دوستوں

کے ساتھ کھڑی بھائیوں کی دکان سے کچھ سامان خرید رہی تھیں ایک من چلے نے ایک جملہ کہا اے کاش ہماری بھی بھائیوں کی دکان ہوتی تو ہمارے یہاں بھی بھیڑ ہو جاتی۔ صفیہ نے مڑ کر کہا پریشان مت ہوئیے بھائیوں کی دکان نہیں ہے تو بہنوں کی رکھ لیجئے بہت بھیڑ اکٹھا ہو جائے گی'' (صفحہ ۱۷۹)

ایل کے حیدر معاشیات کے پروفیسر کا ذکر یا مختار مسعود کے ہاں پڑھا تھا یا اب اطہر پرویز کے ہاں نظر آیا۔ انگریزوں سے بڑھ کر انگریز تھے۔ شاید اس لئے بھی کہ مشہور تھا لارڈ لنلتھگو کے ہم زلف ہیں۔ انگریزی بھی ویسی ہی بولتے تھے۔ چپڑاسی کو بلاتے تو فرماتے ''یہاں آنا مانگتا''۔ ریٹائر ہونے کے بعد انگلستان چلے گئے'' ڈاکٹر سلامت اللہ خاں سے ان کی ملاقات لندن میں عید کی نماز کے بعد ہوئی۔ انہیں سیاہ شیروانی میں دیکھ کر لپٹ گئے اور زار و قطار رونے لگے'' (صفحہ ۱۰۷) پروفیسر فیلڈن کا قول تھا کہ ''مائی ڈاگز کین بارک بیٹر انگلش دین انڈینز'' (صفحہ ایضاً) اور اب علی گڑھ کے فارسی کے نادر روزگار استاد ڈاکٹر ہادی حسن کا ذکر ''ہادی حسن جادو بیان مقرر تھے اور بڑے با صلاحیت استاد تھے'' (صفحہ ۱۱۱) مگر ان کا ذکر مختار مسعود کی زبان سے بھی سن لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ۱۹۴۴ میں ایران کا ایک وفد ہندوستان آیا معزالدین احمد آئی سی ایس اس کے ساتھ افسر رابطہ کے طور پر منسلک تھے۔ علی گڑھ کے ڈاکٹر ہادی حسن ہر جگہ ترجمانی کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ ''وفد ان سے تنگ آیا ہوا تھا ان سے کہا بھی کہ بہت ہو چکی اب بس کیجئے۔ مگر ہادی حسن نہ رکے۔ ایک جگہ شہد کی مکھیوں نے ہادی حسن صاحب پر ہلہ بول دیا اور وہ سوجھے ہوئے منہ کے ساتھ واپس ہو گئے۔ وفد میں سے ایک نے کہا جو کام ایک آئی سی ایس افسر نہ کر سکا وہ شہد کی مکھیوں نے کر دکھایا۔ معزالدین احمد نے جواب دیا میرا اور شہد کی مکھیوں کا کیا مقابلہ۔ سورۃ النحل کی رو سے انہیں تو خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے'' (احوال ایام صفحہ ۲۰)۔

غرض اطہر پرویز صاحب کی شمشاد کی یہ داستان شمشاد کی ہی نہیں علی گڑھ کے بیشتر افراد کی داستان ہے۔ گویا اسے ایک فرد کی خودنوشت نہیں بیشتر علیگ افراد کی اجتماعی خودنوشت کہا جا سکتا ہے۔

❁

زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی: علی گڑھ کی یادیں

''زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی: علی گڑھ کی یادیں'' کے عنوان سے فیاض رفعت نے اپنی یادداشتیں مرتب کی ہیں جنہیں معیار پبلیکیشنز گیتا کالونی دہلی نے جنوری ۲۰۰۸ میں شائع کیا ہے۔ فیاض رفعت علی گڑھ یونیورسٹی سے مستفیض ہونے والے عاشقوں میں ہیں اس لئے آپ نے اپنی داستان حیات کے بیان کے لئے بھی اسی مادر علمی کو مرکز بنایا ہے۔ اس خودنوشت کا آغاز آپ کی ایک نظم سے ہوتا ہے جس کا عنوان ہے تماشا۔ اس نظم کی ''پہلی سطر ہے گیارہ نومبر دو ہزار چالیس'' اور آخری دو سطریں ہیں ''کہ بس اب تماشا۔ شروع ہوا چاہتا ہے'' (زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی صفحہ ۴) گویا نومولود اپنے وقت سے بہت پہلے تولد ہو چکا ہے اور اب تماشا شروع ہوا چاہتا ہے۔ یہ اسی تماشے کی کہانی ہے۔ شاید یہ سہو کتابت ہو اور مراد انیس سو چالیس سے ہو! مگر یہ سوچنے میں کیا حرج ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کا تصور و کردار آج سے چالیس سال کے بعد کیا ہوگا؟

کتاب کے آغاز سے ہمیں ہرگز اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ خودنوشت کالموں کی شکل میں قسط وار لکھی گئی ہے حتیٰ کہ ''باقی حکایت اگلی صحبت کے لئے اٹھائے رکھتے ہیں'' (صفحہ ۲۸) اور ''ابھی یہ کالم زیر تحریر تھا'' (صفحہ ۳۰) جیسی باتیں نظر سے گذریں تو اندازہ ہؤا کہ اس خودنوشت میں واقعاتی ربط وضبط کیوں نہیں۔

فیاض رفعت صاحب نے علی گڑھ کو اپنے کالموں کا موضوع بنایا تو محمد وجیہہ الدین صاحب نے ٹائمز آف انڈیا ممبئی میں لکھا کہ میں نے پہلی بار ان کی یادداشتوں کی قسط پڑھی تو میں نے یہ سوچا کہ ان یادداشتوں کو کتاب کی صورت میں مرتب ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ نے کتاب مرتب کرتے وقت

اپنے بارہ میں کچھ ضروری معلومات'' میں اور وہ لڑکا'' کے عنوان سے ایک صفحہ میں'' کارگہِ شیشہ گری''
کے عنوان سے ابتدائی زندگی کے حالات اور علی گڑھ یونیورسٹی تک پہنچنے کے مراحل کا تذکرہ
کردیا۔آگے ۱۹۶۰ تک کی علی گڑھ یونیورسٹی ہے اور اس کے ہردم بدلتے ہوئے حالات!

علی گڑھ اور پروفیسر رشید احمد صدیقی گویا یک جان و دو قالب کا مضمون ہے ہم نے رشید
صاحب کے پان کا ذکر ان کے ہاں دیکھا'' رشید صاحب پڑھتے وقت زیر لب تبسم سے آگے نہ بڑھتے
آہستہ روی سے بات کرتے بڑے اہتمام سے زعفرانی پان نوش فرماتے بٹوا، زردے کی ڈبیا ہمیشہ ان
کے ساتھ رہتی ڈلی الائچی لونگ احمد حسین دلدار حسین کا زردہ زعفران کی ایک دو پتیاں لپیٹے پان کی
گلوری تیار ہے ادھر منہ میں ڈالا ادھر گھل گئی''۔ اسی صفحہ پر مرقوم ہے''یونین کے ایک جلسہ میں رشید
صاحب تقریر کررہے تھے اس دوران وہ کسی شعر کا حوالہ دینا چاہتے تھے شعر ان کی یادداشت سے محو ہو
گیا تو انہوں نے اس کا مفہوم بیان کر کے کام چلالیا۔سرور صاحب اگلی صف میں موجود تھے وہ
اجازت طلب کر کے ڈائس پر گئے اور انہوں نے شعر پڑھ دیا۔رشید صاحب نے زیر لب تبسم سے
فرمایا'' میاں سرور کو شعر یاد رہتا ہے اور ہمیں شعر کا مطلب'' (صفحہ ۱۶)

علی گڑھ کے بارہ میں ہم نے حال ہی میں اتنی خود نوشتیں پڑھی ہیں اور اتنی باتیں تواتر سے سنی
ہیں کہ چناؤ مشکل ہو رہا ہے کہ کس مصنف کی کس بات کو چن لیں اور کس کو چھوڑ دیں۔مسعود ٹامی کا
زمانہ علی گڑھ کا بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کا زمانہ ہے مگر ۱۹۶۰ میں فارغ التحصیل ہونے والے
بھی ان کا ذکر خیر یوں کرتے ہیں جیسے مسعود ٹامی کی شرارتوں میں برابر کے شریک رہے ہوں۔فیاض
رفعت نے یہ لکھ دیا ہے کہ ہم نے انہیں دیکھا تو نہیں ان کا ذکر بہت سنا ہے۔ہوسٹل کی چھت پر اونٹ
چڑھا دینے کا ذکر تو اپنے جوش صاحب نے بھی کیا ہے۔یہ پائیوں میں فیس ادا کرنے کی بات ہم نے
ان کے ہاں دیکھی کہ''ان پر کئی مہینے کی فیس چڑھ گئی تھی۔تقاضا بڑھا تو آپ پائیوں کی شکل میں ساری
فیس گدھے پر لدوا کر لائے کہ لیجئے'' (صفحہ ۱۴۸) پائی پائی کا حساب کرلیجئے۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین صاحب کے اس انتباہ کا ذکر ہم ڈاکٹر خورشید الاسلام کے حوالہ سے پڑھ
چکے ہیں کہ علی گڑھ میں رہنا ہے تو اللہ میاں اور وائس چانسلر کے بارے میں بات کرتے ہوئے محتاط

رہیئے۔(صفحہ ۱۳۵) اپنے منظور حسین شور تو ہمارے کالج کے قدیم رفقاء میں تھے ان کا ذکر خیر ہو اور
ان کی کسی بدحواسی کا تذکرہ نہ ہو؟ علی گڑھ میں جو ان سے سرزد ہوا اس کی روداد فیاض رفعت صاحب
نے آل احمد سرور کے حوالہ سے لکھی ہے'' منظور حسین شور فارسی میں ایم اے کر رہے تھے۔جب ایم
اے فائنل کا امتحان ہوا تو اسٹریچی ہال میں ایم اے کے ساتھ بی اے کے طلباء کی سیٹیں بھی تھیں۔
نگران پرچہ بانٹتے وقت پوچھتے تھے ایم اے کا پرچہ چاہتے ہو یا بی اے کا منظور حسین شور کو ایم اے کی
بجائے بی اے کا پرچہ دے دیا گیا۔ان حضرت نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ پرچہ پر بی اے لکھا ہوا ہے
جب تین گھنٹے بعد امتحان ختم ہوا تو باہر نکلے۔میں نے برآمدے میں ان کو دو ایک ایم اے فارسی کے
لڑکوں سے بات کرتے دیکھا شور نے کہا پرچہ تو بڑا آسان تھا کسی نے کہا خاصہ مشکل تھا ہر ایک نے اپنا
پرچہ دکھایا پتہ چلا منظور حسین شور صاحب بی اے کا پرچہ دے کر چلے آئے تھے۔گھبرا کر اندر گئے ان کی
خوش قسمتی کہ ڈاکٹر ہادی حسن صدر شعبہ فارسی ہیڈ نگران تھے۔انہوں نے اپنی رام کہانی سنائی اس وقت
کاپیاں یکجا کی جارہی تھیں۔ہادی صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑا ایک کونے میں ایک سیٹ پر بٹھا دیا
دوسرے نگرانوں سے کہا آپ جایئے ان کا نگراں میں ہوں۔چنانچہ پورے ہال میں ایک امیدوار
منظور حسین شور اور ان کے نگران ڈاکٹر ہادی حسن پورے تین گھنٹے بیٹھے رہے منظور حسین اچھے طالب علم
تھے چنانچہ ان کی فرسٹ کلاس آئی۔'' (صفحہ ۱۵۷)

تعلیم نسواں کے علمبردار علیگڑھ کے پاپا عبداللہ کی بہو اور بیٹی مینا اور رینوکا دیوی فلم ایکٹرس
بنیں ایک اور معزز خاندان کی لڑکی زبیدہ حق (ان کے کزن ضیاء الحق اسلامی مملکت پاکستان کے
سربراہ تھے) بیگم پارہ کے نام سے مشہور ہوئیں'' (صفحہ ۵۷)۔

علی گڑھ کے ایک طبیب ڈاکٹر سمیع حمید کا ایک نسخہ''ایک جج صاحب ان کے کلینک میں داخل
ہوئے ڈاکٹر نے انہیں نظر بھر کر دیکھا اور پوچھا آپ کا پیشہ کیا رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا میں ہائی
کورٹ کا جج تھا سمیع حمید نے کچھ دوائیں تجویز کیں اور نسخہ مرحمت فرماتے ہوئے کہا جسمانی اعتبار
سے آپ بالکل ٹھیک ہیں اصل میں آپ نفسیاتی مریض ہیں اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے آپ نے کئی
لوگوں کو پھانسی کی سزائیں دی ہوں گی جن میں کوئی بے قصور بھی ہوگا اسی کی مضطرب روح خواب میں

آپ کو ڈراتی ہے۔ دوائیں میں نے تجویز کر دی ہیں ساتھ ہی اللہ سے رجوع کیجئے اور اس کے مجبور بندوں کی دامے درمے سخنے مدد بھی کیجئے۔ شفایاب ہوں گے''۔ (صفحہ ۸۶)

فیاض رفعت صاحب زبان کے مزاج شناس نہیں۔ ان کا مطالعہ کمزور معلوم دیتا ہے حالانکہ علیگ ہیں۔ ایک دوست کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''معاذ اللہ! کیا خوب آدمی تھے'' (صفحہ ۱۰۶) معاذ اللہ کا یہ انوکھا استعمال ہم نے پہلی بار ان کے ہاں دیکھا ہے یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے ماشاء اللہ بڑے فضول لوگ ہیں۔ معاذ اللہ کا لفظی مطلب پناہ بخدا کا ہے مگر یہ کلمہء تعوذ ہے جیسے شیطان سے پناہ مانگی جاتی ہے۔ کلمہء تحیر نہیں! اسی طرح آپ نے احمد جمال پاشا کے مزاح کی دادیوں دی ہے کہ وہ ''بڑے کلے ٹھلے کے مزاح نگار ہیں'' (صفحہ ۱۱۱) کلے ٹھلے کا تعلق بھی تن و توش سے ہے محض بڑائی کے بیان سے نہیں۔

غرض فیاض رفعت صاحب کی خودنوشت افرادِ علی گڑھ کے ضمنی ذکر اذکار سے بہت دلچسپ بن گئی ہے اور علی گڑھ میں دلچسپی رکھنے والوں کو مزا دیتی ہے۔

بریگیڈیئر جعفر علی خاں کی کہانی انہی کی زبانی

حیدر آباد دکن کے فوجی افسر بریگیڈیئر جعفر علی خاں، کی خودنوشت ''بریگیڈیئر جعفر علی خاں کی کہانی انہی کی زبانی'' جناب میر یوسف علی رضوی نے مرتب کی ہے اور مولا علی پرنٹنگ ورکس حیدر آباد انڈیا سے ۲۰۰۲ میں چھپی ہے۔ یہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہے اور صرف ایک سو کی تعداد میں شائع کیا گیا ہے۔ کتاب مرتب ہوتے وقت بریگیڈیئر صاحب کی عمر ماشاء اللہ ۹۷ سال تھی۔ میری نظر سے گذرنے والی یہ کسی حیدر آبادی فوجی افسر کی پہلی خودنوشت ہے۔

بریگیڈیئر جعفر علی خاں حیدر آباد شہر کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے اپنے پڑنانا نواب وزیر علی خاں مرحوم کی ڈیوڑھی، متصل گونگے نواب کی ڈیوڑھی میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی اور وہیں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد حضور نظام کی باقاعدہ فوج میں بہ طور لفٹیننٹ بھرتی ہوئے۔ جنگ عظیم دوم میں مختلف ممالک میں انگریزی فوج کے ساتھ خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۵ میں قبرص سے واپسی پر ''حضور بندگان عالی نے گاڑی روانہ کر کے مجھے کنگ کوٹھی طلب کیا اور میرے حسب نسب کے جواب پر دونوں ہاتھ اپنے زانو پر مارتے ہوئے کہا تھا ''اچھا ہے اچھا ہے''۔ (صفحہ ۸)
حیدر آباد کی افواج قاہرہ کے بارے میں یہ معلومات بھی ہمیں انہی کی خودنوشت سے ملی ہیں کہ پرنس آف برار میجر جنرل نواب حمایت علی خاں بہادر نواب اعظم جاہ کے نام نامی سے مخاطب کئے جاتے تھے اور حیدر آباد آرمی کے کمانڈر انچیف تھے۔ نواب معظم جاہ کا اسم گرامی نواب شجاعت علی خاں تھا۔ ہم نے تو پڑھ رکھا تھا کہ حیدر آباد آرمی کے کمانڈر انچیف میجر جنرل سید احمد العیدروس تھے۔ ہو سکتا ہے پرنس آف برار اپنی ولی عہدی کے مرتبہ کی وجہ سے فوج کے کمانڈر انچیف کہلاتے ہوں۔ کتاب میں

ایک تصویر ہے جس میں میجر جنرل نواب حمایت علی خاں اعظم جاہ، بریگیڈیئر جعفر علی خاں کو میڈل لگا رہے ہیں۔ نواب اعظم جاہ کی جو تصویر اپنے جوش صاحب کی ''یادوں کی برات'' سے یا صدق جائسی کی کتاب ''دربارِ دُربار'' سے ابھرتی ہے وہ ایک بالکل مختلف تصویر ہے جسے ایک مستعد اور حاضر سروس فوجی میجر جنرل کے تصور سے کوئی نسبت نہیں۔

اس داستان کا انداز کسی خودنوشت کا انداز نہیں۔ کہیں ان کے مضامین آجاتے ہیں کہیں بیٹے کے نام باپ کی نصیحتیں درج ہیں کہیں مختلف موضوعات پر بریگیڈیئر صاحب کے ارشادات درج ہیں اور ان ارشادات کے ساتھ ان کے لکھنے کی وجہ تسمیہ بھی موجود ہے کہ کس اخبار نے کیسے ان سے مضمون کی فرمائش کی اور کیسے اسے چھاپا۔ اس خودنوشت کا سب سے اہم حصہ حیدرآباد پر ہندوستانی فوج کے قبضہ کی روداد ہے۔ لفٹیننٹ کرنل جعفر علی خاں صاحب پولیس ایکشن کے وقت اپنے علاقہ بیڑ کے کمانڈنگ افسر تھے۔ ہندوستانی فوج حیدرآباد میں داخل ہوئی تو تین دن کے اندر اندر نواب لائق علی خاں وزیر اعظم کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کا اعلان ریڈیو پر ہو گیا۔ میجر صاحب جنگی قیدی بنا لئے گئے اور بارہ دن جنگی قیدی رہنے کے بعد واپس حیدرآباد بھیج دئے گئے (صفحہ ۵۱) اس کے بعد ان کی تمام تر توجہ انڈین ملٹری حکام کی اطاعت میں صرف ہوئی۔ ریٹائرمنٹ سے قبل انہیں ۱۹۵۳ میں ایک وفد کے ہمراہ پنڈت نہرو وزیر اعظم ہند سے ملاقات کا موقع بھی ملا جس کا ذکر آپ نے بڑے تفاخر سے کیا ہے۔

نظام میر عثمان علی خاں کے زمانہ میں نظام نے لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند کو خلوت میں جو ڈنر دیا اس میں جعفر علی خاں نظام کے ساتھ خدمت پر تھے۔ نظام نے ہزایکسی لنسی کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جب ایک صفحہ ختم کرنے کے بعد نظام نے دوسرا ورق پلٹنا چاہا تو ''فنگر باؤل'' میں پڑے پانی سے اپنی انگلی تر کی۔ عام لوگوں کے برعکس اپنا لعاب دہن استعمال نہیں کیا۔ (صفحہ ۱۵۹)۔ یمین الدولہ نواب سرکشن پرشاد شاد کی دادودہش اور خیرات کا بڑا دلنواز تذکرہ ہے۔ (۶۵) اپنے سٹی کالج کے زمانہ کی ایک معصوم سی شرارت کا بھی کہ ان کے استاد ڈاکٹر سید عبداللطیف چند سیکنڈ کے لئے کلاس سے باہر تشریف لے گئے تو ایک طالب علم نے پھرتی سے ان کی ہیٹ کے نیچے ایک بندر کی تصویر رکھ دی۔

پروفیسر صاحب واپس ہوئے ہیٹ اٹھائی تو تصویر دیکھ کر فرمایا'' انہیں آج معلوم ہوا ہے بعض لوگ وزیٹنگ کارڈ کے طور پر اپنی تصویر بھی دیا کرتے ہیں۔'' (صفحہ ۱۵) یہ واقعہ انہیں اتنا عزیز ہے کہ مکرر اس کا ذکر آپ نے صفحہ ۳۶ پر بھی فرمایا ہے۔

ضمناً یہ بات بھی لکھی ہے کہ لفٹیننٹ جنرل کول نے اپنی انگریزی خودنوشت The Untold Story میں ایک اردو شعر بھی لکھا ہے ''گردش دوراں تیرا شکریہ۔ ہم نے ہر پہلو سے دنیا دیکھ لی'' (صفحہ ۹۵)۔ غرض بریگیڈیئر جعفر علی خاں کی یہ کہانی غیر مربوط سہی، حیدرآبادی کلچر کے کچھ نئے پہلو بیان کرتی ہے اسی وجہ سے پڑھنے میں دلچسپ ہے۔

میری دنیا

الہٰ آباد یونیورسٹی کے اردو کے نامور استاد بلکہ استاذ الاساتذہ ڈاکٹر اعجاز حسین کی خودنوشت ''میری دنیا'' کارواں پبلشرس ۷ منٹو روڈ الہٰ آباد کی جانب سے اگست ۱۹۶۵ میں پہلی بار شائع ہوئی۔ ۵۱۰ صفحات کی اس کتاب پر قیمت دس روپے لکھی ہوئی ہے۔ آج کے افراطِ زر کے زمانہ میں یہ قیمت خواب و خیال لگتی ہے بلکہ وہ لوگ جن کا ذکر اس کتاب میں ہے وہ بھی خواب و خیال ہو گئے ہیں۔ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔ میں اپنے محترم دوست ڈاکٹر سید تقی عابدی کا احسانمند ہوں کہ آپ نے اپنی لائبریری سے یہ نایاب خودنوشت مجھے مہیا کی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے خودنوشت نگاری کے بارے میں ایک انوکھی بات لکھی ہے کہ ''اپنے بارے میں سب کچھ کہہ جانے کے باوجود بھی محسوس ہوتا ہے کہ کچھ اور کہنا باقی رہ گیا ہے'' (میری دنیا صفحہ ۴) خود ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''گفتنی سب بیان کر چکا البتہ رودادِ محبت بیان کرنے کی جرات نہ ہوئی اور نہ آئینِ محبت کا احترام ایک لمحہ کے لئے بھی مجھ سے الگ ہوا کہ تفصیل بتا کر داستان کو پرلطف بنا سکتا خواجہ آتش کا کہنا یاد آتا رہا۔ ناگفتنی ہے عشقِ بتاں کا معاملہ۔ ہر حال میں ہے شکرِ خدا کچھ نہ پوچھئے'' (صفحہ ۵)

ڈاکٹر صاحب ۱۸۹۸ یا ۱۸۹۹ کے اگست کے مہینہ میں راجا پور الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں اگست کا مہینہ منحوس سمجھا جاتا تھا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ میری ولادت کے وقت نیک اور بدساعتوں کا اجتماع ضدین رہا ہوگا جس کے سایہ میں مجھے صحرائے عدم سے ملکِ ہستی میں آنا نصیب ہوا اور یہ سایہ اب تک استقلال اور وفاداری کے ساتھ میری زندگی پر اثر انداز ہے جس کا ایک اثر یہ

ہے کہ میرا دماغ اب تک خراب نہیں ہوا مگر مالی حالت کم و بیش وہی ہے جو کبھی تھی'' (صفحہ ۱۱) ڈاکٹر صاحب نے تواتر کے ساتھ اپنی زندگی کے ایسے واقعات کا بیان کیا ہے جنہیں آپ ''نحوست'' قرار دیتے رہے۔ مرزا جعفر حسین کی ''خستہ حالی اسی وقت سے شروع ہوئی جب سے میری ان کی دوستی بڑھی اس لئے ان کے باب میں سوچنا پڑتا ہے کہ ان کی مالی دقتوں میں مبتلا ہونا شاید میری دوستی کا وہ منحوس اثر ہوگا جس کا اعتراف خود مجھے بھی ہے'' (صفحہ ۱۲۸) ''داس صاحب مجھے اب تک عزیز رکھتے ہیں اور ان کو معلوم نہیں کس کی منحوسیت کا کس پر برا اثر پڑ رہا ہے مگر ہم دونوں اپنی جگہ پر سمجھتے ہیں کہ ہو نہ ہو میری وجہ سے میرا دوست پریشان و پراگندہ رہتا ہے'' (صفحہ ۱۳۰)۔ یہ احساس ساری کتاب پر حاوی نظر آتا ہے۔ عمر بھر دوستوں دشمنوں کے ہاتھوں مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ نانا اچھے خاصے زمیندار بھی تھے اور لارڈ کرزن کے زمانہ میں دہلی دربار کے موقعہ پر بے پناہ دولت بھی سمیٹی تھی۔۔۔ اس لئے اپنی بیٹیوں کے لئے ایسے داماد چاہتے تھے جو گھر داماد بننے پر راضی رہیں۔ ان کا قول تھا ''دامادی کے لئے مجھے لڑکا غریب چاہئے لیکن ہڈی اچھی ہو'' (صفحہ ۱۰) ان کے والد محمد شفیع صاحب غریب آدمی تھے مگر بیحد شریف و نیک مزاج مرحوم پڑھے لکھے بھی کم تھے ان کی غریبی اور والدہ سے بیگانگی ننیہال کی خوشحالی اور علم دوستی نے مجھے کبھی ان سے اس طرح وابستہ نہ ہونے دیا جیسے باپ اور بیٹے ہوتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ نہ مجھے ان سے کوئی خاص محبت تھی نہ میرے دل میں وہ جذبہ احترام جو ہونا چاہئیے تھا'' (صفحہ ایضاً)۔ اس مختصر ذکر کے بعد ساری خودنوشت میں ان کے والد گرامی کا کوئی ذکر نہیں۔ جو کچھ تھے ان کے نانا تھے۔ نانا سید حسین ''رئیسانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرتے تھے پرانے زمانہ میں شان ریاست کا طرہ امتیاز تفریحی زندگی کا وہ جزو تھا جسے اب عرف عام میں عیاشی سے تعبیر کیا جاتا ہے'' (صفحہ ۲۰) اپنے نانا اور ماموں کے ساتھ یہ اس کوئے ملامت سے بھی واقف ہو چکے تھے جسے طوائفوں کا ڈیرہ کہا جاتا ہے ''اس وقت کا یہ کوچہ صرف تماش بینی کا مرکز نہ تھا بلکہ آداب نشست و برخواست، تمیز و تہذیب کی درس گاہ بھی تھا جہاں جہاں ہم لوگ جاتے وہاں اکثر ایسی طوائفیں ملتیں جو فارسی پڑھی ہوتیں اور اردو کے شعرا سے بھی کافی دلچسپی لیتیں'' (صفحہ ۴۲) ''جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی گھر کی حالت ابتر ہوتی گئی۔ بے چارگی کے ہاتھوں یہ ضرور ہوا کہ کبھی کبھی معمولی ملازمت کی تلاش

میں گورنمنٹ چھاپہ خانہ اور کبھی ریلوے میل سروس کے دفاتر میں ملازمت کے لئے درخواستیں لے کر جانا پڑا مگر خوش قسمتی سے کہیں کامیابی نہ ہوئی'' (صفحہ ۲۱) ادھر نویں درجہ سے خدا خدا کر کے کامیاب ہوئے تو دسویں درجہ میں فیل ہو گئے کہ حساب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ کلکتہ پہنچے کہ کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا جائے کہ وہاں حساب کی ویسی علت نہ تھی۔ کلکتہ سے انٹرنس میں کامیاب ہوئے۔ میور کالج میں داخل ہوئے پھر افتاں خیزاں تعلیم کا سلسلہ چل نکلا۔ ایم اے پریویس میں سیکنڈ ڈویژن آئی تو بہت آزردہ ہوئے مگر استاد نے سمجھایا کہ اگر بغیر پڑھے آپ فرسٹ ڈویژن کی توقع رکھتے تھے تو آپ کی نادانی تھی یہ بات ان کے دل میں گھر کر گئی فائنل میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی اور ہوتے ہوتے یونیورسٹی کے سٹاف پر آ گئے اور ۱۹۶۱ میں سبک دوش ہوئے۔ آپ نے کیا عمدہ بات لکھی ہے کہ ''میں اپنے استادوں سے زیادہ اپنے شاگردوں سے فیضیاب ہوا ہوں'' (صفحہ ۷) اس میں اساتذہ کی تخفیف نہیں شاگردوں کی ذہانت اور قابلیت کا اعتراف ہے۔ شاگرد بھی ایسے جنہوں نے اردو ادب میں اپنا نام پیدا کیا سید وقار عظیم احتشام حسین سبط حسن رضیہ سجاد ظہیر گیان چند جین سید عقیل۔ اعجاز حسین صاحب نے باقاعدہ فہرست مرتب کر کے درج کی ہے اور تقسیم ملک سے پہلے اور تقسیم ملک کے بعد کے شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی اصل خود نوشت تو ڈیڑھ سو صفحات میں ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد ان کے احباب اور شاگردوں کا ذکر شروع ہوتا ہے اور یہی حصہ تاریخی بھی ہے اور قابل توجہ بھی۔ ان کا ارشاد ہے ''یہ نعمت کس دولت سے کم ہے کہ میرے شاگردوں نے اردو ادب کی خدمت کی ہے'' (صفحہ ۱۴۷) اور ''علم و ادب کی دنیا میں کچھ فاتحہ خواں چھوڑے جا رہا ہوں''۔ (صفحہ ۱۵۷)

احباب میں فراق کا ذکر: ''ان کے حالات و مزاج سے ہمیشہ میں گھبراتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی ہی زیادہ کہتے ہیں دوسرے کی کم سنتے ہیں یہی جارحانہ انداز اس وقت بھی تھا'' (صفحہ ۹۸) ''بی اے کرنے کے بعد فراق ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ کبھی کانگریس کے پرزور ممبر رہے کبھی کان پور کے ایک کالج میں ٹیچر ہو گئے آخر میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں لیکچرر ہو گئے۔۔۔ یہ ان کے مرتبے کے مرتبے یا عہدے نہ تھے ۔۔۔ قدرت نے مردم شناسی سے کام لے کر ان کے سامنے قافئے بکھیر دئے تھے اور آواز دی تھی کہ

اے شخص تو کسب معاش کے لئے ادھر ادھر پھر رہا ہے یہ سب بے کار ہے تجھے صرف شاعر اور بڑا شاعر ہونا ہے'' (صفحہ ۲۸۴) ''میرا خیال ہے بقائے عام کے دربار میں جس وقت فراق کا کارنامہ پیش ہوگا تو اردو کے ممتاز شعرا۔۔۔ وغیرہ میں ہر ایک خواہش کرے گا کہ فراق میرے قریب بیٹھے۔ مگر یہ بھی اندیشہ ہے کہ 'روپ' کو دیکھ کر جرات اپنی طرف بلائیں اور 'شوخیٔ گفتار' کا خیال کر کے سید انشاء دور سے پکاریں کہ یار وا سے میرے پاس آنے دو یہ فن کار عملی دنیا میں مجھ سے بہت قریب رہا ہے'' (صفحہ ۲۸۹)۔

جنگ عظیم دوم میں جاپانی برما پر چڑھ دوڑے تھے مرتبان نامی کوئی شہر انہوں نے فتح کر لیا۔ فراق نے لطیفہ گھڑا اور یونیورسٹی میں سنا دیا کہ میں اعجاز صاحب کے ہاں بیٹھا تھا جب یہ خبر آئی کہ جاپانیوں نے مرتبان پر قبضہ کر لیا ہے تو اعجاز صاحب کی بیگم نے اندر سے کہا ''ارے جھاڑو پیٹوں نے مرتبان بھی لے لیا اب اچار کاہے میں رکھا جائے گا''۔۔۔ اعجاز صاحب نے فراق سے شکوہ کیا آپ نے میری پردہ نشین بیوی کو خوامخواہ درمیان میں گھسیٹ لیا۔ فراق صاحب کہنے لگے ''تو کیا ہوا میں نے آپ کی بیوی کے نام سے ایک لطیفہ سنایا ہے آپ میری بیوی کے نام سے دو لطیفے سنا لیں'' (صفحہ ۲۸۷)۔

مجاز ان کے قائم کردہ ادبی حلقہ جمعرات کلب میں آئے اور پوچھا آج جمعرات کلب کا جلسہ نہیں ہوگا۔ انہیں بتایا گیا کہ آج تو جمعرات نہیں ہے۔ کہنے لگے ''آج جمعرات کیوں نہیں؟'' (صفحہ ۱۰۸) اس پر ہمیں عدم یاد آ رہے ہیں۔ دفتر سے عین کام کے وقت غیر حاضر تھے۔ افسر نے باز پرس کی کہ آپ کام سے کیوں غیر حاضر تھے تو فرمایا میں جمعہ پڑھنے گیا ہوا تھا۔ ہندو ساتھی نے لقمہ دیا آج تو جمعہ نہیں بدھ ہے۔ کہنے لگے تو کیا ہوا ہم تو آج ہی جمعہ پڑھ آئے ہیں۔

ان کے استاد تھے حفیظ سید۔ سید کی نسبت اپنے نام کے ساتھ سابقہ کے طور پر استعمال کرتے تھے اس لئے ڈاکٹر عبدالحق کہا کرتے تھے ''حفیظ سید صاحب الٹے سید ہیں'' (صفحہ ۱۶۶)

حکیم منے آغا لکھنؤ کے مشہور حکیم تھے۔ احتشام حسین انہیں علاج کے لئے ان کے پاس لے گئے۔ حکیم صاحب کی دلچسپ شخصیت کا احوال۔ ان کی نبض دیکھی اور کسی نواب کے لئے بنائی ہوئی دوا

میں سے بچی ہوئی دوا انہیں تین سو روپے میں دے دی دو سو اعجاز صاحب نے دئے ایک سو احتشام
صاحب نے دئے۔ فائدہ تو ہوا مگر دوسرے تیسرے روز یہ دوبارہ حکیم صاحب کی خدمت میں گئے
احتشام صاحب نے کہا یہ اتنے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ حکیم صاحب نے مسکراتے ہوئے
فرمایا ''میاں میں حکیم بھی ہوں اور ٹھگ بھی ہوں۔ میں اسی کا علاج کرتا ہوں جس کے پاس دولت ہو
یا حسن ہو۔ چنانچہ یا تو راجہ نواب کے علاج میں جی لگتا ہے یا طوائف کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ہٹانے کا جی
نہیں چاہتا۔'' (صفحہ ۹۳) اس کے بعد حکیم صاحب نے ایک اور نواب کو بیوقوف بنانے کا قصہ سنایا کہ
کس طرح اسی کے باغ کے پھولوں سے بنایا ہوا شربت بنا کر اس سے ہزاروں روپے اینٹھ لئے۔
مہاراجہ بنارس کو بغیر کوئی دوا دئے محض اپنی باتوں سے ٹھیک کر دیا۔ اعجاز صاحب نے لکھا ہے ''ان کی
طبابت کا تو میں قائل تھا ہی مگر جس طرح حکیم صاحب نے بالاعلان اپنی حکمت عملیوں کا بیان کیا اس
سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ حکیم صاحب آدمی بھی بڑے ہیں ورنہ اس طرح اعتراف جرم نہ کرتے
کیونکہ یہ راز دوسرا کون جانتا؟'' (صفحہ ۹۸)

اپنے رفیق کار پروفیسر چٹوپادھیا کے ہاں ملنے چلے گئے۔ واپس آنے کے لئے اٹھے تو دیکھا
کہ ایک نوکر پانی کی دو بالٹیاں لئے کمرہ میں جا رہا ہے۔ ان سے کہا ''مہاراج کیا کمرے میں نہاتے
بھی ہو؟ یہ پانی آخر کیا ہوگا ؟ وہ یکدم متین ہو گئے بولے بھائی اعجاز یہ کمرہ دھلے گا۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ
چونکہ تم مسلمان ہو تمہارے آنے سے کمرہ ناپاک ہو گیا۔ میری ماں کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ باہر کا
کوئی آدمی آئے خواہ وہ برہمن ہی کیوں نہ ہو کمرے کو غسل دیا جاتا ہے یہ میری رائے نہیں میری ماں کی
رائے ہے جس کا حکم ہر حال میں ماننا ضروری جانتا ہوں'' (صفحہ ۲۰۴)۔

''سبط حسن کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ اور مطالعہ وسیع تھا یہ اس وقت بھی کیمونسٹ تھے اور یہ تو
سب ہی جانتے ہیں کہ کیمونسٹ پڑھا لکھا آدمی ہوتا ہے۔ بات کرنے میں طرار اور اظہار خیال میں
بے باک'' (صفحہ ۳۲۱)

ضامن صاحب ان کے ڈی لٹ کے مقالہ کے نگران تھے مقالہ پڑھتے نہیں تھے لکھنے والے کو
لفظ بہ لفظ سنانا پڑتا تھا ان کا مقالہ لکھنے میں کم وقت صرف ہوا نگران کو سنانے میں برسوں لگ گئے

(صفحہ ۱۱۴) نگران کے شاگرد رشید پروفیسر وقار عظیم ہمارے پی ایچ ڈی کے مقالے کے نگران تھے۔
ہم مقالہ کا ایک باب صاف لکھنے کے بعد ان کی خدمت میں دے آتے دو ہفتے کے بعد دوسرا باب
دینے جاتے تو پہلا باب استاذی المکرم نے اس طرح بالاستیعاب پڑھا ہوتا کہ کتابت کی غلطیوں تک
کی نشاندہی فرما دی ہوتی۔ مکمل مقالہ ملاحظہ فرمانے میں ایک ہفتہ سے زیادہ وقت نہیں لیا۔ کئی
مقامات پر میری رائے سے اختلاف کا اظہار فرمایا مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ میں آپ کی بات سے
متفق نہیں مگر آپ پر اپنی رائے ٹھونسنا نہیں چاہتا۔ اب ایسے شفیق استاد کہاں رہے؟

اب ان کے شاگردوں کا ذکر۔ استاذی المحترم سید وقار عظیم ہی کے ذکر سے شروع ہو تو
مناسب ہے'' وقار عظیم میرٹھ کے رہنے والے لکھنؤ سے بی اے کیا اب ایم اے کے لئے تربنی آئے
--- ذہین ہونے کے علاوہ محنتی بھی تھے جتنی کتابیں ان کو بتا دی جاتیں سب کو پڑھ کر باقاعدہ نوٹ بنا
لینا ان کا معمولی کام تھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کام کرنے لگے ہیں تو مسلسل بارہ بارہ گھنٹے تک اپنی جگہ سے
اٹھے نہیں۔ اور غالباً بغیر اس محنت شاقہ کے وہ طالب علمی کا زمانہ آسانی سے نہ گذار سکتے اس لئے کہ
ان کو جملہ اخراجات کے لئے اپنی ہی قوت بازو کا سہارا تھا مختلف مگر معقول کاموں سے اتنی آمدنی ہو
جاتی کہ وہ اپنا ماہانہ خرچ پورا کر لیتے۔ --- وقار عظیم صاحب میں کسی استاد کی رائے سے اختلاف
کرنے کی جرات نہ تھی۔ اگر اختلاف رائے ہوا یا کسی بات کو وہ غلط سمجھے بھی تو استاد کے سامنے معنی خیز
مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو جاتے۔ اگر استاد پوچھتا بھی کہ آپ کیوں اس پہلو کو غلط سمجھتے ہیں تو وہ
نہایت بھولے پن سے کہتے جی وہ میری غلطی تھی آپ بالکل صحیح فرماتے ہیں۔ --- شروع ہی سے طے
کر لیا تھا کہ لکھنے پڑھنے کی ملازمت تلاش کروں گا۔ --- حسب امید وقار عظیم نے ایم اے فرسٹ
ڈویژن میں پاس کیا۔ دو ایک دوسری جگہوں پر کام کرنے کے بعد سرکاری رسالہ آج کل کے مدیر ہو
گئے۔ --- وقار صاحب اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر ہیں اور صحیح معنی میں داد پروفیسری دے رہے
ہیں ان سے یہی امید تھی خدا کا شکر ہے کہ پوری ہو رہی ہے'' (صفحہ ۲۴۰)۔

احتشام حسین۔ ان کے شاگرد بھی رہے اور پھر ان کے جانشین بھی ہوئے۔ اس کتاب کا دیباچہ
بھی احتشام صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ''ان کی ذہانت و ادبی دلچسپی کا اندازہ کر کے میرے دل میں

ان کی قدر روز افزوں ہوتی رہی۔ درجہ میں بھی اپنی قابلیت کی وجہ سے وہ انفرادیت حاصل کرنے لگے۔تحریر،تقریر،شعرفہمی،تہذیب وتمیز یہ سب خصوصیات ایسی تھیں جوان کی ہردلعزیزی کا باعث ہوتی گئیں۔۔۔۔مضمون نگاری اور تنقید نگاری کی صلاحیت بعد میں اتنی ابھری کہ اب احتشام صاحب اردو کے مایہ ناز نقادوں میں ہیں'' (صفحہ ۳۳۰)

گیان چند جین ہیں۔''گیان چند نہایت منکسر المزاج اور نیک آدمی تھے۔آنکھ ملا کر بات کرنا بھی ان کے لئے بے ادبی تھی۔لب ولہجہ میں بھی وہ توانائی نہ تھی آہستہ آہستہ گفتگو کرتے اورنشست برخواست میں بھی خاکساری کوراہ دیتے ان خصوصیات سے زیادہ باا ثر وقیع خصوصیت یہ تھی کہ وہ موٹی سے موٹی کتاب دودن میں ختم کردیتے اور ختم کرنا ایسانہیں ہوتا تھا کہ ورق گردانی کی گئی ہو بلکہ عبارت کے اقتباسات محاورات اشعار جابجا سے ان کے حافظہ میں محفوظ ہوجاتے۔ یہ سلسلہ ءمطالعہ آگے چل کران کی افتادطبیعت بن گیا'' (صفحہ ۴۰۸)

ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔باقر مہدی ہیں (صفحہ ۳۷۱) بلونت سنگھ ہیں (۳۸۳) مجتبیٰ حسین ہیں (صفحہ ۳۹۷)۔منورعلی ہیں ''جو ہر سال خربوزے لاتے تھے پاس ہوئے تو تربوز لے کرآئے'' (صفحہ ۴۱۷) مصطفی زیدی ہیں (صفحہ ۴۳۷) اور شمیم حنفی ہیں (صفحہ ۴۸۴) اور کچھ ایسے لوگوں کا ذکر بھی آپ نے فرمایا ہے ''جن پر ان کی شاگردی کا داغ نہیں لگا'' (صفحہ ۴۱۴) ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی کا ذکر ہے جوان کے خویش ہیں۔(صفحہ ۴۸۷)۔ڈاکٹر کاروانی صاحب ۱۹۶۰ میں گورنمنٹ انٹر کالج مظفر گڑھ کے پرنسپل تھے۔ہم ڈگری کالج میں پڑھاتے تھے ایک سال کے قیام کے دوران یہ تک معلوم نہ ہوا کہ ڈاکٹر کاروانی صاحب کوادب سے بھی کوئی دلچسپی ہے یا ہوسکتی ہے شہر بھر میں وہ ایک خاموش طبع تنہائی پسند بلکہ مردم بیزار شخصیت سمجھے جاتے تھے۔قبلہ ڈاکٹر صاحب کی خود نوشت نے ہمیں حیران کردیا کہ آصف جاہ کاروانی ان کے شاگرداور خویش یعنی داماد تھے اور کسی زمانہ میں ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

اتفاق یوں ہے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کے شاگرد انہیں اپنے ہاں بلا تو لیتے ہیں لیکن سٹیشن پر ان کا استقبال کرنے کونہیں آتے۔بمبئی میں توان کے عزیز شاگرد کے نہ آنے کی وجہ سے انہیں بہت

خوار ہونا پڑا۔بٹوا چوری ہوگیا،بے حال ہوگئے آخر خواجہ غلام عباس کے گھر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو ان کی جان میں جان آئی۔ڈاکٹر صاحب نے یہ روداد آٹھ صفحوں میں بیان فرمائی ہے (صفحہ ۸۰ سے ۸۸ تک)۔بریلی میں ان کے ایک شاگرد ڈپٹی کلکٹر تھے انہیں بلا کر سٹیشن پر آنا بھول گئے اور یہ بچارے اپنی بیگم اور بچے سمیت ٹانگہ میں خوار ہوتے پھرے۔(صفحہ ۳۵۳) اور ڈپٹی کلکٹروں کے دروازوں پر دستک دیتے پھرے۔حتیٰ کہ ان کے میزبان ہنستے ہوئے ان کو تلاش کرتے کرتے وارد ہوئے اور انہیں اپنے گھر لے گئے اور معذرت کی کہ وقت پر آنکھ نہیں کھلی۔شاگردوں کی ایسی بوالعجبیوں کے باوجود اعجاز حسین صاحب کی یہ خودنوشت ان کے شاگردوں نے ہی چندہ کر کے چھاپی ہے اور ان کے ذہین شاگرد احتشام حسین نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔یہ خودنوشت ادب کے ایک بزرگ استاد کی سرگزشت ہے جس میں آپ نے اپنی کسی خامی پر پردہ ڈالنے یا کسی خوبی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔وہ لوگ جو اپنے فضائل کے باب میں دون کی لینے کے عادی ہیں ان کے لئے اس خودنوشت میں بہت سبق ہیں۔

میں کیا میری حیات کیا

علی گڑھ کے جناب ڈاکٹر بلکہ (ان کے اختیار کردہ ہجوں کے مطابق ڈوکٹر) اطہر صدیقی کی خود نوشت ''میں کیا میری حیات کیا'' کا دوسرا حصہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس شمشاد مارکیٹ علی گڑھ کی طرف سے نومبر ۲۰۰۳ میں چھپا۔ ''میں کیا میری حیات کیا'' کے پہلے حصہ پر میں اپنی کتاب پس نوشت اور پسِ پس نوشت میں تبصرہ کر چکا ہوں۔

ڈوکٹر اطہر ایچ صدیقی، حیاتیات کے ایک شعبہ طفیلیات کے ماہر ہیں میرا خیال تھا کہ علی گڑھ کے بڑے اساتذہ کے قرب کے طفیل اطہر صاحب کی خود نوشت معرکے کی چیز ہوگی مگر پہلی جلد میں سوائے چھوٹی چھوٹی آویزشوں اور جھگڑوں چپقلشوں کے بیان کے اور کوئی چیز ابھر کر سامنے نہیں آئی تھی۔ اب دوسرا حصہ سامنے آیا ہے تو میری بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ قبلہ ڈوکٹر صاحب خود نوشت لکھنے پر مستعد ہیں مگر اچھے خود نوشت نگاروں کے طفیلیے نہیں بننا چاہتے۔

اس خود نوشت کا دوسرا حصہ خود ان کے قول کے مطابق چند خاکوں چند سفرناموں اور چند خطوط پر مشتمل ہے۔ پہلا خاکہ تو ان کی والدہ محترمہ کا ہے، دوسرا خاکہ ان کے محترم استاد پروفیسر بابر مرزا کا ہے تیسرا وائس چانسلر ہاشم علی صاحب کی بیگم صاحبہ محترمہ وحید کا ہے پھر درجن بھر وائس چانسلروں کی کارکردگی اور ان کی کامیابیوں ناکامیوں کا جائزہ ہے پھر ان کے سفرنامے ہیں اور آخر میں چند لوگوں کے چند خطوط۔ ان عناوین کو یہ اپنی خود نوشت کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ مگر آپ نے کہا ہے اور بانگ دہل اسے خود نوشت کا دوسرا حصہ قرار دیا ہے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

ہمیں تو ان کے سفرناموں میں نائیجیریا کا سفرنامہ پسند آیا کہ اس میں کچھ نئی باتیں نظر آئیں۔

آپ وہاں تبلیغی جماعت والوں کے ہتھے چڑھ گئے اور اپنے ایمان کو اور زیادہ متزلزل کر کے وہاں سے بھاگ لئے (۱۴۰) مومن یاد آ گیا۔ شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن۔ رات کاٹی خدا خدا کر کے! جاپان کا سفرنامہ بھی ان کے سفر جاپان کی طرح مختصر ہے اور غیر مستند۔ جب ایک ماہر حیاتیات (یہ زوآلوجی کے شعبہ سے متعلق ہیں) یہ کہتا ہے کہ ''ستمبر کے مہینہ میں جاپان کا مشہور پیڑ چیری بلوزم، پھولوں سے بھرا ہوتا ہے'' (صفحہ ۱۹۵) تو پڑھنے والا رک کر سوچتا ہے کہ بلوزم تو کہتے ہی پھولوں کو ہیں یہ کیسا بلوزم ہے جو پھولوں سے بھرا ہوتا ہے اور ستمبر کے مہینے میں؟ قبلہ چیری کے شگوفے اپریل مئی میں کھلتے ہیں ستمبر میں نہیں کھلتے! غرض ان کی خود نوشت کا دوسرا حصہ بھی پہلے حصہ کی طرح بے رنگ اور بے لطف ہے۔

خواب جو حقیقت بنے

محترمہ سعیدہ وحید کی خودنوشت ''خواب جو حقیقت بنے'': سعیدہ وحید کی کہانی ان کی اپنی زبانی کچھ رفقاء کی زبانی'' کے عنوان سے سنگ میل والوں نے ۲۰۱۱ میں شائع کی ہے۔ اس کتاب کو ان کی صاحبزادی ناصرہ اقبال نے مرتب کیا ہے اور اس کا دیباچہ لکھا ہے پس ورق پر ان کے داماد ڈاکٹر جاوید اقبال کا تعارفی شذرہ درج ہے۔ محترمہ سعیدہ وحید فیروز سنز کے ڈاکٹر عبدالوحید کی اہلیہ محترمہ تھیں اور عمر بھر سماجی بہبود کی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئیں ان کے والد محکمہ تعلیم پشاور میں افسر تھے اس لئے ان کی پرورش اور تعلیم سرحد میں ہوئی۔ بیاہ کر لاہور آئیں اور فیروز سنز والے مولوی فیروز الدین صاحب کے گھر کا فرد بن گئیں اور اس گھر کی مخیّرانہ روایات کو خوب نباہا۔ جاوید اقبال کے لفظوں میں ''ان کی زندگی پاکستان میں غربت بیماری اور ناخواندگی کے خلاف مسلسل جہاد کرتے گذری''۔ (''خواب جو حقیقت بنے''۔ پس ورق)

سعیدہ وحید نے اپنی سکول کی دو تین ہمجولیوں سے مل کر فیصلہ کیا کہ وہ ڈاکٹر بنیں گی مگر مسلم معاشرے کی پابندیاں آڑے آئیں اور گھر سے باہر تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور تک بھی آنے کی اجازت انہیں نہ ملی حالانکہ صوبہ بھر میں اول پوزیشن حاصل کر کے کامیاب ہوئی تھیں اور لاہور کے کالج انہیں قبول کرنے کو تیار تھے۔ ہاسٹل میں رہنے کے خلاف تو ان کے ابا کے دوست اور بعد کو ان کے ہونے والے خسر مولوی فیروز الدین صاحب کی رائے کا بڑا عمل دخل تھا۔ اس کتاب میں پہلے ایک سو تریسٹھ صفحات محترمہ سعیدہ وحید کی خودنوشت پر مشتمل ہیں باقی کا حصہ ساتھیوں ماتحتوں بیٹیوں اور دیگر اولاد کا لکھا ہے جس میں انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ جہاں تک خودنوشت کا تعلق ہے

سعیدہ وحید کی خودنوشت فنی لحاظ سے بڑی کامیاب خودنوشت ہے۔ جس میں مصنفہ نے خودنوشت کے تقاضوں کا بہت خیال رکھا ہے اور اپنے خاندان یا اپنی ذات کے حالات سے ذرا بھی ادھر ادھر نہیں ہوئیں۔ اگرچہ اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ میکہ کا ذکر تو تفصیلی بلکہ تفصیلی ہے۔ بہنوں بہنوئیوں بھائی اور بھائی کے سسرال کا ذکر مگر خود ان کے سسرال والوں کے ذکر میں نندوں اور نندوئیوں کا ذکر ہے ہی نہیں گویا ڈاکٹر وحید صاحب کی بہنیں یا بہنوئی تھے ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر ناصرہ جاوید اقبال نے ایک جگہ اپنے پھوپا مشہور شاعر سراج الدین ظفر کا ذکر کیا ہے۔ سعیدہ وحید کے قلم سے ان کا نام تک مذکور نہیں ہوا۔ ناصرہ جاوید اقبال نے بھی ان کا ذکر نہایت سرسری رنگ میں کیا ہے'' چھوٹی پھوپی جان کے شوہر نامور شاعر سراج الدین ظفر ائیر فورس میں فلائٹ لیفٹیننٹ یا گروپ کیپٹن تھے'' (صفحہ ۱۷۲) یہ بھی ایک ہی رہی۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے فلاں صاحب فوج میں کیپٹن یا کرنل رہے۔ ہم تو یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے ہیں کہ ہماری ایک ہائی کورٹ کی سابق جج کی عام معلومات کا یہ عالم ہے کہ اسے فلائٹ لیفٹیننٹ اور گروپ کیپٹن کا فرق معلوم نہیں؟

محترمہ سعیدہ وحید نے مسلمان خواتین کی محدود سرگرمیوں کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے کہ ان کی معراج یہی تھی کہ وہ کامیاب گھریلو بیوی بن جائیں۔ سعیدہ وحید خوش قسمت تھیں کہ انہیں اپنے شوہر کے ہمراہ لیگ آف نیشنز میں ملازمت کی وجہ سے یورپ میں رہنے کا موقع مل گیا اور وہاں انہیں بہت سے شرفاء سے ملنے ملانے کا موقعہ ملتا رہا۔ سر آغا خاں، جواہر لال نہرو، لالہ سر شری رام، ڈی ولیرا، فیروز خان نون اور لیگ آف نیشنز کے مہاجروں کے کمیشن کے سربراہ سر ہربرٹ ایمرسن! سر ہربرٹ ایمرسن کا ذکر خیر ان کے خسر مولوی فیروز الدین صاحب نے اپنی خودنوشت ''جہادِ زندگانی'' میں بھی کیا ہے۔ قبلہ مولوی صاحب نے لکھا ہے'' ڈاکٹر وحید سر ہربرٹ ایمرسن سابق گورنر پنجاب کو ملتے رہے اور چائے پر بلاتے رہے کیونکہ ایک پنجابی کی طرف سے اس قسم کا اظہار تپاک ان کے لئے مفید تھا اور ان کی ہر دلعزیزی کا بڑا گواہ کہ جس صوبہ میں یہ حکومت کر کے آئے ہیں وہاں کے معززین سے ان کا کیسا اچھا سلوک رہا ہے'' (جہاد زندگانی صفحہ ۲۰۱) محترمہ سعیدہ وحید نے جو لکھا ہے وہ بھی سن رکھنے کے قابل ہے'' پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن جنیوا میں ہمارے قیام کے آخری سال میں آئے وہ اپنے

پولیٹیکل کیریئر سے ریٹائر ہو کر لیگ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین مقرر ہو کر سرکاری طور پر جنیوا آئے تھے لیگ آف نیشنز کی خوب صورت عمارت پر ایک بہت وسیع و عریض ریسٹورنٹ تھا وحید نے ان کے اعزاز میں وہاں دعوت کا اہتمام کیا''۔ (صفحہ ٦٢) مولوی صاحب نے اس دعوت کی جو غایت بیان کی ہے وہ اور ہے سعیدہ وحید نے جو لکھا ہے وہ یہ ہے ''١٩٣٧ کے موسم گرما میں گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن نے حضرت مولانا کو بلا کر لیگ آف نیشنز میں ڈائریکٹر انفارمیشن کی خالی اسامی کے لئے وحید کو نامزد کرنے کی خواہش ظاہر کی سال کے شروع میں اس عہدہ پر تعینات اور جنیوا میں مقیم ایک بنگالی افسر کار کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا تھا اور اب اس اسامی کے لئے پنجاب کی باری تھی۔ حضرت مولانا نے وحید کو جانے کی اجازت دے دی'' (صفحہ ٥٣) گویا ڈاکٹر وحید کی دعوت دعوت سپاس تھی دعوت خراج تحسین نہیں تھی۔ جس گورنر نے انہیں نامزد کر کے لیگ آف نیشنز میں بھجوایا تھا اس کا اتنا تو حق تھا کہ اس کے احسان کا اعتراف کیا جائے۔ مولوی صاحب نے اپنی خودنوشت میں سر ہربرٹ ایمرسن کے اس احسان کا ذکر کرنا پسند نہیں کیا۔

محترمہ سعیدہ وحید کو تحریک پاکستان میں بھی کام کرنے کے مواقع میسر آئے یہ اعزاز بھی انہیں ملا کہ قائداعظم ایک موقعہ پر ان کے ہاں دعوت پر تشریف لائے۔ اس طرح انہیں قائداعظم کی میزبانی کی شرف بھی حاصل ہوا۔ (صفحہ ١٠٢)

محترمہ سعیدہ وحید سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ سماجی بہبود کے کاموں میں بڑی تندہی اور خلوص نیت سے حصہ لیتی رہیں۔ فیروز سنز کے قائم کردہ فاطمہ ہسپتال کے لئے اپنے اوقات وقف رکھے اور دامے درمے قدمے سخنے اس نیک کام میں مصروف رہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک کام کی جزائے خیر دے۔ آمین۔

یہ خودنوشت ایک سادہ دیندار اور مخلص و مخیر خاتون کی خودنوشت ہے جس میں نئی نسل کی خواتین کے لئے بہت سبق پنہاں ہیں۔

❁

میری تنہا پرواز

بیگم کلثوم سیف اللہ خان کی خودنوشت ''میری تنہا پرواز''، علمی پبلشنگ بیورو پوسٹ بکس ١٨٦٧ جی پی او اسلام آباد والوں کی جانب سے جولائی ٢٠١١ میں چھپی ہے۔ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں یہ رواج چل رہا ہے کہ خودنوشتوں جیسی کتابیں بہ طور خاص دبیز کاغذ اور تصاویر کی وجہ سے بوجھل بنا دی جاتی ہیں۔ اس طرح کی پہلی کتاب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی خودنوشت اپنا گریباں چاک تھی۔ پھر بانو آپا نے اشفاق کی سوانح عمری راہ رواں کو بھی خاصہ گراں بار بنا دیا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب کی بلا جواز کو بلا جواز اتنا بھاری بنا دیا گیا کہ الجھن ہونے لگی۔ اب محترمہ کلثوم سیف اللہ نے اپنے حالات زندگی کا بار گراں قاری کے کندھوں پر لاد دیا ہے۔ ایک سیاسی اور سماجی رہنما اور صنعت کار کے حالات و احوال سے، ان کے افکار و نظریات سے اختلاف کے باوجود لوگوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے اس لئے ایسی کتابوں کو تو اصلاً اور معناً ہلکا پھلکا ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والا انہیں اپنی سہولت کے مطابق ان سے استفادہ کر لے۔ گراں بار کتابیں اٹھانے اور پڑھنے کا وقت اب قاری کے پاس کہاں؟ ہاں لائبریریوں میں سجانے کو ایسی کتابیں کام آتی ہیں۔

بیگم کلثوم سیف اللہ خاں کا تعلق ہمارے صوبہ خیبر پختون خواہ کے ایک قدیم خوشحال، معزز سیاسی گھرانے سے ہے۔ ان کے والد محترم جناب علی قلی خاں انگریزوں کی ملازمت میں ایک کامیاب پولیٹیکل ایجنٹ تھے اور یہ عہدہ اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے بہت معزز اور وقیع عہدہ تھا۔ جناب علی قلی خاں کو ان کی خدمات جلیلہ کے عوض اور اعتراف میں خطاب بھی عطا ہوئے۔ محترمہ کلثوم سیف اللہ خان نے اپنے بابا کے او بی ای ہونے اور ان کے اعزازی تمغہ ''قیصر ہند'' کا بڑے فخر سے ذکر کیا ہے اور اپنے بڑے بھائی جناب اسلم خٹک کی خودنوشت The Pathan

Odyssey کا حوالہ درج کیا ہے (میری تنہا پرواز صفحہ ۲۰)۔ ہم نے خٹک صاحب کی خودنوشت سے کہیں پہلے یہ احوال چوہدری ظفر اللہ خاں کی خودنوشت میں پڑھا ہوا تھا "چند سال پہلے مس ایلس کو اغوا کیا گیا تو سرحد کی حکومت نے خان علی قلی خاں صاحب کو ان کی رہائی کے لئے رستہ صاف کرنے کی مہم پر بھیجا جس کو انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا گو آخری مرحلہ پر یہ معاملہ خان بہادر مغل باز خاں کے ہاتھوں طے پایا۔ جب خان قلی خاں صاحب نے سرگزشت مجھے سنائی تو میں نے دریافت کیا خان بہادر صاحب اس کامیابی پر حکومت کی طرف سے کچھ خوشنودی کا اظہار بھی ہوا؟ فرمایا چوہدری صاحب! مغل باز خاں کو تو بہت انعام واکرام ملا اور ہمیں صرف دو مربعہ زمین اور وہ تمغہ جو عورتوں کو ملتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ کہا تمغہ قیصر ہند یا کچھ ایسی بلا"۔ (تحدیثِ نعمت صفحہ ۳۳۴)۔ خان علی قلی خان صاحب، قرۃ العین حیدر کے خالو، سید افضل علی کی وساطت سے چوہدری صاحب کے دوست تھے اور جب بھی شملہ تشریف لے جاتے چوہدری صاحب کے ہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ علی قلی خاں اور چوہدری ظفر اللہ خاں کی ایک قدرِ مشترک بھی بیان ہوئی ہے۔ "وہ نہایت خداترس اور اللہ پر بھروسہ رکھنے والے دلیر شخص تھے مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ تیزی سے گھر میں داخل ہوئے دروازہ کو زور سے بند کیا تیزی سے مصلٰی کی طرف لپکے اماں جان نے دیکھا تو حیرت سے کہا کیا آپ جوتے نہیں اتاریں گے؟ بابا نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ جوتوں سمیت اللہ کے حضور سربسجود ہو گئے ہم بچوں نے خوب اچھی طرح ان کے الفاظ سنے یا اللہ تعالٰی میں جس مہم پر جا رہا ہوں تو اس میں مجھے کامیاب کر" (صفحہ ۲۵) چوہدری صاحب کی بھی یہی سنت تھی کہ ہر کام کی ابتدا کرنے سے قبل اللہ تعالٰی سے استمداد کرتے تھے۔

جناب علی قلی خاں کا نام رکھنے کے بارے میں بہن بھائی کی روایتیں مختلف ہیں۔ کلثوم لکھتی ہیں "میرے والد کی پیدائش پر میرے دادا نے سات گاؤں خریدے تھے۔ اس نام کی رعایت سے ان کا نام کلی خان رکھا گیا" (ان کی زبان میں کلی گاؤں کو کہتے ہیں") (صفحہ ۱۷) اسلم خٹک صاحب نے لکھا ہے "میرے دادا نے مشن سکول میں ٹائم کیپری کا کام کیا۔ مشنریز ان دنوں بہت اہم لوگ تھے اور انہوں نے گاؤں کی تعمیر کی خصوصی اجازت کے لئے ان کی بہت مدد کی میرے والد اس دن پیدا ہوئے جب انہوں نے کام کا آغاز کیا لہذا انہوں نے اسے محمد قلی خان کا نام دیا جس کا مفہوم گاؤں کا خان

ہے" (صفحہ ۱۹) سات گاؤں خریدنے اور ٹائم کیپری کا کام کرنے میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے۔

بیگم سیف اللہ کا کہنا ہے کہ "علم کی جستجو اور فروغ کا ورثہ میں نے اپنے بابا سے پایا ہے" (صفحہ ۱۳) ان کے بابا ہی نہیں ان کے تینوں بھائی اسلم خٹک، جنرل حبیب اللہ خاں اور یوسف خٹک ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ اسلم خٹک اور یوسف خٹک آکسفرڈ میں پڑھے مگر حبیب اللہ خان نوعمری میں فوج میں چلے گئے اور لفٹیننٹ جنرل ہو کر چیف آف دی جنرل سٹاف کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ جنرل حبیب اللہ خاں کے صاحبزادے جنرل علی قلی خاں بھی لفٹیننٹ جنرل ہو کر فوج سے سبک دوش ہوئے۔ بیگم کلثوم سیف اللہ خاں نے باپ بیٹے کی اس مماثلت کا ذکر بھی کیا ہے "حبیب اللہ خاں کے بیٹے علی قلی خاں نے بھی پاک فوج میں شمولیت اختیار کی اور وہ اس بلوچ رجمنٹ سے وابستہ ہوئے جس میں حبیب اللہ خاں شامل ہوئے تھے علی قلی خاں کو بھی ۱۹۹۸ میں اس وقت ریٹائر کر دیا گیا جب وہ لفٹیننٹ جنرل کی حیثیت سے چیف آف جنرل سٹاف کے طور پر کام کر رہے تھے اس حیران کن مماثلت کی وجہ سے یہ دونوں باپ بیٹا عسکری حلقوں میں گاہے بگاہے مذکور رہتے ہیں" (صفحہ ۲۸) ہماری معلومات کے مطابق جنرل حبیب اللہ خاں کو صدر ایوب نے ناروا طور پر سبک دوش کر دیا تھا مگر جنرل علی قلی خاں نے جنرل پرویز مشرف کے چیف آف آرمی سٹاف مقرر ہو جانے پر ان کی ماتحتی قبول نہ کر کے خود اپنی مرضی سے فوج سے سبک دوشی حاصل کی تھی۔ (In The Line of Fire صفحہ ۸۵)۔

بیگم کلثوم کی شادی ہوئی تو آپ کی عمر صرف پندرہ برس تھی۔ ان کے دولہا بیرسٹر سیف اللہ خان ان سے گیارہ برس بڑے تھے۔ شادی کے وقت دولہا میاں کھدر کا لباس پہن کر آئے (صفحہ ۳۸) مگر رفتہ رفتہ کھدر پوشی ترک کر دی۔ بیرسٹر بنے تھے مگر پہلا ہی مقدمہ ان کے پاس آیا تو معلوم ہوا انہیں جھوٹ بولنا پڑے گا تو آپ نے بیرسٹری کا پیشہ یک قلم ترک کر دیا اور کاروبار کرنے لگے۔ (صفحہ ۴۷) بیرسٹر سیف اللہ خاں شادی کر کے شہروں میں پلی اس بچی کو اپنے گاؤں لے گئے جہاں کوئی ایسی سہولت میسر نہیں تھی جس کی یہ بچی عادی تھی پہلے روز جس کمرہ میں بٹھائی گئیں تھوڑی دیر بعد اس کمرہ میں ایک اونٹ آ گیا تو یہ خوفزدہ ہو کر اپنی ساس کے پاس بھاگیں۔ ساس نے تسلی دی کہ اونٹ ہی تو ہے۔ ہمارے ہاں پانی بھرنے والے اونٹوں پر پانی لاتے ہیں۔ (صفحہ ۴۰) مگر شوہر نے اتنی محبت دی

کہ سب کچھ بھول کر انہی کی ہو رہیں۔ شومیٔ قسمت کہ ان کے شوہر ۴۹ برس کی عمر میں راہی بقا ہو گئے اس وقت یہ بمشکل ابھی ۳۸ برس کی تھیں مگر آپ نے اپنے پانچ کم سن بچوں کی پرورش کے لئے تن من دھن سے مردانہ وار (صفحہ ۱۳۱) محنت کی اور بچوں کو ان کے یتیم ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا۔ کتاب کے پس ورق پر بڑی دل گداز عبارت لکھی ہے ''روز آخرت میں اپنے شوہر سیف اللہ خاں کے سامنے اپنے پانچوں بیٹوں کو پیش کر کے نہایت اطمینان کے ساتھ کہہ سکوں گی کہ آپ نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی جو ذمہ داری میرے سپرد کی تھی میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کو بخوبی ادا کیا''۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

اپنے سسر کی ایک بات آپ نے روایت کی ہے وہ کہا کرتے تھے ''اللہ میرے بچوں کے حاسد پیدا کر''۔ (صفحہ ۶۰) ان کا منشاء یہ تھا اللہ تعالیٰ ان کے بچوں کو اتنی ترقیات سے نوازے کہ لوگ ان کو حسد کی نگاہ سے دیکھا کریں۔

ان کی اولاد کے بارہ میں تو ان کے دادا کی دعا قبول ہوئی کہ سیف اللہ خاں کے بچے ماشاء اللہ لوگوں کے حسد کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہ خود نوشت چھپی تو اس کتاب پر ایک بے حد حاسدانہ تبصرہ پاکستان کے اخبارات میں چھپا جس میں ان پر اور ان کے بچوں پر ناروا تنقید روا رکھی گئی اور دل کا غبار نکالا گیا۔ ہمیں تو صرف اتنا علم ہے کہ بیگم کلثوم سیف اللہ کا میکہ خیبر پختون خواہ کا ایک نمایاں سیاسی خانوادہ تھا اور ہے اور سیاست میں دلچسپیاں اور وابستگیاں بدلتی رہتی ہیں۔ مسرت حسین زبیری نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ خان عبدالقیوم خاں کے زمانے میں ان کے بھائی ''یوسف خٹک کو ایکسائز کے ایک چپڑاسی کے مقابلہ میں دھاندلی کر کے ہرا دیا گیا تھا'' (Voyage Through History جلد دوم صفحہ ۳۷۷)۔ مگر اس خاندان کے مختلف افراد مختلف سیاسی پارٹیوں سے وابستہ رہے اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ بیگم صاحبہ خود مسلم لیگ اے این پی پیپلز پارٹی میں شامل رہیں حتیٰ کہ ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں بھی اپنی مشاورت سے اس ضیاء الحق کو سرفراز فرماتی رہیں جس نے ''انہیں بیگم نصرت بھٹو کی اعانت کرنے کے جرم میں نظر بند رکھا تھا'' (صفحہ ۶۷ مکرر صفحہ ۱۴۴)۔

ہمیں تو اس کتاب میں ان مولانا کا ذکر بہت خوش آیا جنہوں نے اسمبلی میں کہا تھا کہ ''اسمبلی میں خواتین موجود ہیں ان کے سامنے پردہ تان دیا جائے۔ مفتی محمود نے کہا اسلام میں غض بصر کا حکم

ہے آپ انہیں دیکھتے رہنے کی بجائے اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں'' (صفحہ ۱۳۷) مفتی محمود کے صاحبزادے مولانا فضل الرحمن کا ذکر خیر بھی پڑھ رکھنے کا ہے کہ ''ایک بار یہ بے نظیر سے ملاقات کے لئے ان کے دفتر گئیں۔۔۔ مولانا فضل الرحمن وہاں تشریف رکھتے تھے میں نے مشاہدہ کیا کہ محترمہ کی طرف دیکھتے ہوئے مولانا کی آنکھوں میں خاص چمک آ جاتی تھی۔ وہ اپنی نگاہیں مسلسل محترمہ پر جمائے ہوئے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان کی رال ٹپک رہی ہے۔۔۔ آپ نے یہ بات نواز شریف کو ان کے سامنے بتائی تو مولانا سے کوئی جواب بن نہ پڑا مگر مولانا نے پشتو میں انہیں یعنی بیگم کلثوم کو جواب دیا آخر میں جوان ہوں'' (صفحہ ۱۶۳)

سب سے چشم کشا انکشاف تو یہ ہے کہ ''بے نظیر کے خلاف عدم اعتماد کے لئے اسمبلی کے اراکین کو مری میں ہوٹلوں میں پابند کر دیا گیا اور بیگم کلثوم سیف اللہ کو ان کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی'' ایسا لگتا تھا جیسے وہ سب حراست میں ہیں اور میں ان کی جیلر ہوں۔ ہمیں مری کے ایک ہوٹل میں رکھا گیا تھا ہر شام نواز شریف آ کر کہتے تھے بیگم صاحبہ آپ کا بس یہ کام ہے کہ کوئی بندہ یہاں سے نکل کر نہ جائے۔۔۔ میں رات کو اپنے نوکر اور چوکیدار کو ساتھ لے جا کر دبے پاؤں جا کر کمروں کی کھڑکیوں میں سے جھانکتی تھی اور دیکھتی تھی کہ سب لوگ کمروں میں موجود ہیں میں ان سب کی گنتی کر کے واپس آ کر سوتی تھی۔۔۔ مقررہ دن تمام ارکان کو ایک بس میں سوار کر کے اسلام آباد لایا گیا جب سب لوگ سوار ہو گئے تو میاں صاحب کہنے لگے مہربانی کر کے پھر گنتی کر لیں کوئی بندہ پیچھے نہ رہ جائے'' (صفحہ ۱۶۲) سبحان اللہ کیسی صاف شفاف جمہوریت تھی اور اسی کا ڈھنڈورا یہ اب بھی پیٹتے پھرتے ہیں؟ کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ بیگم کلثوم سیف اللہ کو ایسی نگرانی پر تھوکنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ آپ نے یہ ساری بات صاف صاف بیان کر دی ہے قارئین ایسی جمہوریت پسندی پر جتنا چاہیں تھوکیں!

یہ باتیں تو اب کھلا ہوا راز ہیں ''ضیاء الحق نے خود انہیں بتایا کہ جب وہ پشاور آیا تو اپنی بیگم کو ایک تانگے میں سوار کر کے لایا تھا اور اس نے رہائش کے لئے جالندھر سویٹ ہاؤس کے اوپر ایک چوبارہ کرایہ پر لیا تھا''۔ اسی طرح ''جنرل اختر عبدالرحمن کا کہنا تھا کہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوا کرتے تھے کہ وہ اپنے لئے ایک سائیکل ہی خرید لیتا۔ لیکن بعد میں ان لوگوں نے جس انداز میں دولت سمیٹی اور جائیدادیں بنائیں اس کا عام آدمی تصور تک نہیں کر سکتا۔ اس واقعہ کے گواہ موجود ہیں کہ جب پیپسی کمپنی

فروخت کرنے کا فیصلہ ہوا اور ہمایوں اختر کے ساتھ سودے کی بات ہوئی تو اس نے اپنے بریف کیس میں سے کروڑ سے زائد روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر میز پر رکھ دئے اور کہا اب سودے کی بات شروع کرتے ہیں۔ میں ہر قیمت پر یہ پلانٹ خریدنا چاہتا ہوں"۔ (صفحہ ۱۵۸) سننے میں آیا ہے کہ جنرل اختر عبدالرحمٰن کی اولاد نے بیگم کلثوم سیف اللہ خاں کی اس بات پر بہت واویلا کیا ہے مگر ہم تو اس انگریز صحافی کی کتاب بھی پڑھ چکے ہیں جس نے صاف لکھا تھا کہ افغانستان کے اس لیڈر نے جسے ضیاء الحق کے منظورِ نظر جنرل مناسب اسلحہ مہیا نہیں کرتے تھے ضیاء الحق کو پیغام بھجوایا تھا یا تو سیدھے سبھاؤ ہمیں اسلحہ مہیا کرو نہیں تو اختر عبدالرحمن کے حوالے کر دو ہم اس سے اسلحہ خرید لیں گے۔ خود ہم نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں یہ حوالہ ترجمہ کر کے پاکستان کے پریس میں ریکارڈ کروایا تھا ہمیں معلوم ہوتا کہ لوگ اپنے کئے سے مکر جائیں گے تو اس کا حوالہ بھی سنبھال کر رکھتے۔ بیگم صاحبہ چاہیں تو معترضین کا منہ بند کرنے کو ہفتہ وار لاہور کے پرانے شمارے تلاش کروالیں۔

بیگم کلثوم سیف اللہ "۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں تو اپنی تقریر میں بھٹو صاحب کی خدمات کی تعریف کی۔ میری تقریر کے دوران پرنس آف سوات اورنگزیب نے ایک چٹ لکھ کر بھٹو صاحب تک پہنچائی کہ ان کی میٹھی میٹھی باتوں میں نہ آئیے یہ ہر ایک کے ساتھ اسی طرح باتیں کرتی ہیں۔ اجلاس ختم ہوا تو بھٹو صاحب خود چل کر میرے پاس آئے۔۔۔ اور اورنگزیب کی لکھی چٹ مجھے دکھائی کہنے لگے کیا کسی خاتون کے بارے میں اس طرح کی بات لکھی جانی چاہیئے؟ میں نے چٹ پڑھ کر صرف اتنا کہا He is loony! ۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن خدا کی قدرت کہ وہی پرنس اورنگزیب کچھ عرصہ کے بعد میرے پاس آئے اور کسی کام کی خاطر میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دئے۔ اس پر مجھے وہ چٹ یاد آگئی جو میرے بیگ میں پڑی تھی میں نے کہا جی ہاں میں تو ہر ایک کی خوشامد کرتی ہوں اور ساتھ ہی وہ چٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ ان کی حالت دیدنی تھی"(صفحہ ۱۸۷)۔

چندی یعنی بیگم عابدہ حسین نے جونیجو صاحب کے زمانے میں ایک بار اسمبلی میں کہا "ہمارا وزیر اعظم بڑا نالائق شخص ہے" (صفحہ ۱۶۰)۔ جونیجو صاحب نے انہیں کہا کہ یہ عابدہ کو سمجھائیں "عابدہ حسین اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں لہٰذا ان کو اسمبلی کے فلور پر ایسے غیر پارلیمانی

الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ میں یہ نہیں کہتا میں لائق ہوں یا نالائق ہوں میں جو کچھ بھی ہوں وہ ہوں۔ لیکن میں ضرور کہوں گا کہ اسمبلی کے فلور پر مہذب زبان استعمال کی جانی چاہیئے" (صفحہ ۱۶۰)۔ جونیجو صاحب کے اس طرز تپاک نے ان کی عزت ہماری نگاہ میں دو چند کر دی ہے۔

انہیں کچھ عرصہ کے لئے اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کا شرف بھی ملا۔ اس دوران اسرائیل کی نمائندہ ایک یہودی عورت حنا سے ان کے سماجی میل جول سے عرب ممالک کو شکایت پیدا ہوئی۔ ہمارے مستقل نمائندے اقبال اخوند صاحب نے انہیں اپنے دفتر میں بلایا اور اسرائیلی عورت سے اپنے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے کہا "آپ میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہیں لیکن شاید آپ نہیں جانتے کہ میں اس طرح کی باتیں سننے کی عادی نہیں ہوں۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ کوئی مجھے ڈکٹیشن دے۔ میرے لئے کیا بات غلط ہے اور کیا نہیں اس کا فیصلہ میں خود اپنے دل و دماغ کو استعمال کر کے کرتی ہوں۔ میں اسی وقت اپنا استعفیٰ لکھ کر آپ کے حوالے کر دیتی ہوں۔ آپ بھٹو صاحب کو اطلاع دے دیں کہ کلثوم چلی گئی۔۔۔ اس پر اقبال اخوند صاحب مجھے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور ایک گہرا سانس لے کر بولے آپ کا تو چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔ آپ اس معاملہ کو میرے اوپر چھوڑ دیں اور ریلیکس ہو جائیں" (صفحہ ۲۲۲)

اپنے بیٹے سے ملنے کیوبا گئیں تو واشنگٹن واپسی پر کیوبا والوں کا لٹریچر ان کے بیگ میں تھا وہاں امریکنوں نے ان کے ساتھ بہت بدتمیزی کی اور تلاشی لی۔ اس پر بہت ناراض ہوئیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ اس زمانہ میں امریکہ نہیں گئیں جب ہمارے صدر کے سٹاف کے جوتے بھی اتروائے جاتے ہیں!

اس خودنوشت کا باقی حصہ ان کے بیٹوں بہوؤں اور دیگر اعزا کے تاثرات پر مشتمل ہے جسے میں ان کی خودنوشت کا حصہ نہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کرتا ہوں۔ یہ خودنوشت صدق بیانی اور خلوص نیت کی وجہ سے ہمارے دور کے سیاسی رہنماؤں کی خودنوشتوں میں ممتاز رہے گی۔

جدوجہد حیات

پاکستان میں ایوب دور کے ایک سابق ایم این اے چوہدری جلیل احمد خاں کی خودنوشت ''جد وجہد حیات'' جہانگیر بکس لاہور کراچی کی جانب سے ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ سرنامے میں یہ شعر لکھا ہوا ہے ''اس طرح طے کی ہیں ہم نے اپنی منزلیں۔ چل کر گرے، گر کر اٹھے، اٹھ کر چلے''۔ سات سو صفحے کی اس خودنوشت کے علاوہ اس میں بے شمار متعلقہ غیر متعلقہ تصاویر بھی شامل ہیں جو ۲۷ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح مصنف نے اپنے حالات کے بیان میں دوسروں کے متعلقہ غیر متعلقہ اقتباسات، کالم، مضامین شامل کر کے کتاب کو بے حد ضخیم کر دیا ہے اور پڑھنے والوں کو آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ایسی خودنوشتوں کے لئے میں نے ''یادوں کی گٹھڑی'' کی اصطلاح تجویز کی تھی مگر چوہدری جلیل احمد خاں صاحب کی کتاب کے لئے مجھے گٹھڑی کا لفظ ناکافی محسوس ہو رہا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگ سفر پر جاتے تو اپنا کل سامان ایک بستر بند میں لپیٹ کر چل پڑتے تھے اس میں ضرورت کی ہر چیز سما جاتی تھی۔ انگریزی میں کیا عام محاورہ میں ہی اسے ہولڈال کہا جاتا تھا یعنی hold-all. باقی رہا اس سامان کا اٹھانا تو اس زمانہ میں مزدور اس کام کے لئے دستیاب تھے مزدور کے کاندھے پر ہولڈال لدوا لیا اور مزے سے آگے آگے چل پڑے۔ یہ خودنوشت جلیل احمد خاں صاحب کا ہولڈال ہے۔ ابراہام لنکن کی سوانح عمری، دیوان سنگھ مفتون کے ناقابل فراموش واقعات، اخبارات کے تراشے، اداریے، کالم اور اخباری خطوط۔ حتیٰ کہ خوشونت سنگھ کی شادی کا احوال بھی (صفحہ ۱۹۱) کیا ہے جو چوہدری صاحب کے اس ہولڈال میں بندھا ہوا نہیں؟ حد یہ ہے کہ انگریزی کے طول طویل حوالے درج ہیں پھر ان کا ترجمہ درج ہے گویا ضخامت تو ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں

رکھتی۔ اب رہا قاری؟ تو اس کی انہیں فکر نہیں۔ جو شخص نو سو روپے خرچ کرے گا وہ نہ پڑھے گا تو اپنا نقصان ہی کرے گا ہم جیسے لوگ جنہیں خودنوشتوں کے فنی تقاضوں کا خیال ہے کتاب کو مجبوراً پڑھیں گے۔ اور یہ پہلی کتاب ہے جسے میں نے دل پر جبر کر کے پورا پڑھ ڈالا ہے مبادا میں انصاف نہ کر سکوں۔

چوہدری جلیل احمد خاں نے ماشاءاللہ یہ کتاب تقریباً نوے برس کی عمر میں تحریر کی ہے ''خدا کے فضل سے میں ۸۸ برس کی عمر میں۔۔۔'' (صفحہ ۴۳۹) چاق چوبند ہوں پھر ایک مقام پر تاریخ تحریر بھی مندرج ہے ۲۹ نومبر ۲۰۱۰ (صفحہ ۵۲۴) اس عمر میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے فالج سے جانبر ہونے کے بعد بھی ان کی توانائیاں ان کے کام آ رہی ہیں۔ اس لئے چوہدری صاحب نے لکھنے میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں ہونے دیا ہر چیز جو ان کی نظر سے گذری ہے اسے سمیٹ لیا ہے۔ ایک تاثر تو یہ ابھرتا ہے کہ چوہدری صاحب کثیر المطالعہ آدمی ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آتا ہے کہ اپنی خودنوشت میں ان تمام چیزوں کا یکجا کر لینا کیا ضرور تھا؟

اپنی طبیعت کے لحاظ سے چوہدری صاحب تفصیل پسند لگتے ہیں۔ جنم بھومی کا طویل تاریخی حقائق سے بھرا ہوا ذکر۔ نابھا اور پٹیالہ اور مالیر کوٹلہ کی ریاستوں کی تاریخ پھر تاریخ آزادی پھر اواخر کتاب میں گوجرانوالہ اور اس کے نواح کے احباب و اکابر کا ذکر حتیٰ کہ ڈسکہ تک جا کر سر ظفر اللہ کا ذکر تو اپنے ہموطنوں میں کر دیا ہے ذرا اور آگے چلے جاتے تو اقبال اور فیض کا ذکر بھی ہو جاتا۔ امریکہ گئے ہیں تو اپنے گرین کارڈ تک کی تمام تفصیلات درج کر دی ہیں۔ دیگر اسفار کا ذکر بھی تفصیلی ہے بلکہ ان کے پہلی بار کے سفر کے حالات پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے کوئی بچہ پہلی بار کسی اجنبی چیز کو حیرت سے دیکھ رہا ہو۔

ہمیں تو ''سمانہ'' کا ذکر بہت اچھا لگا۔ جسٹس منیر (جن کا نام دو جگہ جسٹس منیر احمد لکھا ہے حالانکہ وہ محمد منیر تھے) سمانے کے رہنے والے تھے۔ ''اورنگزیب نے سمانہ کے بارے میں لکھا ہے'' بہرِ بربادیٔ عالم یک کسِ سمانہ کافی است'' کہ دنیا کی بربادی کے لئے سمانہ کا ایک آدمی ہی کافی ہے۔ چنانچہ جسٹس منیر احمد پاکستان میں بربادیٔ جمہوریت کی بڑی وجہ بنا'' (جدوجہد حیات صفحہ ۲۸۶) اب

اورنگزیب نے یہ کہاں لکھا ہے اس کا حوالہ اور اس کا وبال چوہدری صاحب کے کندھوں پر ہے۔

نوجوانی میں طالب علمی کے زمانہ میں سیاست کا شوق چرایا۔ بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں شامل ہونے کا جذبہ دل میں اٹھا تو گھر سے بھاگ لئے مگر ان کے کامریڈ نے انہیں دھوکا دیا تو بددل ہو گئے۔ اس وقت ابا نے سرزنش کے ساتھ یہ نصیحت بھی کی کہا بیٹا اگر سیاست ہی کرنی ہے تو وکیل بنو پھر سیاست میں آؤ (صفحہ ۷۰) ابا کی یہی نصیحت آپ نے دہرائی بھی ہے اور وکالت کے پیشہ میں آنے کے بعد اسمبلی کے الیکشن میں کھڑے ہوئے ہیں (صفحہ ۲۱۵)۔ سیاست میں ناکامیوں سے بھی دوچار ہوئے مگر بالآخر قومی اسمبلی کے رکن بن گئے اور اپنے علاقہ اور عوام کے بہت کام آئے۔ ان کی عمومی شہرت کام کرنے کروانے والے رکن قومی اسمبلی کی تھی۔ اتنا تو چوہدری صاحب نے خود بھی بیان کر دیا ہے کہ مشرقی پاکستان کے دور دراز علاقہ تک ایک دوست کے ٹیلیفون کنکشن کی منظوری لینے کے لئے وزیر متعلقہ کے گھر پہنچے۔

اسمبلی کی رکنیت کے دوران اور اس کے بعد بھی ان کا صدر ایوب سے رابطہ رہا صدر ایوب نے ان کا ذکر خیر اپنی ڈائری کے تین صفحات میں بھی کیا ہے ''گوجرنوالہ سے ایک سابق رکن اسمبلی جلیل احمد مجھ سے ملنے آئے وہ ایک مدبر اور ذہین سیاسی تجزیہ نگار ہیں ان کے مشاہدات مندرجہ ذیل ہیں ---'' (صفحہ ۳۷۱) اس کے بعد ان کے بیان کردہ نکات کا ذکر ہے۔

مغربی پاکستان کے گورنر ملک امیر محمد خاں سے بھی ان کی ملاقات رہی۔ ان کا ایک معنیٰ خیز واقعہ آپ نے بیان کیا ہے جو ہم نے پہلی بار سنا ہے اس لئے اپنے قارئین کو اس میں شریک کرتے ہیں ''ایک دفعہ صوبہ پنجاب کے سکریٹری داخلہ کے روبرو ایک پھانسی پر پیٹشن ہوئی۔ انہوں نے ایک لاکھ روپیہ رشوت لی رشوت اس لئے لی گئی کہ گورنر سے پھانسی کی سزا کو عمر قید کی سزا میں تبدیل کروا دیں گے۔ کرپشن کے معاملہ میں ان کی سی آئی ڈی اس قدر مضبوط تھی کہ ان کو پتہ چل گیا کہ سکریٹری داخلہ نے پھانسی کیس میں ایک لاکھ روپیہ رشوت لے لی ہے۔ جب سکریٹری داخلہ نواب صاحب کے پاس فائیلیں لے کر گئے تو پھانسی والی فائل فائلوں کے درمیان رکھی ہوئی تھی اور سکرٹیری داخلہ نے اس پر سفارش لکھی تھی کہ اس کی سزا پھانسی کی بجائے عمر قید میں تبدیل کر دی جائے نواب صاحب نے ایک دو

فائیلیں نکالنے کے بعد سکریٹری داخلہ کا نام لے کر کہا وہ لاکھ روپے والی فائل کہاں ہے؟ سکریٹری داخلہ کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے فائل نکال کر دی اور نواب صاحب نے اس پر لکھا کہ نامنظور اور سکریٹری داخلہ سے کہا لاکھ روپے واپس کر دو۔ پھر انہوں نے سکریٹری داخلہ کا تبادلہ ایسی جگہ کر دیا جہاں وہ رشوت نہ لے سکے'' (صفحہ ۲۷۷)۔

یہ بھی مذکور ہے کہ پنجاب کے ایک سیاسی لیڈر جو بعد میں شہید ہوئے جنرل رانی کو پندرہ ہزار روپے ماہوار دیا کرتے تھے بلکہ وہ حج کے لئے گئی تو اسے کراچی تک الوداع کہنے کو گئے۔ (صفحہ ۳۹۳) مگر ساتھ میں ایک عیسائی ہم وطن کی اولوالعزمی کا ذکر بھی ہے کہ وہ لوہیانوالہ سے نکل کر باہر گیا تعلیم حاصل کی پھر انگلستان میں رگبی نامی شہر میں آباد ہوا اور لیبر پارٹی کے ٹکٹ پر وہاں کا میئر بن گیا۔ وہ پاکستان آیا تو چوہدری صاحب نے اسے بار میں بلایا۔ وہاں اس نے جو تقریر کی وہ یاد رکھنے کی ہے اس نے کہا میں یہاں سے باہر گیا تعلیم حاصل کی اب وہاں ایک شہر کا میئر ہوں اگر نہ جاتا تعلیم حاصل نہ کرتا تو آپ یہاں بار میں مجھے آنے دیتے؟ دور سے ہی دھتکارتے ''اوئے چوڑھیا نکل یہاں سے''۔ (صفحہ ۵۱۶)۔

۱۹۷۴ میں گوجرانوالہ میں احمدیوں کے خلاف فسادات ہوئے ان کے دوست ظفر اللہ خاں احمدی جماعت کے امیر تھے ایسے وقت میں چوہدری صاحب نے ان کی بہت مدد کی۔ انہیں ہجوم سے نکالا اور پھر اپنی کالونی میں احمدیوں کو زمینیں دیں تا کہ وہ ایک جگہ اطمینان سے رہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس خیر خواہی کی جزا دے۔ (صفحہ ۵۲۰)

جلیل احمد خاں صاحب کی عادت جاریہ ہے کہ ہر باب کے شروع میں کوئی مشہور مقولہ درج کرتے ہیں۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی اور معاہدہ تاشقند والے باب میں آپ نے جماعت احمدیہ کے تیسرے امام کا وضع کردہ مشہور سلوگن درج کیا ہے LOVE FOR ALL HATRED FOR NONE۔ (صفحہ ۳۲۵) چوہدری صاحب نے اس سلوگن کے معانی تو درج کر دئے ہیں الفاظ میں خدا جانے کیوں تغیر و تبدل کر دیا ہے۔

چوہدری صاحب سیاسی مشورے دینے میں بہت مستعد ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں''

نواب چھتاری وزیر اعظم حیدر آباد کو مشورہ دینے چلے تھے کہ انہیں حکومت ہندوستان سے امور خارجہ، ڈیفنس اور کمیونیکیشن کے محکمے انہیں دے کر الحاق کرلیں ورنہ آپ کے لئے اچھا نہیں ہوگا“ (صفحہ ۱۹۵)۔ یہ مشورہ چوہدری صاحب اس وقت تو نہ دے سکے البتہ اب کتاب میں ضرور درج کر دیا ہے اور اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح جب ۱۹۷۰ کے الیکشن میں احمدیوں نے بھٹو صاحب کو سپورٹ کیا تو چوہدری صاحب کا مشورہ سننے کا ہے“ میں ربوہ خلیفہ صاحب کے پاس گیا۔۔۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ ہر جگہ پی پی کو سپورٹ نہ کریں۔ اگر آپ نے تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں رکھ دئے اور بھٹو صاحب سے بگڑ گئی تو کوئی آپ سے اظہار ہمدردی نہیں کرے گا۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ ایک متنازعہ فرقہ ہیں لہذا آپ کو چاہیئے کہ ہر جگہ مختلف پارٹیوں کو ووٹ دیں تاکہ اگر کوئی برا وقت آئے تو تو کچھ لوگ آپ کے ساتھ کھڑے ہوجائیں۔ اگر آپ نے سارے ووٹ پی پی کو دئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پی پی آپ کے خلاف ہوگئی تو دوسرا کوئی آپ کے ساتھ نہیں ہوگا۔ یہ سن کر وہ ہنسنے لگے۔ اور کہنے لگے چوہدری صاحب آپ غلطی پر ہیں آئندہ پندرہ سال سے پہلے پی پی کہیں نہیں جائے گی۔ جب ہم سپورٹ کریں گے تو وہ کہیں نہیں جائے گی“ (صفحہ ۴۰۴)۔ آخری فقرہ نے اس قیمتی ”مشورہ“ کی قلعی کھول دی ہے کیونکہ کوئی سیاسی مدبر ایسی بات کبھی نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ کسی ایسی جماعت کا رہنما ایسی بات کہے جو سیاسی جماعت ہے ہی نہیں اس تمام ردو کد سے نتیجہ نکلتا ہے کہ چوہدری صاحب بعد از وقت مناسب مشورے دینے کے بڑے شوقین ہیں جب پی پی نے جماعت احمدیہ کے خلاف احسان فراموشی کرتے ہوئے تحریک شروع کروائی اور اس کے خلاف جارحانہ اقدامات کئے تو چوہدری صاحب کو ایسے مشورے یاد آئے تاکہ قاری کو یہ باور کرواسکیں کہ انہوں نے تو مناسب مشورے دئے تھے لوگوں نے ان کے مشوروں کو صائب نہ جانا۔ ہاں اس بات کی داد دینی چاہیئے کہ احمدیوں کے خلاف پی پی نے یا بعد کو ضیاء کی حکومت نے جو غیر انسانی قوانین بنائے اور جو سلوک روا رکھا اس پر انہیں دکھ ہے اور وہ برملا اس دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔

ضیاء الحق نے اسلام کے نام پر جو ظلم و ستم روا رکھا اور پاکستان کو جس طرح دہشت گردی کا اکھاڑہ بنا دیا اس کا بڑا حقیقت پسندانہ تجزیہ جلیل احمد خاں صاحب نے کیا ہے ”سعودی عرب کو خوش

کرنے کے لئے احمدیوں اور شیعوں کے خلاف قوانین بنائے گئے مختلف فرقوں کو لڑایا گیا سنیوں میں سپاہ صحابہ بنوائی جو شیعوں کو کافر سمجھتی اور قتل کرتی تھی اور احمدیوں کے خلاف ایسے قوانین بنائے گئے کہ ان کا اس ملک میں رہنا مشکل ہوگیا۔ ان ملاؤں کو نوازا گیا جو اسلام کا پرچار کرتے تھے فرقہ وارانہ نفرت کا سیلاب آیا کیونکہ ایسے مدرسے بنوائے گئے یہ مدرسے اپنے اپنے فرقے کی تعلیم دیتے اور دوسرے فرقوں کے لوگوں کو کافر کہتے تھے موجودہ مدرسے اب دہشت گردی کی نرسری بن گئے ہیں۔ لشکر طیبہ اور جیش محمد جیسی تنظیمیں بنوائی گئیں جن کو کشمیر اور افغانستان میں لڑائی کے لئے تیار کیا جاتا تھا ۔۔۔ ان سب پالیسیوں کا خمیازہ ملک بھگت رہا ہے۔۔۔ اسلام کے نام پر ایسے قانون نافذ کئے گئے جو اسلام کی روح کے خلاف تھے“ (صفحہ ۴۳۳) غرض ملک کو اسلام کے نام پر جتنا ضیاء الحق اور اس کے حواریوں نے برباد کیا اس کی مثال ہم عصر تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ جلیل احمد خاں صاحب اس برملا گوئی کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جس کو حق سمجھتے ہیں اسے حق کہنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

یہ خود نوشت اتنی ضخیم نہ ہوتی اور ساتھ میں تصاویر کا اتنا پشتارہ منسلک نہ ہوتا تو قاری کو پڑھنے اور استفادہ کرنے میں آسانی رہتی۔ بصورت موجودہ یہ کتاب شیلف پر سجانے کے کام تو آئے گی شاید بہت کم لوگ اس کے مندرجات سے مستفیض ہوسکیں۔

حاصل عمر گریزاں

ہمارے اورینٹل کالج کے سابق طالب علم ،استاد بھائی،اور ادب کے استاد محترم حسن عسکری کاظمی کی بے رنگ اور طول طویل خودنوشت ''حاصلِ عمرِ گریزاں'' اظہار سنز لاہور والوں کی جانب سے ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ چھ سوصفحوں کی اس خودنوشت، جسے آپ نے ''خواب بیتی'' کہا ہے، میں ان کے ملنے والوں عزیزوں دوستوں رفیقوں افسروں کا ذکر زیادہ ہے ان کی اپنی حیثیت محض ایک راوی کی ہے جو ہر رطب و یابس کو بیان کر رہا ہے اور اور ہر کہہ ومہہ کا تذکرہ کیے جاتا ہے۔ میں نے محترم خلیق ابراہیم خلیق کی خودنوشت کو حدیث دیگراں قرار دیا تھا ان کی خودنوشت حدیث دیگراں سے بھی چار قدم آگے گذر گئی ہے۔ادب کے ایک استاد سے جس نے عمر بھر ادب پڑھایا ہو ایسی بات کی توقع نہیں تھی کہ وہ اردو میں لکھی گئی دو سو سے زیادہ خودنوشتوں کے باب میں اتنے لاعلم ہوں گے اور خود اپنی خود نوشت سے ایسا غیر فنی سلوک روا رکھیں گے ۔حسن عسکری کاظمی صاحب نے کتاب کے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے کہ ان کے علم کے مطابق'' ہمارے نثری سرمائے میں داستان ناول افسانہ،تنقید، سوانح خطوط انشائیہ رپورتاژ اور سفر نامہ غرض بہت کچھ شامل ہے لیکن آپ بیتی جیسی صنف ادب کی طرف اتنی توجہ مبذول نہیں ہوئی البتہ بیسویں صدی میں چند آپ بیتیاں شائع ہوئیں''۔(حاصلِ عمرِ گریزاں۔صفحہ ۱۷)۔مصنف کی معلومات کا آغاز شہاب نامے سے ہوتا ہے حالانکہ شہاب نامہ سے کہیں پہلے کئی خودنوشتیں شائع ہو چکی تھیں اب تو انیسویں صدی کے آغاز میں چھپنے والی خودنوشتیں بھی منظر عام پر آ چکی ہیں۔اردو ادب کے ایک سینئر استاد کی اپنے ادب سے ایسی غفلت کو ان کے شاعرانہ تغافل کا شاخسانہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حسن عسکری کاظمی صاحب انبالہ کے کاظمیہ سادات گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ہجرت کے بعد

گجرات میں آباد ہوئے ان کی والدہ ان کی کم سنی میں وفات پا گئی تھیں مگر والد نے نکاح ثانی نہیں کیا اور اپنے بیٹے کو پیار محبت سے رزق حلال پر پالا حالانکہ پیشہ کے لحاظ سے پٹواری تھے اور ہمارے معاشرے میں زمینداروں کے حق میں ہمارے سابق سکریٹری تعلیم اور سینئیر سول سرونٹ مہر جیون خاں صاحب کے قول کے مطابق'' اوپر ذات باری نیچے پٹواری یونہی نہیں کہا گیا'' ۔(جیون دھارا صفحہ ۲۳)

کاظمی صاحب نے ایم اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں آنے سے قبل دیلیج ایڈ کے محکمہ میں تین سال کام کیا پھر کمیشن سے چنے گئے اور کالج میں آ گئے جہلم میں لمبا عرصہ گزارا۔بچوں کے بڑے ہونے تک لاہور آ گئے اور لاہور ہی میں اپنا عرصہء ملازمت پورا کیا۔جہلم میں تھے تو،اور گجرات میں تھے تو،ادبی سرگرمیوں سے ان کا واسطہ رہا مشاعروں کے منتظم رہے اور اسی ہاؤ ہو میں زندگی بسر کر دی علمیت بڑھانے یا ریسرچ کرنے کا خیال انہیں نہ آیا ان کے لئے کالجوں کے مشاعرے یا مباحثے ہی بس رہے۔ناصر کاظمی سے ان کی قرابت داری تھی خود بھی شعر کہتے تھے شعر گو اور صاحب ذوق رفقاء کے ساتھ ان کی خوب چھنتی رہی مگر ایک بات شروع کرتے ہیں اور پھر اس کی رو میں کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں مثلاً اپنی شادی کا ذکر شروع کرتے ہیں اور اس رو میں بہتے بہتے دور نکل جاتے ہیں'' بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں چلی گئی'' (صفحہ ۱۷۷) یہی حال ان کا دوسرے معاملات میں بھی ہے غالباً ان کا خیال تھا کہ اپنی خودنوشت کو جتنا طول دیں گے وہ اتنی ہی اہم معلوم دے گی مگر انہیں یہ خیال نہ آیا کہ ان کے قاری کو ان سے ان کے اندر کے ادبی آدمی سے دلچسپی ہے اسے ان کی خوردہ گیری سے کوئی دلچسپی نہیں۔

انہیں بہت سے اہم آدمیوں کے ساتھ ملنے یا ان کے ماتحت کام کرنے کا موقعہ ملا مگر یہ ان کی شخصیت کو دوسروں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی پر زیادہ انحصار رکھتے ہیں۔ حفیظ جالندھری ان کے افسر بھی رہے مگر حفیظ صاحب کی اپنی اہمیت جتانے کی عادت کا ذکر ایسے انداز اور موقعے پر کیا ہے کہ ان کی بات بے وزن ہو گئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے بین الاقوامی اسلامی کلوکیم میں یہ ایک طالب علم کی حیثیت سے ڈیوٹی دے رہے تھے مہمانوں کو ان کی نشستوں تک پہنچانا ان کی ذمہ داری تھی اور بس۔اب یہ لکھتے ہیں'' محمد افضل وائس چانسلر ایک سیشن کی صدارت کر رہے تھے ان

کے ساتھ ابوالاثر حفیظ جالندھری بطور مہمان خصوصی بیٹھے تھے وائس چانسلر محمد افضل سے خطاب کرتے ہوئے حفیظ صاحب نے کہا "میں پاکستان کا وہ شاعر ہوں جس نے قومی ترانہ تخلیق کیا میں نے شاہنامہ اسلام لکھا لیکن مجھے یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری تک نہیں دی" (صفحہ ۱۵۵) اس جگہ دو معنوی غلطیاں آپ سے سرزد ہوئی ہیں ایک یہ کہ وائس چانسلر میاں افضل حسین تھے کوئی محمد افضل نہیں تھے دوسرے حفیظ صاحب نے اگر ایسی کوئی بات کی بھی ہوگی تو وہ ان تک کیسے پہنچی؟ کیا یہ حفیظ صاحب کے پاس کھڑے تھے؟ یہ درست ہے کہ حفیظ صاحب کو اپنے قومی ترانہ کا خالق ہونے کا اس قدر زعم تھا کہ ان سے ایسی بات کوئی بعید نہیں۔ مگر قومی ترانوں کے لکھنے والوں کو یونیورسٹیاں اعزازی ڈگریاں نہیں دیا کرتیں۔ باقی رہا شاہنامہ اسلام تو اس کے بارہ میں ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں۔ منٹو تو اس کے ایک شعر کے سہل ممتنع ہونے کا حوالہ دیا کرتے تھے "وہ لڑکا جو کہ لیتا ہے وہ لڑکی جو کہ لیٹی ہے۔ وہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے"۔

اسی قبیل کی ایک سنی سنائی بات آپ نے ملک امیر محمد خاں گورنر مغربی پاکستان کے بارے میں لکھ دی ہے۔ حوالہ اپنے رفیق کار پروفیسر ارزش کا دیا ہے جو "نواب کالاباغ کے بارے میں ایک داستان گو کی طرح درون خانہ کے حالات سنایا کرتے تھے" (صفحہ ۳۸۵)۔ جو بات آپ نے بیان کی ہے وہ یوں ہے کہ جہلم کے کسی صاحب نے نواب کالاباغ کے بارے میں بہت تخفیف کے کلمات کہے۔ نواب صاحب کو اس کا پتہ چل گیا تو نواب صاحب نے ان صاحب کو گورنر ہاؤس بلا کر الٹا لٹکایا اور انہیں کوڑے لگائے۔ نواب کالاباغ کے باب میں بہت کچھ کہا سنا گیا ہے مگر ایسی بات حسن عسکری کاظمی صاحب کی روایت سے سنی کہ نواب صاحب نے کسی کو گورنر ہاؤس بلا کر بذات خود اس پر تشدد کیا ہو۔ بے پر کی اڑانے والے بھی بیخود دہلوی کی طرح دائیں بائیں دیکھ کر اڑاتے ہیں۔ ایک اور نمونہ ان کے زمیندارہ کالج کے کانووکیشن کے بیان کا ہے "گورنر جنرل غلام محمد مہمان خصوصی کے طور پر آئے۔۔۔ ان کو لقوہ ہو چکا تھا ان کا منہ ٹیڑھا اور آواز میں تھرتھراہٹ تھی طلبا نے تقریر سننے کی بجائے الٹی سیدھی آوازیں نکالیں۔ گورنر جنرل غصہ میں آ گئے وہ پچھلے دروازے سے نکلے اور سیدھے پرنسپل کے کمرے کی طرف چلے۔۔۔ پرنسپل صاحب نے قہر آلود نظروں سے طلبا کو دیکھا اور کہا میں ان کو لے

کر آتا ہوں آپ اس طرح خاموش رہنا کہ کسی گوشے سے آواز نہ آئے ورنہ۔۔۔ وہ یہ فرما کر اپنے کمرے میں گئے اور دروغ بر گردن راوی پروفیسر غلام سرور علیگ نے اپنے شاگرد رشید گورنر جنرل غلام محمد کو ڈانٹ پلائی۔۔۔ واپس چلو اور اپنی تقریر مکمل کرو" (صفحہ ۱۰۸) کیا ان حوالوں کے بعد بھی پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب کی خودنوشت کے بے سروپا واقعات کے توثق کے بارے میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟

ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ حسن عسکری کاظمی نے بعض باتیں خوب کہی ہیں۔ ناصر کاظمی موسیقی سیکھتے رہے ہیں (صفحہ ۵۱ مکرر ۲۳۷) حسن رضوی ان کے عزیز تھے اور بڑے ہونہار تھے (صفحہ ۵۲) ڈاکٹر سلیم اختر ان کے ہموطن تھے (صفحہ ۶۱) عاشور کاظمی ان کے دوست تھے (صفحہ ۸۹) استاد امام دین گجرات کی نامور شخصیت تھے (صفحہ ۱۲۶) اکمل علیمی ان کے کلاس فیلو تھے (صفحہ ۱۳۹) زاہد کاظمی ہری پور ہزارہ سے ان سے خط و کتابت رکھتے ہیں (صفحہ ۱۵۰) اقبال ساجد شاعر اچھا تھا مگر چھچھوری حرکتیں کرتا تھا (صفحہ ۲۴۱) ثاقب زیروی مشاعرہ میں جانے کا پانچ سو روپیہ طلب کرتے تھے (صفحہ ۲۴۰) ڈاکٹر صفدر حسین اعلیٰ پائے کے مرثیہ نگار تھے اور ان کا انتقال منبر پر ہوا (۴۶۸) قاسمی صاحب نے انور سدید کے بارے میں نازیبا فقرہ کہا تھا (صفحہ ۵۱۰) ڈاکٹر رؤف سنکی ڈی پی آئی تھے (صفحہ ۴۱۵) ضیاء الحق اپنے انجام کو پہنچا اور جہنم میں جلتا رہا۔ (صفحہ ۳۴۲)۔ جعفر طاہر نیک پرہیزگار متقی آدمی تھے مشاعرہ کی صدارت سے قبل مسجد میں عبادت کرتے پائے گئے (صفحہ ۲۷۵) اور شیخ منظور الٰہی نہایت دیانت دار افسر تھے۔ (صفحہ ۱۸۱)

ہمیں تو اپنے دو ہم جماعت دوستوں کا ذکر بڑی دیر کے بعد سننے کو ملا۔ پروفیسر اسرار احمد (صفحہ ۴۳۰) اور نبوت یار خاں۔ (صفحہ ۴۳۹)۔ ہمیں تو یہی بس ہے کہ بھولے بسرے دوستوں بزرگوں کا ذکر یکجا مل گیا ہے اور ہم اسی کو غنیمت جانتے ہیں اگرچہ ان خزف ریزوں کو حاصل کرنے میں ہمیں چھ سو صفحات کی خاک چھاننا پڑی ہے۔

❀

جستجو کیا ہے

جناب انتظار حسین کی دوسری خودنوشت ''جستجو کیا ہے'' سنگ میل والوں کی جانب سے ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ پہلی خودنوشت ''چراغوں کا دھواں'' جسے انتظار صاحب نے پچھلے پچاس برس کی یادیں کہا تھا ۱۹۹۹ میں سنگ میل ہی کی جانب سے چھپی تھی۔ بارہ برس کے وقفے کے بعد اس کتاب کا قصہ یوں ہوا کہ ''قصہ تمام ہوا اور قصہ باقی ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ زمانے کے بعد جب میں نے اپنی گمشدہ بستی کو کھوج لیا اور اس کی گلیوں میں تھوڑا گھوم پھر لیا تو دل میں کن من ہونے لگی۔ پھر نوک قلم میں بھی کنمناہٹ شروع ہوگئی سو میں شروع ہوگیا۔ پھر بات کہیں سے کہیں پہنچی۔ شوق نے بات کو بڑھایا اور وہ بڑھتی چلی گئی اپنی گلیوں سے ہوتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا بعض لوگوں کو زبان پر قابو نہیں ہوتا ایک بار جاری ہو جائیں تو پھر مشکل ہی سے رکتے ہیں بعض کے قلم قابو میں نہیں رہتے مگر میں تو ان میں سے نہیں۔ زبان اور قلم دونوں کم کم ہی بے قابو ہوتے ہیں یہاں شوق زیادہ تھا پھر قلم ایک دفعہ رواں ہوا تو پھر روانی زور پکڑ گئی'' (جستجو کیا ہے۔ صفحہ ۲۹۴) اس زور قلم کے نتیجہ میں جو کتاب وجود میں آئی ہے انتظار صاحب نے اس کی صنف کا تعین نہیں کیا اور قاری کو کھلا چھوڑ دیا ہے کہ وہ چاہے تو اسے سفرنامہ سمجھے چاہے تو خودنوشت قرار دے اور ہاں یہ اشارہ ضرور دیا ہے کہ ''خودنوشت لکھنا اپنے اردگرد جھانکنے کے علاوہ اندر جھانکنے کا عمل بھی ہے۔'' (صفحہ ۲۹۵) اور مصنف نے اس کتاب میں اپنے اندر کے اندھے کنویں میں خوب جھانک تانک کی ہے اور دیکھتے پھرے ہیں کہ اس اندھے کنویں میں ڈبائی کے ہندو باسیوں نے جو سانپ پکڑ پکڑ کر ڈالے تھے وہ کدھر سٹک گئے ہیں؟ مسلمان تو سانپ کو برداشت کرنے کے روادار نہیں تھے کہیں کوئی زمین سے باہر نکل آتا تو گھر کے مرد

لاٹھی پونگے لے کر کھڑے ہو جاتے اور سانپ کا سر کچل دیتے۔ جب یہ کہانی اختتام کو پہنچی ہے تو مصنف کا کہنا ہے ''لو صاحبو پریم یاترا اتمام ہوئی'' (صفحہ ۲۵۹) یہ پریم یاترا ہے اور خودنوشت پریم یاترا ہی تو ہوتی ہے!

انتظار حسین ہمارے افسانوی ادب کے دور حاضر کا اہم ترین نام ہے۔ چراغوں کے دھواں میں آپ نے کہا تھا کہ ''ہمعصر ادب میں جو زبان چالو ہے میں اس سے انحراف کر رہا ہوں اور یہ کہ یہ انحراف آگے چل کر مجھے بہت رسوا کرے گا'' (چراغوں کا دھواں صفحہ ۳۱) مگر یہاں آ کر انتظار صاحب نے اپنی فکشن کی روایت کے اور چھور کو ٹٹولا ہے اور واضح کیا ہے کہ ''مجھے تو یہ روایت داستانی دور سے گذر کر قدیم ہندوستان کی کتھا کہانی کی پرمپرا سے جڑی نظر آتی ہے۔ کوئی نہیں مانتا تو نہ مانے میں جب کہانی لکھنے بیٹھتا ہوں تو اسی روایت سے اشارہ لیتا ہوں۔۔۔۔ میرے تحیر اور تجسس کا مرکز کہیں اور ہے وہاں تو کتھا کہانی کا ساگر امنڈا ہوا ہے نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم'' (صفحہ ۲۵۳) انتظار حسین کی زندگی کا یہ سفر اسی کتھا کہانی والے وشال دیس کا سفر ہے۔ سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے۔ ایک ''خواب البتہ دیکھا تھا کہ کبھی گھورے کے بھی دن پھریں اور ایسا شبھ سمے آئے کہ ان بستیوں کو جن کی لڑکپن میں خاک پھانکی تھی اور ان بستیوں کو جنہیں ایک دفعہ دیکھا تھا دوسری دفعہ دیکھنے کی آرزو ہے اور ان بستیوں کو جنہیں دیکھنے کی حسرت لئے پھرتے ہیں کہ اپنے جیتے جی ایک دفعہ دل بھر کے برت لیں۔۔ ارے یہ تو سچ مچ خواب کی تعبیر نکل آئی'' (صفحہ ۱۷۶) اور وجیندر جی سے ملنے کی حسرت بھی پوری ہوگئی ''شاستری جی سے تمہارا کیا سمبندھ ہے؟ میں نے کہا میں ان کا شش ہوں۔۔۔ شش اور گورو کا ناتا ایسا ہوتا ہے کہ کتنا ہی سمے بیت جائے اور دنیا کتنی ہی بدل جائے وہ ناتا نہیں ٹوٹتا'' (صفحہ ۶۲)

بات اپنی جڑوں کے سراغ سے شروع ہوئی اور چلتی چلتی ہندوستان کے ہر بڑے چھوٹے تاریخی دیومالائی شہر تک پہنچی اور اس سفر مبارک اثر کا وسیلہ کہیں ادبی کانفرنسیں بنیں کہیں ساہتیہ اکادمی آڑے آئی کہیں ان کی کتابوں پر ایوارڈ دینے والے ان کے میزبان بنے اور یوں ان کی پریم یاترا سپھل ہوتی چلی گئی۔ اپنی ڈبائی میں مٹھن لال کی دکان پر پہنچ کر انہیں احساس ہوا کہ ''ڈبائی نہیں بدلی

میں بدل گیا ہوں'' (صفحہ ۸) ''گھر چھوٹا ہو گیا ہے۔۔۔ سکڑا سمٹا لگتا ہے'' (صفحہ ۱۱) ''آخر کے تئیں اپنی گمشدہ بستی کو پالیا ہے'' (صفحہ ۱۵) ان کا وہ مکان جس سے ان کی یادیں وابستہ تھیں وہ ''ارجن کمار نے خرید لیا ہے۔۔ جس میں اسے دبا گڑا خزانہ ملا تھا'' (صفحہ ۱۵) ''مگر اسی گھر میں کوئی جوان موت بھی ہوئی'' گویا ان کی ایا ماں کی باتیں یونہی تو نہیں تھیں ''بی بی کیا پوچھو ہو بس ایسے جیسے اشرفیوں کی دیگ چھن چھن کر رہی ہو اور ساتھ میں ایک آواز کہ بیٹا دے دے مایا لے لے میں نے کہا تیرے منہ میں خاک بھوبل کیوں بیٹا دے دوں'' (صفحہ ۲۹)۔

ڈبائی اور ڈبائی کی امام بارگاہوں کربلاؤں سے آگے تو اجین ہے۔ ''ارے اجین۔۔۔ کہانیوں کتھاؤں والا شہر۔ راجہ بکر ماجیت۔ بیتال پچیسی سنگھاسن بتیسی۔ کیا خوب ہند یاترا ہے۔ میرا ایک قدم پراچین بھارت میں دوسرا قدم نئے ہندوستان میں ابھی اجنتا ایلورا کی گپھاؤں میں بھٹک رہا تھا اور ابھی لکھنؤ میں مسعود حسین رضوی ہال کا فیتہ کاٹ کر اس مبارک ایوان کے افتتاح کی سعادت حاصل کر رہا ہوں کل مہاتما بدھ فیم والے ہرن بن میں تھا۔ ارے اب وہ ہرن بن کہاں رہا ہے نہ بن ہے نہ ہرن ہے'' (صفحہ ۱۶۹)۔

انتظار حسین نے بڑی دلیری کے ساتھ یہ بات کہہ دی ہے کہ ان کے تحیر و تجسس کا مرکز کوئی اور ہے جہاں کتھا کہانی کا ساگر امنڈا ہوا ہے اور وہ کہانی لکھنا شروع کرتے ہیں تو وہیں سے اشارہ لیتے ہیں۔ اسی سے ملتی جلتی بات ڈاکٹر گیان چند جین نے اواخر عمر میں ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ دو ادب'' کے عنوان والی کتاب میں کہی تھی تو ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ ان کے ہاں محققین والا دوٹوک لہجہ تھا انتظار حسین کی طرح بات کہنے کا سلیقہ انہیں نہیں آتا تھا۔

ترقی پسندوں کے ایک اجتماع میں انہیں ایک نورانی داڑھی والے ایس ایس نور صاحب نظر آئے۔ انتظار صاحب نے کیا عمدہ فقرہ چست کیا ہے'' نورانی داڑھی تو مرد مسلماں کی ہوتی ہے بشرطیکہ وہ کسی ملا کی نہ ہو'' (صفحہ ۱۷۷) اور یہ ایس ایس نور صاحب تو سکھ ہیں۔

جستجو کیا ہے میں جگہ بجگہ ''چراغوں کا دھواں'' میں مذکور ہونے والے لوگ اور جگہیں مذکور ہیں۔ عسکری صاحب ہیں کافی ہاؤس ہے۔ ناصر کاظمی ہیں زاہد ڈار ہے احمد مشتاق ہے ٹی ہاؤس ہے سراج

صاحب ہیں بیدل جالندھری ہے جس کا ذکر ذکرِ مکرر کے طور پر ہوا ہے۔ قیوم نظر اور ان کی امت ہے حلقہء ارباب ذوق اور اس کے متوسلین ہیں۔ چراغ حسن حسرت ہیں احمد بشیر ہیں۔ عرب ہوٹل ہے اور اس کے کردار ہیں۔ ساتھ میں حمید نسیم کی ہانکی ہوئی ایک انوکھی بات ''ضیاء جالندھری نے سنائی کہ موصوف نے اپنے مرشد سے خفگی کے عالم میں ڈینگ ماری کہ کیا بنے پھرتے ہیں یہ ڈاکٹر اور علامہ اگر میں پیشاب کر دوں تو سوا ایسے ڈاکٹر اور علامہ پیدا ہو جائیں۔ ضیاء جالندھری نے کہا حمید نسیم تو پھر ہو جائے ایک پیشاب!'' (صفحہ ۱۰۰) جمیل جالبی بھی ہیں مگر ان کی ایک تصحیح بھی انتظار صاحب کو کرنا پڑی ہے۔ جمیل جالبی نے لکھا ہے ۴۶۔۴۷ میں عسکری صاحب نے پروفیسر احتشام حسین کے ایما پر اردو تحریک جاری کی تیاری کی رسیدیں چھپیں چندہ جمع ہوا لیکن ابھی جلسہ کا پروگرام بن رہا تھا کہ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔۔۔ ''جمیل جالبی محقق ہیں انہیں یہ شگوفہ چھوڑنے سے پہلے تھوڑی تحقیق تو کر لینی تھی تو سنئے کہ اس زمانے میں میرٹھ میں رہتے ہوئے عسکری صاحب کی احتشام صاحب سے کوئی خط و کتابت نہیں ہوئی تھی۔ قصہ کچھ اور تھا ساری کھچڑی میرے سامنے پکی تھی اور اسی کرار صاحب کے ڈیرے میں'' (صفحہ ۸۳) ''محققین غریب لکھنے والوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں'' (صفحہ ۲۰۰)

چراغوں کا دھواں کی ان پرانی ہڈیوں کے علاوہ ہمارے علامت کے مرحوم مدیر ''پاسعید'' غالباً پہلی بار مذکور ہوئے ہیں۔ ''پاسعید'' اس لئے کہ سعید صاحب نے قیوم صاحب کی شاعری پر ایک مقالہ باندھا اور حلقہ کی ایک نشست میں پڑھ کر سنایا بتا رہے تھے کہ قیوم صاحب کی نئی نظم میں کونسا وصف ایسا پایا جاتا ہے کہ ہمعصروں کی شاعری سے اسے ممتاز ٹھہراتا ہے۔ مگر اتنا کہہ پائے تھے کہ جو وصف پا۔۔۔ کہ ورق تمام ہوا بہر حال ورق الٹا اور پڑھنے لگے۔۔۔ یا جاتا ہے۔ یاروں نے اس وقفہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ فقرہ ''پا'' پر ختم ہو گیا اس پا کو انہوں نے عزیز محترم کے نام کے ساتھ جوڑ دیا یوں سعید صاحب پاسعید بن گئے'' (صفحہ ۱۰۵)۔

پاکستان کی صحافت کو آپ نے ''مرت بیائی'' کہا ہے مرت بیائی وہ مائیں کہلاتی ہیں جن کے جنے جوانی میں مر جاتے ہیں (صفحہ ۱۳۰) مگر ''اخبار کا کالم اپنی جگہ ایک صنف ہے'' (صفحہ ۱۳۷) کالم

نگاروں کو آپ نے کیا اچھی نصیحت کی ہے کہ '' کالم نگار کو بے نتھا بجار نہیں ہونا چاہئے'' (صفحہ ۱۲۵)۔ ہاں میکلیگن روڈ کے اس پان فروش سے تو ہم نے بھی ایک بار پان کھایا ہے جو پان گاہک کے ہاتھ میں نہیں دیتا تھا سیدھا اس کے منہ میں رکھتا تھا۔ منہ سے بولنے کی بھی اس نے قسم کھا رکھی تھی لگتا تھا گونگے کا گڑ کھا کر دکان میں بیٹھتا ہے۔ اس نے انتظار حسین کا کالم فریم کروا کر دکان میں ایسی جگہ لگا رکھا تھا کہ ادبدا کر اس پر نظر پڑتی تھی۔

اس کتاب کی اولیات میں ان کی گورنمنٹ کالج لاہور کی لیکچراری کے پروانے کا ذکر بھی شامل ہے ڈاکٹر نذیر احمد انہیں کالج میں لے جانا چاہتے تھے مگر تنخواہ اس قدر کم تھی کہ انہیں گوارا نہ ہوا اور زیادہ تنخواہ دینا ان کے بس سے باہر تھا۔ اسی طرح دیوان سنگھ مفتون اور مولانا حسین احمد مدنی کی خودنوشت کا ذکر بھی ان کے اجداد کے سلسلہ میں پہلی بار آیا ہے۔ (صفحہ ۵۸)

ہندستان میں ایک صاحب نے ان سے ابن صفی کے فکشن کے بارے میں پوچھ لیا۔ آپ نے صاف کہہ دیا کہ '' میں ابنِ صفی کے معاملہ میں کورا ہوں ان کے فکشن سے قطعی نابلد۔ وہ حیران ہوئے دل میں میری جہالت پر خندہ زن ہوئے ہوں گے'' (صفحہ ۱۷۴)۔ ہمارے ہاں جاسوسی ناولوں کی روایت خاصی پرانی روایت ہے، ہم نے بچپن سے تیرتھ رام فیروز پوری کا نام سن رکھا تھا ریسرچ کے زمانے میں انہیں پڑھا بھی مگر طبیعت جاسوسی ادب پر ٹھکی نہیں ہم بھی انتظار صاحب کی طرح ابن صفی کے فن سے نابلد ہیں بلکہ نابلد محض! مگر اب ابنِ صفی پر تحقیقی کام ہو رہا ہے اور ہندوستان میں ان کے احوال و آثار پر کتابیں چھپ رہی ہیں۔ پاکستان میں اپنے راشد اشرف صاحب نے ان پر بڑا وقیع کام کیا ہے۔

انتظار صاحب کا کہنا ہے '' میں نے دوستوں کو کہتے سنا کہ بنگلہ دیشی مل جاتے ہیں تو ہم سے کھچے کھچے رہتے ہیں''

(صفحہ ۱۴۳) انتظار صاحب کا تجربہ اس کے برعکس ہے مگر ہم بھی انہیں بتائے دیتے ہیں کہ سویڈن میں ہمارے اڑوس پڑوس میں بے شمار بنگلہ دیشی مہاجر کنبے آباد تھے۔ انہیں جب معلوم ہوتا کہ ہم پاکستانی ہیں تو وہ منہ پھیر لیتے کیونکہ کسی کا بیٹا یا بھائی جنگ کی بھینٹ چڑھا تھا کسی کی بیٹی یا ماں

ہوس و بربریت کا شکار بنی تھی۔ سوائے ایک آدھ خاندان کے باقی سب براہ راست متاثرین میں تھے۔ ایسے میں اگر وہ نفرت کا اظہار نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ہم بھی فیض صاحب کی طرح یہی سوچا کرتے تھے خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد؟ بارے اپنی یونیورسٹی میں کچھ طلبہ و طالبات سے ہمارا رابطہ استوار ہوا تو پاکستانیوں سے ان کا خوف کم ہوا اور چہروں سے نفرت کا غبار دور ہوا۔ بعد کو جب تسلیمہ نسرین سویڈن آ گئیں تو ان سے یاد اللہ رہی۔ یہ بے چاری تو ملاؤں کے تعصب کی ماری ہوئی تھیں۔ مذہب کے نام پر خون سے بدکنے والی۔

اولیات میں ذکر ہونا چاہئیے تھا کہ مادھوری ڈکشت بھی کتاب میں دو بار در آئی ہے مگر اس کا احوال تو انتظار صاحب نے ایم ایف حسین کے لئے چھوڑ دیا ہے (صفحہ ۲۱۱ مکرر صفحہ ۲۲۷)

غرض انتظار صاحب کی جستجو کیا ہے ان کی پہلی خودنوشت کا تتمہ ہے اور دونوں کتابیں یکجا ہو کر ان کی مکمل سوانح عمری بنتی ہیں۔ ان کی خودنوشت ان کے اوپر بننے والی '' ڈاکومنٹری کی طرح ان کا سفر شوق ہے۔ کربلا سے کربلا تک'' (صفحہ ۲۰۹) ہے۔ ان کی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ '' اصل میں پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے علماء فضلاء نقاد محققین مترجمین اپنی ٹھیک پر بیٹھے کتنے بھاری بھرکم نظر آتے ہیں مگر جب اپنی ٹھیک چھوڑ کر شعر و افسانے کی اقلیم میں قدم رکھتے ہیں تو اچانک ان کا پلہ سبک ہوتا نظر آتا ہے۔۔۔ عزت اسی میں ہے کہ جس چراگاہ کے جانور ہو وہیں جتنا چر چگ سکتے ہو چر چگ لو جو چراگاہ تمہاری نہیں ہے اسے ندیدی نظروں سے مت دیکھو۔۔۔ یہ سب ٹھاٹھ اپنے کھونٹے تک ہیں اپنا کھونٹا چھوڑ دو گے تو جانے کیا کیا چھوڑنا پڑ جائے'' (صفحہ ۲۱۳)۔

ہم بھی اپنا تبصرہ اسی حرف محرمانہ پر ختم کرتے ہیں۔

دانی کی کہانی دانی کی زبانی

مشہور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی کی خودنوشت ''دانی کی کہانی۔ دانی کی زبانی'' ۲۰۱۱ میں سنگ میل لاہور والوں کی جانب سے چھپی ہے۔ کتاب کا چرچا ہوا تو ہمارے ذہن میں اپنے مرزا فرحت اللہ بیگ والے دانی صاحب آئے۔ دل بلیوں اچھلنے لگا کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی خودنوشت پڑھی تھی اب ''میاں دانی'' کی خودنوشت بھی آ گئی ہے مولوی نذیر احمد دہلوی کے ایک اور نامور شاگرد کا احوال اور ان کی عربی تعلیم کا نتیجہ بھی پڑھنے میں آئے گا مگر کتاب آئی تو وہ دلی کے نہیں کشمیر کے ایسے سپوت کی تھی جس نے بسنہ میں پرورش اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ عربی کی بجائے سنسکرت کا علم حاصل کیا تھا اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایم اے کے امتحان میں اول رہے تھے۔ ہندو طلبا کے ہاسٹل میں ہندو بن کر رہ رہے تھے۔ حصول علم کی جو لو انہیں لگی ہوئی تھی اس نے انہیں بہت حوصلہ دیا اور یہ اپنے ہندو ساتھیوں کی عصبیت کے سلوک سے بددل ہو کر رستہ ہی میں اپنا سفر قطع کر کے نہیں بیٹھ گئے۔ ہندو ہوسٹل میں یہ تک بھی برداشت کیا کہ ''جب کبھی کھانے کے لئے اپنی پلیٹ لے کر جاتا ہاتھ کانپتا ڈر لگا رہتا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ جب سب کھانا کھا چکے ہوتے تو میں چپکے سے جاتا میس کے باہر کھڑا رہتا اور بچا کھچا کھانا مجھے دیا جاتا اسی میں ہی اطمینان کرتا تھا آخر پیٹ بھرنا تھا'' (دانی کی کہانی دانی کی زبانی صفحہ ۸۱) آخر یہ محنت رنگ لائی اور احمد حسن دانی ہندو تہذیب و تاریخ کے ماہر بن گئے سنسکرت ان کے کام آئی مہابھارت کے مطالعہ اور تاریخ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور زندگی میں آپ نے ایسا مقام حاصل کیا جو منفرد تھا۔

دانی صاحب ماہر آثاریات ہیں اس لئے ان کی پونے دو سو صفحے کی خودنوشت کے پہلے تیس

صفحے تو کشمیر اور کشمیریوں کی تاریخ و آثار پر مشتمل ہیں کچھ اپنے خاندان کا ذکر اذکار ہے جس کا ایک حصہ ہجرت کر کے رائے پور کے قریب ایک قصبہ بسنہ میں جا بسا تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے ''اپنی کشمیر کی روایات کو فراموش نہیں کیا اس ماحول میں بھی تالاب کے کنول کے پھول کی طرح اپنے آپ کو الگ سمجھتے رہے'' (صفحہ ۵۴) ڈاکٹر صاحب کے ماں باپ اسی زمین میں دفن ہیں ہجرت کر کے پاکستان نہیں آئے گو پاکستان آتے جاتے رہے مگر اپنا وطن ان لوگوں نے نہیں چھوڑا۔ ابا کی سخت گیری کا ذکر تو ہے کہ وہ انہیں زیادہ تعلیم دلانے کے حق میں نہیں تھے مگر یہ بات کتاب کے بالکل اواخر میں مذکور ہوئی ہے کہ ان کے ابا نے بیٹے کی طرف داری کرنے کے جرم میں ان کی اماں کے سر پر ایسی ضرب لگائی تھی کہ وہ بچاری عمر بھر کے لئے سماعت سے محروم ہو گئی تھیں۔ (صفحہ ۱۶۵) باپ کی ایسی طبیعت کے باوجود دانی صاحب نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور حیلوں بہانوں سے خرچ حاصل کرتے رہے۔ ماں کی آشیرواد شامل نہ ہوتی تو شاید ان کی تعلیم ادھوری رہ جاتی۔ ہاں ایک اور آشیرواد کا ذکر بھی اس خود نوشت میں ہے وہ ہے ہندوؤں کے ''سرسید'' پنڈت مدن موہن مالویہ سے ان کی ملاقات جو غالباً ۱۹۴۴ میں ہوئی۔ ''ڈاکٹر آلیتکر (ان کے استاد) مجھے اپنے ساتھ پنڈت مدن موہن مالویہ، جو یونیورسٹی کے بانی تھے اور اب بہت علیل تھے ان کے گھر لے گئے۔ وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے ان سے میری بڑی تعریف کی میں آگے بڑھا اور ان کی چارپائی پر ماتھا ٹیک دیا اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر انہوں نے مجھے اشیرواد دیا اور آگے تحقیق کرنے کی ہمت افزائی کی۔ شکریہ ادا کر کے بڑے ادب سے میں خوش خوش واپس آیا۔ ان کے نورانی چہرے سے میں بہت متاثر ہوا مجھے وہ ہندو تہذیب کا جیتا جاگتا مجسمہ معلوم ہوئے۔ اور یہ جھلک میں کبھی نہیں بھولا۔'' (صفحہ ۹۲) پنڈت مدن موہن مالویہ کی داڑھی تو اپنے زمانے میں ضرب المثل داڑھی تھی۔ سرسید نے جب اپنے گلھڑ کو چھپانے کے لئے یہ لمبی داڑھی بڑھائی تو اکبر نے یونہی تو نہیں کہا تھا ''اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''۔ یہ مولوی مدن یہی نورانی داڑھی والے پنڈت مدن موہن مالویہ تھے۔ جملہ معترضہ ہے مگر کہہ دیں کہ جب ہم جاپان کی اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر مقرر ہو کر گئے تو ہمارے ہندی کے رفیق کار ڈاکٹر لکشمی دھر مالویہ تھے پنڈت مدن موہن مالویہ

کے بیٹے۔آپ نے بھی داڑھی رکھی ہوئی تھی مگر اس میں وہ ''نور'' نہیں تھا شاید اس لئے کہ ڈاکٹر لکشمی دھر مالویہ نے اپنے دھرم کا اپمان کرتے ہوئے سات سمندر پار کا سفر اختیار کر لیا تھا؟ اور مزید یہ کہ اپنی ہندو دھرم پتنی کو چھوڑ کر ایک جاپانی لڑکی سے بیاہ رچا لیا تھا؟ پنڈت مدن موہن مالویہ کا خون جاپان میں موجود ہے۔ان کا پوتا امیتابھ مالویہ اور پوتی تارا مالویہ زندہ ہیں اور اپنے دادا کی طرح شدھ ہندی بولتے ہیں۔اگرچہ ان کے ابا لکشمی دھر مالویہ ایسی صاف ستھری اردو بولتے تھے کہ ہم جیسوں کو ان کے لہجہ پر رشک آتا تھا۔آخر الہٰ آباد کے رہنے والے تھے۔

دانی صاحب نے انگلستان سے پی ایچ ڈی کی۔آگرہ میں محکمہ آثار قدیمہ کی ملازمت کے دوران انہیں جنرل ڈیگال کو تاج محل دکھانے کا موقعہ ملا۔آثار قدیمہ کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں جاتے رہے۔راجشاہی ڈھاکہ اور پشاور یونیورسٹی میں پڑھایا۔موہنجوڈرو کی کھدائی میں مصروف رہے۔سب سے زیادہ کام انہیں پشاور یونیورسٹی کے قیام کے دوران کرنے کا موقعہ ملا کیونکہ اس علاقہ میں پرانی تہذیب بکھری پڑی تھی اور ہے۔وہاں سے اسلام آباد یونیورسٹی میں آگئے وہیں سے سبک دوش ہوئے اگرچہ اب بھی پروفیسر ایمریٹس کے عہدے پر ہیں اور ریسرچ کا کام کرواتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر دانی اپنے موضوع سے اتنے وابستہ ہیں کہ آثار قدیمہ یا تہذیب پر تقریر کرنے کھڑے ہوں تو ادھر ادھر نہیں دیکھتے کتاب میں بھی ایک تقریر کا ذکر کیا ہے اور تین صفحے میں پوری پوری تقریر درج کر دی ہے(صفحہ ۹۵ تا ۹۸)

مگر جہاں تہاں سیاست پر بھی خیال آرائی فرماتے ہیں حالانکہ یہ ان کا موضوع نہیں اور ان کی باتیں مبتدیانہ لگتی ہیں۔کشمیر کے مسئلہ پر اظہار خیال فرماتے ہوئے فرماتے ہیں ''کشمیر کا مسئلہ حل کیوں نہیں ہوا اور بھارت کو اس کی جرات کیسے ہوئی کہ وہ کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ سمجھنے کے قابل بن گیا یہ ایک طویل داستان ہے جس میں خود پاکستان کی اپنی بین الاقوامی حکمت عملی کی ناکامیابی بھی شامل ہے۔میرے خیال میں ہمارے وزیر خارجہ مشہور قانون دان رہے ہیں لیکن خارجہ حکمت عملی کے میدان میں بہت کم کامیاب رہے ہیں۔قانونی فتح اور خارجہ حکمت عملی دو متضاد چیزیں ہیں کشمیر بھارت اور

پاکستان کے اسی تنازع کا شکار رہا ہے اور کشمیری عوام ابھی تک اپنی آزادی کی جدوجہد میں مصروف عمل ہیں'' (صفحہ ۱۵۰) خدا معلوم دانی صاحب کو خارجہ حکمت عملی کی ناکامی پر اظہار خیال کرنے کا خیال کیوں آگیا؟ شاید اس لئے کہ ان کا کشمیر کی ملازمت میں جانے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ان کا قول فیصل ہے کہ ''قانونی فتح اور خارجہ حکمت عملی دو متضاد چیزیں ہیں''۔قبلہ اگر بین الاقوامی طور پر آپ کے کیس کا کوئی قانونی جواز موجود نہیں تو آپ محض خارجہ حکمت عملی سے اسے کیسے حاصل کر پائیں گے؟ آپ کے وزیر خارجہ نے تو قانونی جواز دنیا سے منوا لیا اور آپ کے وطن کشمیر کے تقسیم ہند کے وقت کے وزیر اعظم جسٹس مہر چند مہاجن تک اپنی خودنوشت Looking Back میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کشمیر کے کیس کو پاکستان کے وزیر خارجہ نے بے پناہ قانونی مہارت سے پیش کیا اور بین الاقوامی حلقوں میں ہندوستان کو جارح بنا کر رکھ دیا آگے کشمیر میں جو الجھن پیدا ہوئی وہ ہندوستان کی ہٹ دھرمی کی پیدا کی ہوئی ہے۔کیا دانی صاحب کا خیال ہے کہ خارجہ حکمت عملی ہٹ دھرمی کا دوسرا نام ہے؟ اے کاش دانی صاحب اپنے دائرہ کار میں رہتے تو ان کی باتوں میں ماہر عتیقیات ہونے کی حیثیت سے جو وزن ہے وہ قائم رہتا اور کسی کو ان کی سیاسی بصیرت پر انگلی اٹھانے کا موقعہ نہ ملتا۔

ہم نے انہی دنوں جناب انتظار حسین کی خودنوشت جستجو کیا ہے پڑھی ہے اس کا اختتام انتظار صاحب نے خوب کیا ہے ''اصل میں پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے علماء فضلاء نقاد محققین مترجمین اپنی ٹھیک پر بیٹھے کتنے بھاری بھرکم نظر آتے ہیں مگر جب اپنی ٹھیک چھوڑ کر۔۔۔(کسی دوسری) اقلیم میں قدم رکھتے ہیں تو اچانک ان کا پلہ سبک ہوتا نظر آتا ہے۔۔۔عزت اسی میں ہے کہ جس چراگاہ کے جانور ہو وہیں جتنا چر چگ سکتے ہو چر چگ لو جو چراگاہ تمہاری نہیں ہے اسے ندیدی نظروں سے مت دیکھو۔۔۔یہ سب ٹھاٹھ اپنے کھونٹے تک ہیں اپنا کھونٹا چھوڑ دو گے تو جانے کیا کیا چھوڑنا پڑ جائے'' (صفحہ ۲۱۳)۔

❁

ریڈیو کے دن

بی بی سی کے براڈ کاسٹر رضا علی عابدی کی جزوی خودنوشت ''ریڈیو کے دن'' سنگ میل لاہور والوں کی جانب سے ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ عابدی صاحب کی ابتدائی زندگی اخباری صحافت میں بسر ہوئی اس لئے آپ نے صحافت میں جو راتیں کالی کیں ان کی روداد ''اخبار کی راتیں'' کے عنوان سے لکھنے کا کام کسی اور وقت پر اٹھا رکھا ہے (ریڈیو کے دن صفحہ ۹)۔ رضا علی عابدی کی اس جزوی خود نوشت میں بھی ریڈیو والوں کی روایتی ''پادر ہوا باتیں'' شامل ہیں کیونکہ ریڈیو والے بقول شخصے عمر بھر On Air ہی رہتے ہیں''۔ اگر ہم نے ریڈیو والوں سے سامعین کے خطوط کی حقیقت نہ سن رکھی ہوتی تو ان کی باتوں کو باور کرنا ہمارے لئے آسان ہوتا۔

اتفاق یوں ہے کہ ریڈیو کے حمید نسیم کی ناممکن کی جستجو، ذوالفقار علی بخاری کی سرگزشت، اخلاق احمد دہلوی کی تین خودنوشتیں یادوں کا سفر، میرا بیان اور پھر وہی بیاں اپنا ہماری نظر سے گذر چکی ہیں۔ اور تو اور ریڈیو کو ''پری خانہ'' بنا دینے والے جمیل زبیری صاحب کی خودنوشت بھی ہم دیکھ چکے ہیں اور ریڈیو کی حقیقت جان چکے ہیں تس پر اگر رضا علی عابدی صاحب کو اپنی بی بی سی کے سامعین کے خطوط کے توثق پر اتنا اصرار ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔ ہاں مولانا امتیاز علی عرشی اور مرزا ظفر الحسن کے خط پر ہمیں کوئی شبہ نہیں کیونکہ غالب کا نام درمیان میں ہے۔ اور ہو سکتا ہے جناب آل احمد سرور نے بھی ایک آدھ خط لکھا ہو مگر باقی سامعین ان کی اپنی شکل وصورت کی طرح یقیناً ''اللہ میاں کے بنائے ہوئے ہیں اور اس پر انہیں صبر کرنا چاہیے'' (صفحہ ۲۰) ان کا سلسلہ تو عابدی صاحب نے کمرشانی کی استانیوں تک پہنچا دیا ہے جہاں پردہ داری کا یہ عالم ہے کہ اگر ٹی وی پر

کوئی مرد آجائے تو عورتیں کمروں سے باہر چلی جاتی ہیں۔ (صفحہ ۱۳۰) وہاں کی استانیاں انہیں خط لکھا کرتی تھیں اور آپ انہیں ملنے کو سکول تک پہنچ گئے تھے۔

بی بی سی کی غیر جانب داری اور حق گوئی تو ۱۹۶۵ کی پاک بھارت جنگ میں واضح ہو گئی تھی جب بی بی سی، جی ہاں بی بی سی، نے لاہور کے فتح ہو جانے کی خبر نشر کر دی تھی۔ پھر بھٹو صاحب کے پھانسی پا جانے کے وقت ان کے مارک ٹلی صاحب پنڈی جیل کی دیوار سے کان لگائے کھڑے تھے (صفحہ ۱۳) مگر قبلہ پہلی خبر تو بی بی سی نے نہیں آل انڈیا ریڈیو نے نشر کی تھی۔ آپ کا ارشاد ہے کہ ''بی بی سی نے طلوع سحر سے پہلے ہی دنیا کو خبر سنا دی'' درست مگر آپ کے طلوع سحر اور پاکستان بھارت کے طلوع سحر میں کتنے گھنٹوں کا فرق ہے؟ ریڈیو والے تو دون کی لینے کے عادی ہوتے ہیں اس کا کیا کیا جائے؟ عابدی صاحب نے تو بی بی سی کا نمک کھایا ہے اس لئے انہیں ایسا ہی کہنا چاہیئے۔

ہمیں ان کے عالمانہ پروگراموں کی افادیت سے کوئی انکار نہیں۔ انگلستان کی لائبریریوں پر ذاتی کتب خانوں پر پھر ہندوپاکستان میں موجود نایاب کتب پر ان کے پروگرام یقیناً قابلِ ستائش ہیں اور ہمیں ان کی داد دینے میں کوئی بخل نہیں۔ ہمیں حیدرآباد کے ایک مکینک عبدالصمد خاں صاحب کے کتب خانے کا جان کر بہت خوشی ہوئی (صفحہ ۸۴) کتب خانے ایسے ہی ذوق شوق سے بنتے ہیں اس میں کسی کی ذات یا پیشہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ قیس ہو کوہکن ہو یا حالی۔ عاشق کچھ کسی کی ذات نہیں۔ پٹنہ کی خدابخش لائبریری کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ حال ہی میں ہمیں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر اقبال حسین کی خودنوشت پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جناب خدابخش خاں کا تعلق سبزی اگانے والے قبیلہ سے تھا جب وہ حیدرآباد دکن میں چیف جسٹس بنائے گئے تو پرفیسر عبدالغفور شہباز نے ان کی مدح میں ایک خمسہ ''خمسہ ء چقندری'' کے نام سے تصنیف فرمایا تھا جس کا عنوان تھا ''انسانی سرسبزی پر نباتاتی دنیا میں فطرتی شادمانی'' اس کا پہلا بند یوں ہے:

''نہ ہو حیدرآباد کیوں شادماں۔ کہ سرسبزیء عدل کا ہے سماں۔

ہے فالیز میں خوش دلی کا سماں۔ ملی خربزے کو چھری سے اماں۔

ہوئے چیف جسٹس خدا بخش خاں'' (داستاں میری۔ خودنوشت ڈاکٹر اقبال حسین۔ صفحہ ۸۴)

پھر ڈاکٹر اقبال حسین صاحب نے اپنی نانی اماں محترمہ رشیدۃ النساء (خواہر نواب امداد امام اثر کے حوالہ سے) یہ بھی رقم فرمایا تھا کہ اس لائبریری کی اکثر و بیشتر کتب چوری کر کے منگائی جاتی تھیں۔خود خدا بخش خاں صاحب کا قول ہے کہ ''کتابوں کے جمع کرنے کا ہنر تعزیرات ہند کے قانون سے بالاتر ہو جاتا ہے اور اس کو للکارتا ہے''۔(داستاں میری صفحہ ۷۲) مگر شہباز صاحب کی تمامتر تعریض و تجسس کے باوجود خدا بخش خاں کی اورینٹل لائبریری دنیا بھر میں مشہور ہے اور اہلِ علم اس سے استفادہ کرتے اور انہیں دعائیں دیتے ہیں۔اور برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کی تمامتر کتب بھی تو ہمارے آباء ہی کی کتابیں ہیں کہ دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ! بی بی سی شکریہ کی مستحق ہے کہ ایسے کاموں کے لئے فنڈز اور لوگ مہیا کرتی رہی۔

شیر دریا والا پروگرام بھی خوب معلومات افزا ہے جو ہمیں ڈیرہ غازی خان کی ہماچی یا ہماچے سے متعارف کرواتا ہے۔ہماچا بڑے سارے پلنگ کو کہتے ہیں جس پر بہت سے لوگ بیٹھ یا سو سکتے ہیں۔(صفحہ ۱۳۴) معلوم دیتا ہے ہمارے یوسفی صاحب کو اس ہماچے (ہمہ چہ؟) سے آگاہی نہیں تھی ورنہ وہ انگریزوں کو چارپائی کے عدم استعمال اور اس کی ''ادوان کسنے سے جی چرانے کا طعنہ نہ دیتے''۔ہماچے کی ادوان کسنا بھی کارے دارد ہوگا۔

مگر ان کا جرنیلی سڑک والا پروگرام زیادہ مقبول ہوا۔اس پر الطاف گوہر صاحب کا تبصرہ معنیٰ خیز ہے انتظار صاحب نے تو اس سفر کے حوالہ سے ان پر دو کالم باندھے ہیں۔حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اپنے پروگرام شاہین کلب کی آپ نے بہت ہوا باندھی ہے اور سدھو بھائی کی فنکارانہ چابک دستیوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے مگر جو پروگرام آپ نے نمونہ کے طور درج فرمائے ہیں وہ تو ہمارے عام بلکہ سادہ سے مزاح کے معیار پر بھی پورے نہیں اترتے (صفحات ۶۱۔۶۲ یا صفحات ۶۵۔۶۶)۔ہمیں تو ان کو پڑھ کر کسی غیر معمولی بات کا احساس نہیں ہوا۔ان کو سننے والے کیا تاثر قبول کرتے ہوں گے؟ ہاں عابدی صاحب بزعم خود ان کو اعلیٰ سمجھتے ہیں تو یہ ان کا اپنا ذوق سلیم ہے۔

عابدی صاحب ہاوڑا ایکسپریس میں سوار ہونے کو امرتسر سٹیشن پر ہیں۔پلیٹ فارم پر تل دھرنے کی جگہ نہیں پلیٹ فارم پر ایک پولیس کاؤنٹر ہے جو خالی ہے وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔عابدی صاحب

کچھ دیر ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد وہاں واپس پہنچے تو دیکھا کاؤنٹر خالی ہے تو لپک کر اس پر بیٹھ گئے۔ایک پولیس والا آ گیا اس نے پوچھا ''کاؤنٹر پر کیوں بیٹھے ہو؟ میں نے کہا'' کاؤنٹر پر آپ کی پولیس کے جس عملے کو بیٹھنا تھا وہ غائب ہے کاؤنٹر خالی پڑا ہے اس لئے تھکے ہارے مسافر اس پر بیٹھے ہیں۔'' ایسے موقعوں پر فلمی پولیس افسر جس طرح آنکھیں نکال کر کہتا ہے کیا؟ اس افسر نے بھی بالکل اسی طرح کہا''کیا''،اور اپنی پیٹی سے ہتھکڑی کھولنے لگا''(صفحہ ۱۶۳) عابدی صاحب ترت بھاگ لئے ان کی حق گوئی دھری گئی۔یہاں عابدی صاحب نے ایک فقرہ لکھا ہے جو ان کے اندر چھپے ہوئے کسی متعصب شخص کی نشان دہی کرتا ہے''صاحبو ہندوستان کے اس علاقہ میں الہام کے قصے بہت سنے ہیں۔اس وقت میرے کان میں بھی کسی نے کہا'' جابر حاکم کے آگے کلمہء حق کہنے والے اپنا تھیلا اٹھا اور بھاگ''(صفحہ ایضاً) امرتسر میں یہ فقرہ کہنے کی وجہ یوں ہے کہ انہیں پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی دکھائی دی تھی جو قادیان جا رہی تھی اور اس میں لوگ آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔قادیان کا نام سنتے ہی ان کے اندر کا آدمی باہر نکل آیا اور بلا جواز بلا ضرورت ایک ایسا فقرہ لکھ دیا جو انہیں نہیں لکھنا چاہیئے تھا اور یہ نہ سوچا کہ ایسا فقرہ ان کے سامعین میں کسی کی دل آزاری کا باعث بن سکتا ہے۔اے کاش عابدی صاحب اپنی اس نصیحت پر خود بھی عمل کرتے جو آپ نے اپنے سامعین کو مذہبی رواداری اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمائی تھی کہ ''اپنے وحشی کو اپنے اندر بند کر لیں''(صفحہ ۱۹)۔

دیکھئے ان کی اخبار کی راتیں کب چھپتی ہے۔

❁

آپ بیتی

۱۹۲۴ یعنی بالشویک روس کے ابتدائی زمانہ میں روس اور بخارا میں اسلام کی تبلیغ وترسیل کے مقصد کے حصول کی خاطر اس خطہء زمین میں جانے اور وہاں جبر واستبداد واسارت واذیت کا شکار ہونے والے ایک پرجوش نوجوان ظہور حسین کی خودنوشت ''آپ بیتی'' کے نام سے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں چھپی تھی۔ مدت مدید کے بعد ان کے صاحبزادے الحاج کریم ظفر ملک نے اپنے والد کی عزیمت اور پامردی کی یہ پردرد داستان اہتمام کے ساتھ مکرر شائع کی۔ اس وقت میرے سامنے اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن ہے جو ۲۰۰۹ میں قادیان بھارت سے چھپا ہے۔

یہ نوجوان ظہور حسین اپنے امام کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایران کے راستے روس اور بخارا کے تبلیغی سفر پر روانہ ہؤا۔ اس زمانہ میں روس تک رسائی حاصل کرنا کارے دارد تھا اس لئے اس نوجوان نے ایران کے راستے روس میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا اور داخل ہو گیا اس کے سامنے کوئی دنیاوی مقصد نہیں تھا دینی غرض تھی کہ اس سرزمین میں جو اسلام کی سرزمین سمجھی جاتی ہے اسلام کے پرچم کو سربلند رکھنے کی کوئی سبیل کی جائے۔

یہ ظہور حسین جو بعد کو جماعت احمدیہ کے حلقوں میں مجاہد بخارا اور روس کے نام سے موسوم ہوئے ۸ دسمبر ۱۹۲۴ کو مشہد کے راستے ترکستان یعنی روس کی سرحد میں داخل ہوئے۔ ہندوستان سے یہ تین افراد کا قافلہ تھا اس قافلہ نے دزداب (موجودہ زاہدان) سے مشہد تک چھ سو میل کا فاصلہ ۴۵ دن میں کچھ پاپیادہ اور کچھ اونٹوں گدھوں پر سوار ہو کر طے کیا۔ پھر ان کے ایک ساتھی تو ایران میں ٹھہر گئے دوسرے بخارا پہنچ گئے مگر یہ اپنی علالت کی باعث مشہد میں رکے رہے خیال تھا شاید ایران سے انہیں

پاسپورٹ وغیرہ مل جائے گا مگر کوئی پاسپورٹ یا ویزا نہ ملا تو آپ نے توکل بخدا سرحد پار کر کے روس کی سرزمین میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا اور ایک ترک ساتھی کے ہمراہ ارتھک کے ریلوے سٹیشن تک پہنچ گئے مگر بخارا کی گاڑی میں سوار ہونے سے قبل روسی حکام کے ہتھے چڑھ گئے اور تقریباً بائیس ماہ تک اذیت واسارت کا شکار رہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھیجنے والے اور ان کے قرابت داران کی بائیس ماہ کی گمشدگی کی وجہ سے کیسی کیسی اذیت سے دوچار نہ ہوئے ہوں گے۔ روسیوں کو بغیر ویزا اپنے ملک میں داخل ہونے والے پر انگریزوں کا جاسوس ہونے کا شبہ تھا اور وہ ان سے یہی کہلوانے یا اگلوانے کی کوشش کرتے رہے کہ یہ انگریزوں کا جاسوس ہے آخر ایک ایسے شخص کو جو عربی کا فاضل ہے اور پڑھا لکھا نوجوان ہے اجنبی اور پراسرار سرزمین میں یوں اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہونے کی کیا پڑی ہے؟ یہ آپ بیتی گویا بائیس ماہ کے بیجا تشدد اور ایذارسانی کی داستان ہے جو اس نوجوان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔

اس اسارت کا ایک مثبت پہلو یہ ہؤا کہ اس نوجوان نے اپنے توکل اور ایثار سے اپنے صاحبانِ سجن میں سے بعض کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور انہیں اسلام کے نور سے منور کر دیا گویا قید وبند کی مصیبتیں بھی اسے اس کے مقصد سے منحرف نہ کر سکیں۔ یہ آپ بیتی تمام تر زندان بیتی ہے۔ اشک آباد، تاشقند، ماسکو کے قید خانوں میں انہیں رکھا گیا اور بائیس ماہ تک اذیت دی گئی۔ سوال وجواب اور پوچھ گچھ جاری رہی۔ ماسکو کی پوچھ گچھ کے ایک سیشن کی روداد چشم کشا ہے۔ ''مجھ سے پہلا ہی سوال کیا گیا کیا خدا ہے؟ ۔۔۔ سامنے کی دیوار پر لینن کی تصویر لگی تھی جس نے زار کے زوال کے بعد کہا تھا خدا کوئی نہیں ہے۔ مگر ہم سب دوست ہیں۔'' میں نے کہا میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ خدا یقیناً ہے ۔ اور لینن کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس شخص نے بہت برا کہا ہے کہ خدا کوئی نہیں۔ اس پر افسر نے کہا تم جانتے بھی ہو یہ کون ہے؟ میں نے کہا یہ آپ کے ملک کا بہت بڑا شخص ہے اس لئے میں بھی اس کی عزت کرتا ہوں مگر خدا کوئی نہیں تو ہمیں دوستی کی لڑی میں کس نے پرویا ہے؟'' (صفحہ ۱۷۵۔۱۷۶)۔ بالشویک روس میں لینن کے بارے میں ایسی بات برملا اور علی رؤس الاشہاد کہہ دینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ مگر ایسی بات سے ہی انہیں یقین ہؤا کہ یہ کوئی جاسوس نہیں محض سرپھرا

مشنری ہے جو اپنے عقیدے کی تبلیغ کی خاطر ہر طرح کی اذیت جھیل جانے کو تیار ہے۔ انہوں نے انہیں ملک بدر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ادھر ان کی جماعت اپنے ذرائع سے ماسکو پر سفارتی دباؤ ڈلوا رہی تھی کہ ہمارا ایک مشنری لاپتہ ہے اور قرائن سے معلوم دیتا ہے کہ وہ روسیوں کی قید میں ہے۔ اچانک ان کو بتایا گیا اور انہیں باکو سے ایران کی بندرگاہ ہنزالی (انزلی۔ جواب بندر خمینی کے نام سے موسوم ہے) لا کر چھوڑ دیا گیا اور ایک سرٹیفکیٹ انہیں دیا گیا کہ یہ مشنری ہے عربی فاضل ہے ایران میں داخل ہو تو اسے اس کے مرکز بھیج دیا جائے۔ (صفحہ ۱۸۵) اس طرح یہ نوجوان روسیوں کی قید سے رہا ہوا مگر بائیس ماہ کی اذیت کی وجہ سے اس کے ہوش و حواس بجا نہ تھے ذہن پراگندہ تھا۔ آخر ایرانیوں نے انہیں اپنی سفارت کے ذریعہ ہندوستان بھیج دیا جہاں سے یہ واپس اپنے مرکز پہنچے۔

ہم نے قیام پاکستان کے بعد انہیں دیکھا اور ان سے ملے ان کی باتیں سنیں روسی قید خانوں میں اذیت کے واقعات ان کی زبانی سنے۔ ان کی پیٹھ پر اور پیٹ پر اذیت کے نشانات مدت العمر موجود رہے۔ دعا گو بزرگ تھے ان کی طبیعت میں ایسی عاجزی اور رقت تھی کہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہی ان کی آواز بھرا جاتی اور نہایت خشوع و خضوع سے دعا کرتے۔ ان کا ایک بیٹا ہمارا کلاس فیلو تھا دو بیٹے ہمارے شاگرد ہوئے انہی میں سے عزیزم الحاج کریم ظفر نے اپنے ابا کی یہ خودنوشت چھپوائی ہے اللہ تعالیٰ ان کی سعیٔ جمیل کو قبول کرے۔

اپنے مقصد کی خاطر قربانیاں دینے والوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جاتیں۔ اب مجاہد بخارا و روس ظہور حسین تو ہمارے درمیان موجود نہیں ان کی لکھی ہوئی خونچکاں داستان موجود ہے جو پانچویں بار چھپی ہے۔

آزادی کی تلاش

معروف مجاہد آزادی میاں اکبر شاہ کی خودنوشت ''آزادی کی تلاش'' قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت اسلام آباد نے ۱۹۸۹ میں شائع کی۔ میاں اکبر شاہ کی اصل خودنوشت پشتو میں قلمبند کی گئی تھی جسے سید وقار علی شاہ کاکا خیل نے بڑی چابک دستی سے اردو میں منتقل کیا اور اس پر ایک بسیط تعارفیہ بھی لکھا۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سالوں میں ہندوستان سے بے شمار لوگ ہجرت کر کے افغانستان گئے ان میں سے اکثر روس ترکی اور ایران تک گئے۔ کئی حضرات نے اپنے سفرنامے لکھے ظفر حسن ایبک کی تین جلدوں پر مشتمل آپ بیتی کے علاوہ فیض محمد خاں کی ہجرت افغانستان اور عبدالاکبر خاں کا سفرنامہ، روس و ترکستان کافی شہرت رکھتے ہیں'' (دیباچہ آزادی کی تلاش)۔ ظفر حسن ایبک کی خودنوشت ''خاطرات'' سنگ میل لاہور نے ۱۹۹۰ میں شائع کی تھی۔ ایک صاحب ترکی کے خلیفۃ المسلمین کے اعلان جہاد پر جہاد کی خاطر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ میاں اکبر شاہ اپنے وطن کی آزادی کی خاطر آزاد مسلمان ریاست افغانستان سے استمداد کے لئے مہاجر ہوئے اور در بہ در کی خاک چھانتے پھرے۔ جب افغانستان اور انگریزوں میں معاہدہ ہو گیا تو مایوس ہوئے اور روس کی جانب رخ کر لیا اور ہرج مرج کھینچتے روسی ترکستان پہنچ گئے جہاں ایک نئی اذیت ناک زندگی ان کی منتظر تھی مگر جذبہ سچا تھا۔ ماسکو پہنچے تو روسیوں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ایم این رائے جیسے کمیونسٹوں سے ان کا رابطہ ہو گیا اور انہیں آزادی کی خاطر جنگ کرنے کے لئے تیار کر کے واپس ہندوستان بھیج دیا گیا۔ جہاں پہنچتے ہی انگریزوں کے ہتھے چڑھ گئے اور قید خانے میں ہی یہ داستان پشتو میں رقم کی۔ اس کتاب کو آپ نے آزادی کے گمنام شہیدوں کے نام

معنون کیا ہے۔ ابھی انہی دنوں ہم نے تبلیغ اسلام کے مقصد کی خاطر روس و بخارا جانے والے ایک مجاہد کی آپ بیتی پڑھی ہے۔ ان دونوں میں اپنے مقصد کی خاطر ہر قسم کی صعوبتیں اٹھانے اور اذیتیں کھینچنے کا جذبہ مشترک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کا مقصد سیاسی تھا مجاہد روس و بخارا ظہور حسین کا مقصد مذہبی تھا۔ مگر اس کتاب میں مہاجر کو درپیش مصائب و مشکلات کا تفصیلی ذکر ہے اور افغانستان ترکستان اور روس کی سیاسی اور معاشرتی تفصیل معرض بیان میں آئی ہے۔ میاں اکبر شاہ کی نگاہ باریک بیں سے کوئی جزوی بات بھی مخفی نہیں رہی۔ اس لئے یہ کتاب گویا ان مجاہدین آزادی کے سفر و حضر کی مکمل روداد ہے اور ان کی کامیاب آپ بیتی۔

یہ خود نوشت صوبہ پختون خواہ کے مجاہدینِ تحریک آزادی کی بڑی ایمان افروز داستان ہے۔ اگرچہ ''ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے والے علما نے خود ہندوستان نہیں چھوڑا'' (صفحہ ۱۵) مگر جو لوگ اس دارالحرب سے ہجرت کر گئے ان کا جذبہ ایمان قابل قدر تھا۔ اسی صوبہ کا واقعہ ہے کہ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں جب چندہ کی تحریک کی گئی تو ایک غریب عورت نے اپنا بچہ چندہ میں دے دیا جسے نیلام کیا گیا (صفحہ ۸) جس نے وہ بچہ خریدا اس نے وہ بچہ ماں کو نہ صرف واپس کر دیا بلکہ اس کی تعلیم و تربیت کے تمام اخراجات اٹھانے کا وعدہ بھی کیا اور اس وعدہ کو نبھایا۔ جب کسی ارفع مقصد کی خاطر ایسا جذبہ پیدا ہو جائے تو اس کے حصول میں بڑی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں مگر حیف کہ تحریک خلافت اور تحریک ہجرت دونوں مسلمانوں کے وسیع تر مفاد میں نہ تھیں اور زیادہ تر مسلمانوں کے نقصان کا باعث بنیں۔

افغانستان میں ان کی ملاقات مولانا عبید اللہ سندھی سے ہوئی ''مولانا سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔۔۔ عام پنجابیوں کی طرح بھاری بھرکم جثہ، لمبی گھنی کھچڑی داڑھی سیاہ مقناطیسی آنکھوں کے فرد تھے۔۔۔ وہ موقتی جلاوطن حکومت ہند کے پہلے صدر تھے۔۔۔ جب بھی انہیں خبر ملتی کہ کسی ہندوستانی نے انگریزوں پر بم چلایا ہے تو وہ حاضرین سے دعا کرواتے اور کہتے دعا کریں اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں کہ مسلمانوں کو خدا انگریزوں پر ایسے بم پھینکنے کی توفیق عطا فرمائیں ۔۔۔ اسی طرح کسی کی شہادت کی خبر ملتی تو فرماتے اللہ تیرا شکر ہے کہ ایک ہندوستانی کو تو نے یہ ہمت

عطا کی اے خدایا تو اور ہندوستانیوں کو بھی یہ سعادت نصیب فرما'' (صفحہ ۷۳) اس وقت ان کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ بزور شمشیر انگریزوں کو نقصان پہنچایا جائے۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کے ہاں جہاد بالسیف کا جو تصور رائج و راسخ ہو چکا تھا وہ ٹھیک نہ تھا اور اب تک ہم اس شدت پسندی کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہے ہیں۔

بخارا پہنچے تو ترمذ میں بالشویک کمشنر نے ان سے خطاب کیا۔ اس کا لباس عجیب تھا'' پتلون کے پچھلے حصہ میں پشت پر پیوند لگے ہوئے تھے قمیض خاکی زین کی تھی اور بٹن تو چمڑے کے گول گول ٹاکیوں میں سوراخ کر کے بنائے گئے تھے اور قمیض پر ٹانکے لگے ہوئے تھے مہاجرین پر ان کی سادگی کا اثر تو بہت پہلے ہی ہو چکا تھا اور اب جب اس شخص کو دیکھا تو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ حاجی شہاب الدین نے بے اختیار اونچی آواز میں کہا 'سبحان اللہ خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔'' (صفحہ ۱۳۶)

اب ایک انقلابی کا ذکر بھی ہو جائے۔ '' سلطان محمد بابو نوشہرہ چھاؤنی کے ایک بڑے انقلابی تھے۔ انہوں نے ایک مدرسہ ''تعلیم القرآن'' کے نام سے بنوایا تھا۔۔۔ سلطان بابو کی ذات نوشہرہ میں قومی تحریک کی مرکز تھی۔۔۔ بابو صاحب پنجاب کے رہنے والے تھے لیکن جوانی میں نوشہرہ آئے بابو صاحب یہ مدرسے چندوں سے چلاتے تھے۔۔۔ بابو صاحب انگریزوں کے دشمن تھے کبھی کبھی جب وہ مسلمان فوجیوں کو پریڈ میں دیکھتے تو اپنے آپ سے کہتے اگر صرف تمہاری توجہ راہ راست پر آ جائے تو پھر کیا کمی ہے؟ بابو صاحب جعلی نوٹوں کے مقدمے میں قید ہوئے لیکن نوشہرہ کے لوگوں کا خیال تھا کہ بابو صاحب نے اپنی ذات کے لئے نوٹ سازی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اتنے پیمانے پر تعلیمی کوششیں اسی نوٹ سازی کی برکت تھیں۔۔۔۔ وہ بہت نیک اور پارسا انسان تھے'' (صفحہ ۳۷۸)

ان کی واپسی بھی خوب ہوئی۔ افغانستان نے ان لوگوں کو راہداری دینے سے انکار کر دیا ایران نے بھی پاسپورٹ دینا پسند نہ کیا۔ آخر ایک پنجابی انقلابی زکریا نے جو جنگ عظیم اول کے دوران لاہور میڈیکل کالج سے چند طلبا کے ہمراہ افغانستان چلا گیا تھا ان کے لئے انتظام کیا اور انہیں بتایا کہ

انہیں تفلس سے آرمنستان تبریز اور بغداد کے راستے ہندوستان پہنچنا ہے'' (صفحہ ۲۶۷)

ہندوستان پہنچنے کے بعد واپس اپنے وطن پہنچے تک کی داستان دلچسپ بھی ہے اور چشم کشا بھی۔ انگریزوں کی خفیہ پولیس ان کی تاک میں تھی لیکن یہ کسی نہ کسی طرح دہلی لاہور سے ہوتے ہوئے اپنے گاؤں پہنچ گئے۔ ''گاؤں پہنچنے کے چوتھے دن میں اپنے حجرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں خاکی لباس میں ملبوس آدمی اندر داخل ہوا کہنے لگا ''میاں صاحب ہم تو آٹھ مہینوں سے آپ کا انتظار کر رہے تھے تم تو بہت دیر سے آئے ہو۔۔۔۔وہ شخص۔۔۔زبان کا اتنا شیریں تھا کہ میرے ذہن میں خیال آیا کہ ضرور میرے والد صاحب یا بھائی کا کوئی دوست ہے لیکن دل اس کا اس کے بالکل برعکس تھا۔۔۔میں نے مزید دو سالوں اور سترہ دن کی مسافرت کی لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ اب میں بدرشی (یعنی اپنے گاؤں) سے تقریباً پچیس میل دور پشاور جیل میں تھا'' (صفحہ ۳۸۸)۔ یہاں یہ خودنوشت ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد مرتب اور مترجم نے حواشی اور اشاریہ درج کیا ہے جس سے کتاب کو بطور حوالہ پڑھنے والوں کے لئے آسانی ہوگئی ہے۔

❀

یادِ ایام

مولوی عبدالرزاق کانپوری اپنی مشہور کتاب البرامکہ کی وجہ سے اسلامی ہند کے علمی حلقوں میں بہت معروف و مشہور رہوئے۔ ۱۸۶۸ میں پیدا ہوئے۔ تحریک علی گڑھ کے اکابر کی آنکھیں دیکھیں۔ سرسید اور ان کے اعیال و احفاد کے علاوہ ان کے رفقاء اور معاصر شخصیات سے قریبی مراسم رہے۔ شبلی نعمانی، اکبرالہٰ آبادی، مولوی نذیر احمد، حالی، نواب محسن الملک، نواب وقارالملک اور سید محمود اور سید راس مسعود اس کتاب میں مذکور ہیں۔ جسٹس سید امیر علی، منشی ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، مولوی وحید الدین سلیم، میر ناصر علی، سید جعفر حسین اس یادنامچے میں موجود ہیں۔ ان کے دیباچہ نگار نے لکھا ہے کہ ''ہر ہائینس بیگم بھوپال علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم انہیں مولوی البرامکہ کے خطاب سے یاد کیا کرتی تھیں'' (پیش لفظ یادایام صفحہ ۹) غرض ''مولوی البرامکہ'' کی یہ کتاب ''یادایام'' اپنے عہد کی فکری تاریخ ہے جو ایک جید مؤرخ کے قلم سے نکلی ہے۔

مولانا ابوالخیر مودودی کا کہنا ہے کہ مولوی عبدالرزاق کانپوری ''نے عمر بھر کتابوں سے آنکھیں لڑائیں اور مصنفوں سے آنکھیں ملائیں اور دفتر کے دفتر لکھے۔۔۔مگر ان کی صرف دو کتابیں ہیں اولین تصنیف البرامکہ، اور آخری تصنیف یادایام پر مبنی آپ بیتی۔'' (صفحہ ۱۴)۔ بادی النظر میں یہ آپ بیتی نہیں مختلف اکابر کی سوانح حیات ہے جسے مصنف نے لکھا ہے مگر ان اکابر میں صرف وہ اکابر مذکور ہیں جنہیں مصنف نے دیکھا اور برتا ہے۔ ان حالات میں صرف وہ باتیں مذکور ہیں جن کا مصنف گواہ ہے اس لحاظ سے ہمارے علمی اکابر کی یہ سوانح عمری مولوی کانپوری صاحب کی آپ بیتی بن جاتی ہے۔ اس کتاب کے لکھے جانے کی وجہ یوں بیان ہوئی ہے کہ سرسید راس مسعود وزیر تعلیم ہو کر بھوپال

تشریف لائے تو مولوی عبد الرزاق کانپوری نے بر سبیل تذکرہ انہیں ان کی مکتب نشینی کا حال سنایا۔راس مسعود نے فرمایا ''میرے عہد طفلی کے دیکھنے والے بزرگ اب برائے نام باقی ہیں۔کیا اچھا ہو کہ میری زندگی کے آپ وہ حالات قلم بند کر دیں جو دیکھے یا سنے ہوں۔علاوہ بریں آپ نے میرے جد محترم اور والد صاحب کو بھی دیکھا ہے ان کی پرائیوٹ صحبتوں اور قومی جلسوں میں بھی شرکت کی ہے لہذا ان کے بھی مخصوص حالات لکھے جائیں بلکہ مناسب ہوگا کہ یہ مضامین جانی ابا (سر سید احمد خاں بہادر) سے شروع ہوں اور میرے نام پر ختم کئے جائیں'' (صفحہ ۱۰)۔یہ سلسلہ شروع ہوا۔بھوپال کے ایک رسالہ میں قسط وار یہ مضمون ۵۳ قسطوں میں چھپا پھر حیدر آباد دکن میں ۱۹۴۵ میں اس کی اشاعت ہوئی۔۱۹۹۳ میں آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور نے اسے لاہور سے شائع کیا۔میرے سامنے لاہور کا ایڈیشن ہے۔

''یاد ایام'' کے اسلوب کا اندازہ لگانے کے لئے پہلے ہی مضمون کو دیکھئے۔عنوان ہے آنریبل سر سید احمد خاں بہادر غفرلہ، مضمون یوں شروع ہوتا ہے ''دیرینہ سال بزرگوں میں سب سے پہلے مجھے سر سید احمد خاں بہادر سے ملنے کا اتفاق ہوا بچپن سے نام سنتا تھا تصویر بھی دیکھی تھی لیکن دست بوسی کا شرف ۱۸۸۷ میں حاصل ہوا۔'' (صفحہ ۱۹) اس کے بعد آپ نے سر سید کے حالات کے لئے حالی کی حیات جاوید دیکھنے کا مشورہ دیا ہے یعنی وہ خود بھی اس مضمون کو سوانحی مضمون کی بجائے تاثراتی مضمون کی حیثیت سے لکھنا چاہتے تھے۔آپ نے سر سید کی مصلحانہ کوششوں کا ذکر کیا ہے کفر کے فتووں کے ساتھ میں یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ ''معاشرہ میں ترکی ٹوپی ٹرکش کوٹ اور انگریزی بوٹ کا رواج عام ہو گیا تھا مگر یہ ادنیٰ مشابہت بھی مولوی صاحبان کو گوارا نہ تھی میں نے اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھا ہے کہ جب کوئی مسلمان ترکی ٹوپی پہن کر آتا اور مسجد میں وضو کرتا تو اس کے سامنے وضو کا بدھنا توڑ دیا جاتا تھا۔اور بازاروں میں ترکی ٹوپی نہایت خاموشی سے لونڈے سر بازار اتار کر لے بھاگتے تھے یہ چیل جھپٹا بڑا پر لطف ہوتا تھا اور مسلمانوں کے قہقہوں سے بازار گونج اٹھتا تھا۔اسی طرح بوٹ کی بھی مسجد سے چوری ہوا کرتی تھی'' (صفحہ ۳۲)۔سر سید ہی کے ذکر کے اختتام پر ایک عظیم الشان دعوت کا بیان ہے جس میں مولوی عبد الرزاق کانپوری نے عرب کے مسلمان تمدن سے لے کر انیسویں صدی

تک کے ہندوستان کی کھانوں کی پوری تاریخ درج کر دی ہے جو ۳۷ سے ۴۳ صفحات تک پھیلی ہوئی ہے۔

اسی طرح سے مولانا شبلی والے مضمون میں بھی یہی تصریح کی ہے کہ ''میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی مستقل سیرت نہیں ناظرین کو حیات شبلی کا انتظار کرنا چاہئیے جو دار المصنفین اعظم گڑھ میں زیر تصنیف ہے (صفحہ ۸۶) شبلی پر بھی ان کے ذاتی تاثرات ہی مضمون کی جان ہیں۔اکبرالہٰ آبادی پر مضمون لکھتے ہوئے مزاحیہ شاعری اور رقص و موسیقی کی تاریخ پر اور اس کے مختلف مکاتیب پر ۸۹ سے لے کر ۱۱۷ صفحے پر مشتمل مضمون درج ہے جس کا اختتام نظیرا کبر آبادی پر ہوتا ہے اس کے بعد اکبرالہٰ آبادی اور ان کی مزاحیہ شاعری پر ان کے تاثرات درج ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ سر سید اور اکبر کی چشمکوں سے لے کر آخری زمانہ تک جب اکبر سر سید کے مداحین میں شامل ہو گئے تھے تمام تفصیلات بلا خوف لومتہ لائم درج ہیں۔

جسٹس امیر علی سے ملنے کلکتہ گئے ہیں تو کلکتہ کے تمدن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے بلکہ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اور ان کے آباد کردہ مٹیا برج کی مکمل تاریخ بیان کر دی ہے۔ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مٹیا برج کی تفصیلات ہم نے پہلی بار ان کے ہاں پڑھی ہیں۔چھ میل لمبے اور ڈیڑھ میل چوڑے اس خطہء زمین کو واجد علی شاہ نے دوسرا لکھنؤ بنا دیا تھا۔یہ مضمون بھی محض سید امیر علی پر نہیں رہا لکھنؤ کے نوابین اور ان کے ثقافتی مشاغل کی پوری تاریخ بن گیا ہے۔جلاوطن ہو کر رنگون جانے والے بہادر شاہ ظفر اور واجد علی شاہ کی مٹیا برج میں نیاز مندانہ ملاقات کا ذکر عبرت انگیز بھی ہے اور چشم کشا بھی۔ ''جب شاہ ظفر کو بجرم بغاوت دہلی سے رنگون جانے کا حکم ہوا تو واجد علی شاہ نے وائسرائے کے ذریعہ شاہ کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجا ظفر نے دعوت تو نامنظور کی لیکن یہ لکھا کہ ''چند منٹ کے لئے جہاز سے اتر کر مٹیا برج میں تم سے ملوں گا''۔چنانچہ مقررہ تاریخ پر وائسرائے اور جملہ عہدیداران برطانیہ مٹیا برج میں جمع ہوئے تا کہ ملاقات کا منظر دیکھیں۔جب ظفر شاہ جہاز سے اتر کر حدود مٹیا برج میں تشریف لائے تو واجد علی شاہ نے باوجود بھاری بھرکم ہونے کے ادب سے سر نیاز جھکا کر ۲۱ سلام کئے۔شہنشاہ دہلی نے سلام لیا اور دونوں اشکبار ہو گئے۔اور دیر تک رقت قائم رہی۔برٹش

حکام نے اس سلام کو حیرت کی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس وقت شاہ اور وزیر دونوں دولت برطانیہ کے قیدی تھے۔۔۔واجد علی شاہ کے ہاتھ میں ایک مرصع عصا تھا وہ نذر میں پیش کیا اس کو شاہ ظفر نے بڑی منتوں سے قبول کیا اور ظفر شاہ کے ہاتھ میں زمرد کی جو تسبیح تھی وہ واجد علی شاہ کو عنایت فرمائی۔اس عطیہ پر شاہ نے پھر سلام کیا اور دست بوسی پر یہ ملاقات ختم ہوئی۔'' (صفحہ ۱۴۶)

سر راس مسعود جن کی فرمائش پر یہ کتاب مرتب ہوئی کی مکتب نشینی کا حال بھی لکھ دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ ''میں نے پہلی مرتبہ سید راس مسعود کو تین سال کی عمر میں دیکھا جب سید محمود نے میرے سامنے ان کو خواجہ حالی کی گود میں دیا تھا۔اس کے بعد تقریباً پانچ سال کی عمر میں دیکھا جب ۱۸۹۳ میں ان کی رسم بسم اللہ اسٹریچی ہال میں ہوئی۔یہ عجیب منظر تھا مسلمان ہندو عیسائی سینکڑوں کی تعداد میں جمع تھے مسعود اس وقت اپنے راجہ دادا (جے کشن داس) کی گود میں تھے۔راجہ صاحب سر سید کے دوست نہیں بلکہ بھائی تھے۔۔۔اِسٹیج پر کہن سال بزرگوں کا مجمع تھا ہندوستان کی قدیم رسم کے مطابق (نیوتہ) راجہ صاحب نے پانسو کی ایک تھیلی مسعود کی گود میں رکھ دی۔بڑے میاں یعنی سر سید نے مسعود سے پوچھا کہ بیٹے تم یہ روپیہ کیا کرو گے؟ سید مسعود نے برجستہ جواب دیا جانی ابا یہ روپیہ آپ کالج میں دے دیجئے'' (صفحہ ۲۳۶)

شہنشاہ ایڈورڈ کی تاج پوشی پر یکم جنوری ۱۹۰۳ پر جو دربار ہوا اس کی تفصیل بھی بیان ہوئی ہے مگر دربار سے زیادہ دلچسپ نواب مرزا داغ سے ملاقات کا حال ہے جو نظام دکن میر محبوب علی خاں کے ہمراہ دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔مولوی عبدالرزاق کانپوری نے تفصیل سے ملاقات کا حال لکھا ہے مگر مولانا ابوالخیر مودودی نے مولانا شبلی کے قیام دکن کا ایک واقعہ درج ایزاد کیا ہے اور تصریح کی ہے کہ مولوی عبدالرزاق کانپوری کو'' کچھ شوق زندہ کہانیوں کا تھا'' اور وہ بیان یہ ہے ''مولانا شبلی نعمانی نے خود برسبیل تذکرہ فرمایا کہ حیدرآباد میں عید کے دن میں داغ سے ملنے گیا۔ادبیات اردو پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ملاقات کے کمرے میں یکا یک ایک بیس سالہ نازنین آ گئی۔جو دکنی لباس اور زیور میں جنت الفردوس کی حور معلوم ہوتی تھی۔وہ اس طرح بے حجابانہ آئی کہ دوپٹہ شانہ سے سرک گیا تھا اس کا مقیاس الشباب پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔اس پر اس درجہ بدحواسی چھا گئی کہ نقشِ دیوار بن کر رہ گئی۔اس میں

بیٹھنے کی جرات تھی نہ واپس جا سکتی تھی۔یکا یک آ جانے سے مرزا صاحب بھی شرما گئے اور بولے 'کمبخت ذرا یہ بھی تو دیکھ لیا کرو کہ میرے پاس کوئی مولوی صاحب موجود ہیں'۔یہ سنتے ہی وہ برق پھر چمکی اور حور پردہ میں غائب ہوگئی۔۔۔داغ نے اس انفعالی حالت پر ایک برجستہ شعر تصنیف کر دیا افسوس ہے وہ نادر شعر میں بھول گیا مگر اس کا مضمون ابونواس کے اس شعر سے ملتا جلتا تھا۔ و قد سقط الرداع عن منکبها . من التخميش والحِلّ الازار '' (صفحہ ۱۷) یہ مولانا شبلی کی خاص ادا تھی ایسے رومان پرور موقعوں پر فارسی یا عربی کے شعروں کا گھونگٹ نکال لیا کرتے تھے آخر وہ شعر بھی تو خود انہی کا ہے ''من فدائے بتِ شوخے کہ بہ ہنگامِ وصال۔ بمن آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را!

خاتمہ کتاب کے طور پر مولوی صاحب نے لکھا ہے ''یاد ایام کی کہانی آج ختم ہوگئی۔۔۔میرے فرصت کے گھنٹوں کا یہ بہترین مشغلہ تھا۔۔۔یاد ایام تر و تازہ اور مہکتے ہوئے پھولوں کا ایک رنگین گلدستہ ہے۔۔یہ میری اٹھہتر سالہ عمر کا ہدیہ ہے گر قبول افتد زہے عز و شرف'' (صفحہ ۲۵۳) تاریخ تکمیل ۲ مئی ۱۹۴۵ درج ہے۔

سٹیزن آف ٹو ورلڈ

کرنل محمد عطاء اللہ کی انگریزی خودنوشت CITIZEN OF TWO WORLDS نیویارک کے مشہور پبلشر ہارپر اینڈ برادرز کی جانب سے ۱۹۶۰ میں چھپی۔ پاکستان میں اس کا اردو ترجمہ مؤسسہ مطبوعات فرینکلن لاہور نیویارک کے زیر اہتمام ''دو دنیاؤں کا شہری'' کے عنوان سے دسمبر ۱۹۶۴ میں چھپا۔ اردو ترجمہ جناب کیپٹن احسن کلیم نے کیا جسے مکتبہ معین الادب لاہور نے شائع کیا۔ اس کا دیباچہ مشہور مصنف لوئل تامس نے لکھا تھا۔

کتاب کا عنوان ہے دو دنیاؤں کا شہری اور ہمیں چھٹی دہائی کے اواخر کے پاکستان کی سیاسی فضا یاد آ رہی ہے۔ بھٹو صاحب نے تیسری دنیا تیسری دنیا کی رٹ لگا رکھی تھی اور عوام کو بتا رہے تھے کہ ہم تیسری دنیا کے رہنے والے کس طرح اپنے مسائل سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ مولوی ملا اس منطق کے خلاف تھے۔ ہمیں موچی دروازہ کے باہر گونجنے والی وہ تقریر یاد ہے جس نے عوام کے دلوں کو موہ لیا تھا اور بھٹو صاحب کی تیسری دنیا کی منطق کی ہوا نکال دی تھی۔ مولانا نے سادہ سی دلیل دی تھی۔ ایک یہ دنیا ہے جس میں ہم رہتے ہیں ایک وہ دنیا ہے جس میں ہمیں مرنے کے بعد جانا ہے بھٹو صاحب یہ تیسری دنیا کہاں ہے؟

فرینکلن والوں نے اس کتاب کا اردو ترجمہ شائع کرنا چاہا تو سید ہاشمی فرید آبادی سے رابطہ کیا۔ ہاشمی صاحب نے حامی بھر لی مگر ساتھ میں یہ بھی کہا کہ چونکہ مصنف نے پہلے باب میں اپنے معتقدات کا ذکر کیا ہے اس لئے مناسب ہو کہ اس کا ترجمہ کوئی ایسا شخص کرے جو ان کے معتقدات سے متفق ہو چنانچہ کرنل محمد عطاء اللہ نے ازراہ کرم ہمیں کہا کہ ہم پہلے باب کا ترجمہ کر دیں ہم نے کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں یہ تک معلوم نہ ہو سکا کہ ترجمہ کا کیا ہوا؟ اب پچاس برس کے بعد ہمارے مہربان دوست راشد

اشرف نے کراچی سے اس ترجمہ کا ایک بریدہ نسخہ ہمیں بھجوایا ہے اور ساتھ میں پہلے باب کا ترجمہ کردہ حصہ بھی مگر یہ ترجمہ تو ہمارا کیا ہوا نہیں ہے۔ کیونکہ کرنل محمد عطاء اللہ نے اپنے مرشد کے جن اردو اشعار و اقوال کا حوالہ دیا تھا وہ اس ترجمہ سے غائب ہیں اور کتاب پر مترجم کا نام بھی مختلف ہے۔ ہو سکتا ہے سید ہاشمی فرید آبادی ترجمہ کا کام مکمل نہ کر سکے ہوں اور بعد کو جناب کیپٹن احسن کلیم صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہو مگر ترجمہ کرنے والا متن میں تو تحریف روا نہیں رکھا کرتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کرنل محمد عطاء اللہ، پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر اور انگلستان کے تربیت یافتہ ماہر امراض چشم تھے، برٹش انڈین آرمی میں خدمت کی برصغیر سے باہر ایران وعراق میں بھی متعین رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ایران میں تھے اور دوران جنگ پیدا ہو جانے والے خوراک کے بحران میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مسقط اور اومان کے حکمران کے وزیراعظم بنتے بنتے بچے۔ قیام پاکستان کے ابتدائی سالوں میں آزاد کشمیر میں طبی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران انہیں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کو سر کرنے والی مہم کا رکن بنایا گیا جس کی پہلی کوشش کامیاب نہ ہوئی مگر دوسری کوشش میں کے ٹو سر کر لی گئی۔ اس کامیابی نے انہیں دنیا میں معروف کروایا۔ کتاب کے فرنٹ پیس پر کرنل صاحب کی جو تصویر دی گئی ہے وہ بھی کوہ پیما کے لباس میں ہے۔ آزاد کشمیر میں ان کی خدمات کا دورانیہ ختم ہوا تو انہیں اعلیٰ فوجی عہدوں پر خدمت کا موقعہ دینے کی بجائے فوج سے ریٹائر کر دیا گیا حالانکہ کرنل صاحب ''ابھی مزید آٹھ سال تک سینئر عہدوں پر کام کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے'' (دو دنیاؤں کا شہری صفحہ ۲۸۰) یہاں اس موقعہ پر ان کی شریک حیات بیگم قمر عطاء اللہ کے اعلیٰ کردار اور ایمان کی پختگی کا نظارہ سامنے آتا ہے۔ اچانک ریٹائر کر دئے جانے کی خبر سے کرنل صاحب بہت دل گرفتہ تھے جب آپ نے اپنی بیگم سے فوج سے اچانک ریٹائر کر دئے جانے کی بات کی تو کوئی جزع فزع کرنے کی بجائے آپ نے انہیں ''تسلی دی اور قرآن پاک کی آیت پڑھی عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر'' لکم یعنی ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو مگر (عین ممکن ہے) وہ تمہارے لئے بہتری اور خیر کا موجب ہو۔ آپ نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا کسی کا برا نہیں چاہا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ پر مہربان رہا تو کیا اب خدا آپ کو چھوڑ دے گا''۔ (صفحہ ۲۸۱)۔ اس ایمان افروز تسلی سے

ان کا سارا ہم وغم دور ہو گیا۔ ساری خودنوشت میں کرنل صاحب نے جگہ بہ جگہ اپنی بیگم کے حسن اخلاق کی بہت تعریف کی ہے اور وہ اس تعریف کی مستحق بھی تھیں۔

کرنل محمد عطاء اللہ کے والد گرامی ریلوے میں انجینئر تھے اور تعمیراتی کاموں کے سلسلہ میں سارے ملک میں گھومتے رہتے تھے ان کا خاندان بھی ساتھ ساتھ سفر میں رہتا تھا۔ مصنف نے بڑی چابک دستی سے اپنے بچپن کی مہمات اور اپنے والدین کی محبت وشفقت کا ذکر کیا ہے جنہوں نے بچوں کی صحیح اسلامی بنیادوں پر تربیت کی اور ان کے اندر دینی اقدار کو پختہ کر دیا۔ ساری خودنوشت میں دینداری اور دینی اقدار سے گہری وابستگی کا تاثر غالب نظر آتا ہے۔ جدید تعلیم اور یورپ کے سفر نے ان کے ذہن میں جدید خیالات اور آزادہ روی کا تلاطم ضرور برپا کیا مگر ان کی بنیادی تربیت ان کے آڑے آتی رہی۔ ان کے ابا نے کبھی ان کے خیالات پر بند باندھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کو خود سوچنے سمجھنے کی ترغیب دیتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات میں ایک فلسفیانہ رنگ پیدا ہو گیا اسی لئے ان کے دیباچہ نگار لوئل تامس نے انہیں ''ڈاکٹر، کوہ پیما اور فلسفی محمد عطاء اللہ کہا ہے جن کی زندگی بلند اولوالعزمیوں کا مرقع ہے'' (دیباچہ کتاب Citizen of Two Worlds)۔ بعد کی زندگی میں انہیں قمر عطاء اللہ جیسی روشن خیال اور اعلی تعلیم یافتہ شریکہء حیات مل گئی جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ ایک ایسا شخص جس نے برطانوی دور حکومت میں فوج کی افسری کی ہو اور سرتاپا ایسے ماحول میں غرق رہا ہو جو بہ نظر ظاہر دین سے دور کی نسبت بھی نہ رکھتا ہو، وہ دینی اقدار سے نہ صرف وابستہ رہے بلکہ دینی فرائض کی بجا آوری میں ہمہ وقت مستعد رہے تو ایسے شخص کیلئے اور اس کے والدین کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے اسی لئے کرنل محمد عطاء اللہ نے کتاب کو اپنے والدین کے نام اس قرآنی دعا کے ساتھ معنون کیا ہے ربِّ ارحمهما كما ربّياني صغيرا. کہ اے میرے رب میرے ماں باپ پر رحم فرما اسی طرح جس طرح ان دونوں نے صغرسنی میں میری پرورش کی۔ (صفحہ ۳)

دو دنیاؤں کا شہری ایک عجیب خودنوشت ہے۔ کرنل محمد عطاء اللہ ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کی والدہ ان کی صغرسنی ہی میں فوت ہو گئیں تو والد نے دوسری شادی کر لی مگر سوتیلی ماں نے تین بچوں کو کسی غیر مادرانہ سلوک کا احساس نہ ہونے دیا۔ جب محمد عطاء اللہ نے ایم بی ایس کر لیا

تو مالی کشادگی نہ ہونے کے باوجود باپ نے انہیں مزید تعلیم کے لئے انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا اور انہیں مبارکباد کا خط لکھا ''الحمد للہ! آپ کی امی حیات ہوتیں تو انہیں کتنی خوشی ہوتی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی خواہش ہوتی کہ وہ آپ کو مزید تعلیم کے لے یورپ بھیجیں۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیج دیا جائے'' (صفحہ ۳۵) حالانکہ اس وقت ان کے دیگر سات بہن بھائی تھے اور دو تو ابھی سکول کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ بہرحال محمد عطاء اللہ نے ابا کی توقعات کو پورا کیا۔ یورپ کی سحر آفرینی نے انہیں بہت کھینچا مگر وہ ثابت قدم رہے اور واپس اپنے وطن آ گئے اور ہم وطنوں کی خدمت کرتے رہے۔

میڈیکل کالج میں تعلیم کے دوران یہ کرنل سدرلینڈ کے شاگرد تھے۔ کرنل سدرلینڈ کے اخلاق فاضلہ کے بارے میں ان کا لکھا اس قابل ہے کہ دوسروں تک پہنچایا جائے۔ ''وہ میانے قد کے مضبوط جسم والے آدمی تھے۔ ہمیشہ نفیس لباس میں ملبوس رہتے کہا جاتا تھا کہ ان کے سوٹ سیوائل رو والوں کے ہاں سلتے ہیں اور قمیصیں پیرس میں بنتی ہیں۔ ان کی چال نپی تلی اور باوقار تھی قدموں کی چاپ سن کر ہی لوگ رک جاتے تھے۔ ان کی گفتگو متوازن ہوتی تھی وہ لفظوں کے ضیاع کے قائل نہیں تھے۔ کلاس روم میں اور وارڈ میں ان کا رکھ رکھاؤ فنکارانہ تھا۔ وہ کہیں ہالی وڈ میں ہوتے تو بڑا نام پیدا کرتے۔ وقت کی پابندی میں مثال تھے میں نے دو سال کے قیام کے دوران کبھی انہیں ایک منٹ بھی دیر سے آتے پایا نہ وقت سے ایک منٹ قبل۔ بلیک بورڈ پر ہمیشہ جلی اور بڑے حروف میں لکھتے۔ مجھے وہ اس لئے بھی یاد ہیں کہ ان کے بظاہر درشت بشرے کے پیچھے انتہائی محبت اور ملائمت پوشیدہ رہتی تھی۔ فیکلٹی کے دوسرے سینئر اساتذہ کی طرح وہ راجاؤں مہاراجوں اور نوابوں کے علاج سے بے پناہ دولت کما سکتے تھے مگر وہ دن میں دو مریضوں سے زیادہ نہیں دیکھتے تھے۔ باقی مریضوں کو وہ اپنے شاگردوں کی طرف بھیج دیا کرتے تھے۔ ان کا اپنا وضع کردہ اصول تھا کہ وہ ڈاکٹروں، استادوں، طالب علموں، مبلغوں، قریبی عزیزوں اور ناداروں سے فیس نہیں لیتے تھے۔ وہ پیسہ کمانے کے لئے پریشان نہیں ہوتے تھے انہیں تردد اس بات کا رہتا تھا کہ کسی کو ناراض کئے بغیر وہ اس سے فیس لینے سے انکار کس طرح کریں۔'' (صفحہ ۲۹) کیا ان جیسا کوئی اور بھی آپ کی نظر سے گذرا ہے؟ الحكمة ضالته المومن کیا ہمارے مومن اس کھوئی ہوئی دولت کی بازیابی کے لئے کوشاں ہوں گے؟

یہ پہلی خودنوشت ہے جس کے لکھنے والے کے حالات واحوال سے ہم ذاتی طور پر آگاہ ہیں یہ حالات واحوال وہ ہیں جو خودنوشت لکھے جانے کے بعد کے ہیں۔ان کے چاروں بیٹوں انیس، منیر، شاہد، فرید سے ہماری دوستی اور بے تکلفی ہے درشین کو ہم نے اس کے بچپنے میں تھوڑی بہت اردو زبان سکھانے کی کوشش کی ہے۔بیگم قمر عطاء اللہ ہماری پنجاب یونیورسٹی کے شعبہء سوشل ورک کی صدر تھیں۔ہم کہنے کو فرید کے ٹیوٹر تھے مگر کرنل عطاء اللہ کا گھر نمبر دس ریٹیگن روڈ لاہور میں ہمارا دوسرا گھر تھا۔انیس تو اس وقت سینڈ ہرسٹ میں فوجی ٹریننگ لے رہا تھا منیر اور شاہد ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں تھے۔جمعہ کے روز عین پونے ایک بجے کرنل محمد عطاء اللہ کی امریکن شیورلیٹ گاڑی ہمارے ہاسٹل کے نیچے آجاتی اور ہم ان کے ہمراہ نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے بیت الذکر گڑھی شاہو کے لئے روانہ ہوجاتے۔ہوا یوں تھا کہ ایک بار کرنل صاحب نے دیکھا کہ ہم جمعہ کی نماز کے لئے بس سے اتر رہے ہیں۔کرنل صاحب نے ہمارے کہے بغیر یہ ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی کہ جمعہ کو ہمیں معینہ وقت پر دارالذکر لے کر جانے لگے۔اگر کرنل صاحب لاہور سے باہر ہوتے تو ایک روز پہلے ہمیں مولی یعنی ان کا عمر بھر کا خادم ہمیں بتا دیتا کہ کرنل صاحب لاہور میں نہیں ہوں گے اس لئے اپنا انتظام کرلیں۔

کرنل صاحب کا انتقال بھی عجیب حالات میں ہوا۔ ہم اس وقت اوساکا یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر جاپان میں تھے اخبار میں خبر پڑھی کہ کرنل صاحب اور جسٹس سجاد احمد جان مشہور سیاست دان جناب محمد اسلم خاں خٹک کے مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ رات کو کسی وقت گیس لیک ہونا شروع ہوئی جسٹس سجاد تو جھیل گئے مگر کرنل صاحب دم گھٹنے سے راہیءبقا ہوگئے۔ہم نے وہاں سے افسوس اور تعزیت کا خط بیگم قمر عطاء اللہ کے نام لکھا بیگم صاحبہ نے الٹا ہمیں تسلیاں دیں اور صبر اختیار کرنے کی تلقین کی۔اللہ تعالیٰ اس نیک سرشت ڈاکٹر اور بلند ہمت اور بلند حوصلہ انسان کے درجات بلند کرے۔ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ہمیں خوشی ہے کہ ان کی خودنوشت ایک بریدہ نسخے نے ہمیں ان کو یاد کرنے کا موقعہ مہیا کر دیا۔

یادوں کے دریچے

ریڈیو پاکستان سے وظیفہ یاب ہونے والے کارکن جناب رفیع الزماں زبیری کی سیدھی سادی مختصر اور ادھوری خودنوشت ''یادوں کے دریچے'' کے عنوان سے فضلی سنز کراچی نے ۲۰۱۲ میں پہلی بار شائع کی ہے۔زبیری صاحب نے صرف علی گڑھ اور دہلی کی یادوں کو صفحہء قرطاس پر منتقل کیا ہے۔۱۳ ستمبر ۱۹۴۷ کو جو اتفاق سے ان کی سالگرہ کا دن بھی تھا یہ پاکستان پہنچے اور وہیں آپ نے اپنی یادوں کے دریچہ کو بند کر دیا۔

رفیع الزمان زبیری کے والد محترم صرف بتیس سال کی عمر میں راہیءبقا ہوگئے تھے ابھی یہ نو سال کے بھی نہیں ہوئے تھے۔اس لئے ان کی تمام تر پرورش ان کے تایا ابا کی سرپرستی میں ہوئی۔دادا ابا کے انتقال کی خبر انہیں ملی تو روتے ہوئے گھر پہنچے۔ان کی والدہ محترمہ نے کیا چبھتا ہوا فقرہ کہا''اس دادا کے انتقال پر روتے ہو جنہوں نے لوٹ کر بھی نہیں پوچھا کہ کس حال میں ہو؟'' (یادوں کے دریچے صفحہ ۳۸)۔

ان کا خاندان مارہرے کا تھا مگر ابا ریاست بھوپال اور جاورہ میں ملازمت کرتے رہے۔ابا کی وفات کے بعد انہیں تعلیم کے لئے علی گڑھ سکول میں بھیج دیا گیا۔ظہور وارڈ میں جہاں نو سال سے کم اور بارہ سال سے زیادہ کی عمر کے بچے داخل نہیں کئے جاتے تھے انہیں جگہ ملی اور یہ دوسری جماعت کے طالب علم بنے'' (صفحہ ۱۷۔۱۸) علی گڑھ سکول کے ابتدائی حالات تو میر ولایت حسین نے اپنی خود نوشت میں لکھے تھے علی گڑھ یونیورسٹی بننے کے بعد کے زمانہ کے سکول کے حالات زبیری صاحب نے لکھے ہیں۔سکول کا ماحول وہی تھا جو میر ولایت حسین نے بیان کیا ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہ

علیگڑھ مسلم لیگ کا مرکز بن چکا تھا اور سکول کے بچے بھی مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کی بچہ مسلم لیگ نے قائداعظم کو بلایا تھا اور ان کے ساتھ جو تصویر بچہ مسلم لیگ کے اراکین کی کھنچی اور کتاب کے پس ورق پر موجود ہے زبیری صاحب اس میں موجود ہیں۔ بچہ مسلم لیگ نے حکیم سعید صاحب کی سرکردگی میں قائداعظم کا (چڑیا گھر سے مانگے ہوئے) ہاتھی پر جلوس نکالنے کا ارادہ کیا تھا مگر قائداعظم نے انکار کردیا (صفحہ ۲۰)

علی گڑھ سکول میں ان کی آٹھویں کلاس کے اردو میگزین کے ایڈیٹر مختار مسعود تھے زبیری صاحب نائب تھے (صفحہ ۳۳) پھر مشہور روحانی رہنما پیر پگارا کے صاحبزادے سکندر شاہ ان کے ساتھ علی گڑھ میں داخل ہوئے (صفحہ ۴۳) یہی سکندر شاہ بعد کو شاہ مردان شاہ کے نام سے پیر پگارا ہوئے اور پاکستان کی سیاست میں خوب نام کمایا۔ اب ان کے صاحبزادے پیر پگارا ہیں۔

مسلم لیگ کے الیکشن میں اپنے استاد کے ہمراہ مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ ان کی خوب پذیرائی ہوئی مگر ایک مسلمان نے جو گاندھی کیپ لگائے تھے اور مؤثر شخصیت کے مالک تھے ان سے کہا ''میں بھی آپ کی طرح مسلمان ہوں اور پاکستان کے بارے میں آپ نے جو کہا کہ اسلامی ملک ہوگا اسلامی نظام ہوگا چاہتا ہوں کہ ایسا ہی ہو مگر آپ اور ہم تو یہیں رہ جائیں گے ہمارے لئے تو یہی زمین اور آسمان ہوگا'' میں نے جواب دیا تو کیا ہوا؟ ہمارے بہت سے بھائی تو اسلامی ریاست میں زندگی گذاریں گے'' وہ کہنے لگے'' کاش ایسا ہو''۔ اب مجھے اکثر ان کی بات یاد آتی ہے۔ ہم ہندوستان کے ہندو اکثریت والے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کا جذبہ تو اسلام کی سربلندی کا تھا اس میں ہم مخلص تھے جن علاقوں میں پاکستان بنا وہاں کے مسلمانوں کا بھی یہی جذبہ تھا یا نہیں یہ اللہ جانتا ہے'' (صفحہ ۶۷) پاکستان کا محرک مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم کرنے کا خواب تھا جو پورا ہوا مگر بدقسمتی کہ عوام اور حکمرانوں کی بداعمالیوں نے اس خواب کو خواب پریشان میں بدل دیا۔ قرآن حکیم میں کیسی اصولی بات بیان ہوئی ہے اِنَّ اللّٰہ لا یُغیرُ مابقومٍ حتیٰ یُغیّرُو ما بانفُسِھم.

دہلی میں فسادات کی افراتفری میں آپ نے ''اختر الایمان کی منگیتر سلطانہ ان کی والدہ اور بہن کو بھی دیکھا جو اپنے گھر سے اس حال میں بھاگ کر تھانے میں پناہ لینے آئی تھیں کہ صرف ماں کے سر

پر دوپٹہ تھا جسے انہوں نے پھاڑ کر اپنی جوان بیٹیوں کے سر ڈھانپے'' (صفحہ ۱۲۰) سلطانہ کا نام آیا تو اختر الایمان کی خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' یاد آئی۔ جوش صاحب کے ذکر میں اختر الایمان لکھتے ہیں ''زمانے کے بعد ایک بار بمبئی کی ایک ادبی نشست میں ملاقات ہوئی۔ کیفی، سردار، وشوامتر عادل اور تقریباً سب ہی کی بیویاں جوان تھیں اور دیکھنے میں بھی اچھی لگتی تھیں اس میں شامل تھیں۔ میری بیوی سلطانہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ جوش محفل میں آئے تو سب لڑکیوں کو دیکھ کر کہا ''مردودوں نے کیا کیا عورتیں رکھی ہیں''۔ سلطانہ گھر آکر بہت بگڑیں کہ 'کیا مطلب تھا جوش صاحب کا اس بات سے؟ وہ کیا سمجھتے ہیں عورتوں' کو وغیرہ وغیرہ میں نے ہنس کر ٹال دیا کہ جوش صاحب کا سنجیدگی سے کچھ بھی مطلب نہ تھا۔'' (اس آباد خرابے میں۔ صفحہ ۱۲۶)

ان کی'' والدہ ادیب اور شاعرہ تھیں ان کا کلام رسالوں میں شائع ہوتا تھا ایک چھوٹا سا دیوان ''دیوان ممتاز'' کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے ان کا نام ممتاز تھا اور ابا جان کے نام کے اضافے سے وہ ممتاز رفیع بیگم کہلاتی تھیں امرتسر سے اور پھر لاہور سے ایک ماہنامہ ''سہیلی'' کے نام سے شائع ہوتا تھا وہ اس کی اعزازی مدیرہ تھیں ان کا نام سرورق پر چھپتا تھا ہمدرد یونیورسٹی کی لائبریری میں اس رسالے کی ۱۹۳۰ کی ایک مکمل جلد ہے'' (صفحہ ۶) زبیری صاحب نے سلیس اور رواں اردو لکھنے کا سلیقہ اپنی اماں سے ورثہ میں پایا ہے۔

یہ مختصری خودنوشت صاف گوئی اور صاف بیانی کی وجہ سے ممتاز رہے گی۔

عدالت عالیہ کے قاصد کی کہانی

''عدالت عالیہ کے قاصد کی کہانی'' کے عنوان سے جناب علی رحمٰن کی خودنوشت صدیقی پبلشرز۔ مراتب علی روڈ گلبرگ لاہور کی جانب سے جون ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ علی رحمٰن پنجاب کی عدالت عالیہ کے ادنیٰ درجے کے ملازم رہے۔ مختلف اوقات میں مختلف جج صاحبان کے ساتھ خدمت کی خدمت کے دوران ہی انہیں احساس ہوا کہ انصاف اور انصاف دینے والے ادارے میں خدمت کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ اس ادارہ سے وابستگی نے انہیں جو کچھ دیا یا سکھایا ہے وہ دنیا تک پہنچا دیں چنانچہ علی رحمٰن صاحب اپنی ملازمت کے دوران فرصت کے وقفہ میں اپنی یادداشتیں قلم بند کرتے رہے اور اب وہ یادداشتیں کتابی صورت میں چھپ کر سامنے آ گئی ہیں۔ ایک ایسے شخص کی یادداشتیں جس کے پاس تعلیم کے عام معیار کے لحاظ سے کوئی ڈگری نہیں ہے مگر اس کا حساس دل اسے اپنی بات کہہ دینے پر اکساتا رہتا ہے اس نے اس آواز کو صدا بصحرا نہیں ہونے دیا سنا اور کاغذ کے سپرد کر دیا۔

ہم نے عدالت عالیہ کے بعض جج صاحبان کی خودنوشتیں بھی پڑھی ہیں جسٹس ایم اے کے صمدانی کی خودنوشت جائزہ، جسٹس جاوید اقبال کی خودنوشت اپنا گریبان چاک، جسٹس محمد اسلام بھٹی کی خودنوشت عدالت عالیہ تک کا سفر اردو میں اور چیف جسٹس نسیم حسن شاہ، چیف جسٹس اجمل میاں اور چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی انگریزی میں لکھی گئی خودنوشتیں۔ موازنہ مقصود نہیں مگر کیفیت کے لحاظ سے ہمیں علی رحمٰن کی خودنوشت میں زیادہ صاف گوئی اور خلوص دکھائی دیا ہے۔ یوں سمجھئے علی رحمٰن نے انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں کو بہت قریب سے دیکھ کر اپنی بے لاگ رائے دے دی ہے جو ضروری نہیں سو فیصدی درست ہی ہو۔ آخر ایک کم پڑھا لکھا آدمی انصاف کی باریکیوں کو اس طرح تو نہیں سمجھ

سکتا جس طرح جید قانون دان سمجھتے یا بال کی کھال اتارتے ہیں۔ علی رحمٰن نے انصاف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے مزاج، میلانات و رجحانات، گھریلو معاملات میں ان کے رویہ اور انصاف طلب کرنے والوں سے ان کے سلوک کا اور ان کے حقوق العباد کے پہلو کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے دیانت داری سے بیان کر دیا ہے۔

علی رحمٰن کے دیباچہ نگار معین نظامی نے ایک مقام پر لکھا ہے'' علی رحمٰن آپ نے کہا تھا اس کتاب میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ سب سچ ہے لیکن سارا سچ نہیں لکھا جا سکا'' (عدالت عالیہ کے قاصد کی کہانی صفحہ ۱۷) مجھے یوں محسوس ہوتا ہے اس فقرے سے معین نظامی صاحب نے علی رحمٰن کو انگیخت کیا ہے کہ وہ اس کتاب میں سنسنی پیدا کرنے کی کوشش کریں مگر آفرین ہے اس کم علم مگر ذہنی دیانت سے مالا مال مصنف پر کہ اس نے اس کانٹے کو نگلنے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ بہت سے موقعے ایسے آئے تھے کہ علی رحمٰن کے پاؤں میں لغزش آ جاتی اور وہ عزت مآب جسٹس صاحبان کے بارے میں ایسی باتیں لکھ جاتے جو نا روا ہوتیں۔ آخر ہمارے دو چیف جسٹس صاحبان نے اپنی اپنی خودنوشتوں میں ایک دوسرے کو علی الاعلان طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے اور ایک چیف جسٹس نے تو دوسرے چیف جسٹس کو ببانگ دہل '' بے ایمان اور بے اصولا کہا ہے'' (جج بولتا ہے۔ خودنوشت جسٹس اجمل میاں صفحہ ۱۷۰ مکرر صفحہ ۳۴۷)۔ اور تو اور اپنے جسٹس جاوید اقبال صاحب بھی اپنے ساتھیوں میں ایک کو شیزوفرینیا کا مریض اور دوسرے کا قبر تک پیچھا کرنے والا قرار دیتے رہے ہیں (اپنا گریباں چاک صفحہ ۱۵۱ یا صفحہ ۱۴۶)۔ علی رحمٰن نے ان عالی مرتبت جج صاحبان کے اسوہ کی پیروی نہ کر کے نیکی کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے اپنے فرائض کی بجا آوری کے دوران جج صاحبان کو جیسا دیکھا ویسا بیان کر دیا ہے اور یہ بڑی قابل قدر بات ہے۔

علی رحمٰن مانسہرہ کے قریب ایک کوردہ کا رہنے والا ہے تلاش معاش اسے لاہور لے آئی۔ ادھر ادھر کی خدمتوں کے دوران اسے محمود الحسن آئی سی ایس کے خاندان کی سرپرستی نصیب ہو گئی جو مشرقی پاکستان سے بے در ہو کر یہاں آیا تھا'' ان لوگوں نے اسے صحیح تلفظ سے قرآن پڑھنا سکھایا۔ ترجمہ سکھایا۔ وہ لوگ صبح بلا ناغہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے اور پابندی کے ساتھ پانچ وقت کی نماز

پڑھتے تھے۔۔۔وہ احمدی تھے ان لوگوں میں چند ایسی خوبیاں تھیں جن سے میں بہت متاثر تھا۔۔۔
بھٹو مرحوم کے دور حکمرانی میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا۔۔۔وہ لوگ جھوٹ بالکل نہیں بولتے
تھے ان کا اخلاق بہت اچھا تھا۔۔۔ان دنوں جماعت احمدیہ کے نوجوان لڑکوں کے درمیان سیرت
النبی کے موضوع پر ماڈل ٹاؤن مسجد میں تقریری مقابلہ ہونا تھا محمود الحسن صاحب نے مجھے بھی سیرۃ النبی
پر تقریر لکھ کر دی۔۔۔اس محفل پاک کے مہمان خصوصی اس وقت کے فضائیہ کے سربراہ ایئر مارشل
ظفر چوہدری تھے جمعتہ المبارک کا دن تھا نماز جمعہ کے بعد سیرت النبی پر تقریری مقابلہ شروع ہوا۔۔
میں نے تقریر کی اور ظفر چوہدری نے گلے لگا کر انعام دیا۔'' (صفحہ ۶۷۔۶۸) ''لاہور میں میرے
دوستوں عزیزوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ علی رحمٰن احمدی ہو چکا ہے اب ہمارے ہاتھ سے نکل چکا
ہے بقول ان کے کہ علی رحمٰن یعنی مجھے ان لوگوں نے شادی کی لالچ دی ہے اب اس کی واپسی مشکل ہی
نہیں ناممکن ہے۔۔۔یہاں میں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے نہ مجھے
شادی کی لالچ دی تھی اور نہ ہی دولت کی میں ان کے حسن اخلاق اور ان کے قول و فعل کا گرویدہ ہو گیا
تھا'' (صفحہ ۶۹)۔ منافقت کے موجودہ دور میں ایک شخص کا علی الاعلان کسی احمدی کی دینداری کا
اعتراف و اعلان کرنا مشکل کام ہے مگر علی رحمٰن نے ایمان داری سے جو کچھ دیکھا اور جانا ہے اسے
بیان کر دیا ہے۔

علی رحمٰن کی خودنوشت درحقیقت احوال الرجال کے پیرائے میں لکھی گئی خودنوشت ہے جس
میں جسٹس صمدانی، جسٹس جواد ایس خواجہ اور جسٹس میاں اللہ نواز کی شخصیات تفصیل سے بیان ہوئی
ہیں۔جسٹس صمدانی کی بیگم صاحبہ کی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب انہیں معلوم ہوا کہ علی رحمٰن اپنی خود
نوشت لکھ رہے ہیں تو آپ نے انہیں کہا علی رحمٰن میری خوبیوں کا ہی ذکر نہ کرنا میری خامیوں کو بھی
بیان کرنا (صفحہ ۱۱۴) اور علی رحمٰن نے جہاں ان کی مہربانیوں کا ذکر کیا ہے وہاں ان کی بعض سخت
مزاجیاں بھی بیان کر دی ہیں۔ اسی طرح جسٹس صمدانی نے ان کے ساتھ جس محبت اور مہربانی کا
سلوک روا رکھا وہ کھل کر بیان کیا ہے۔ان کی خودنوشت ''جائزہ'' کا حوالہ دو تین مقامات پر موجود ہے
اس کا مطلب ہے علی رحمٰن نے غور سے ان کی خودنوشت کو پڑھا بھی ہے اور اس سے سبق بھی حاصل

کیے ہیں۔ بڑا سبق تو دیانت داری اور انصاف کا سیکھا ہے۔

جسٹس میاں اللہ نواز صاحب کا سلوک اس کے ساتھ ماتحتوں جیسا نہیں برابر کے فرد جیسا
تھا۔ ہمدردی یہاں تک کہ اس کی بیماری کی خبر انہیں پہنچی تو جسٹس اللہ نواز نے کہا کہ اگر اس کے علاج
کے لئے انہیں اپنی زمین بھی فروخت کر دینا پڑی تو فروخت کر دیں گے۔

جسٹس جواد ایس خواجہ کا سلوک تو بہت ہی کریمانہ تھا۔ وہ فرماتے تھے ''عدالت کی چار دیواری
کے اندر میرا کوئی رشتہ کسی سے نہیں'' (صفحہ ۲۲۱) اس لئے وہ انصاف کا دامن بڑی مضبوطی سے پکڑے
رہتے تھے۔ وکلاء کے ساتھ سلوک ہمدردانہ تھا مگر وکلا کی ہڑتال کے سخت خلاف تھے کہ اس سے سائلین
کو تکلیف ہوتی ہے۔اپنی زندگی میں انہوں نے بیٹیوں کی شادیاں اتنی سادگی سے کیں ''نہ دعوتی کارڈ
چھپوائے یہاں تک کہ اپنے سٹاف سے بھی ذکر تک نہیں کیا۔۔تینوں بیٹیوں کی رخصتی پر کوئی چھٹی بھی
نہیں لی بلکہ سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی والے دن معمول کے مطابق اپنے عدالتی فرائض انجام دئے
اور شام کو نکاح پڑھا کر رخصتی کر دی نکاح خواں بھی جسٹس جواد ایس خواجہ کے روحانی گرو جسٹس
(ریٹائرڈ) کے ایم اے صمدانی صاحب تھے'' (صفحہ ۲۳۲)۔ ہمیں جسٹس صمدانی کی اپنی شادی کا واقعہ
یاد آ رہا ہے جو آپ نے اپنی خودنوشت جائزہ میں درج کیا ہے ''میں نے سیالکوٹ میں کسی کو خبر نہ
ہونے دی کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ مجھے یہ بات عجیب لگ رہی تھی کہ ایک سیشن جج دولہا بنے گا اور
چونکہ شادی کی تاریخ گرمیوں کی چھٹی میں تھی اس لئے مجھے اطمینان تھا کہ کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔ مجھے
شادی کے سلسلہ میں حکومت سے کچھ قرض لینے کی ضرورت تھی سو میں نے ہائی کورٹ سے خط و کتابت
بھی خود ہی یعنی سٹینوگرافر کی مدد کے بغیر کی تا کہ راز فاش نہ ہو جائے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شادی
کی محفل میں میں نے اپنے کلرک آف کورٹ کو پہلی صف میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔۔۔ثابت ہوا کہ
سیشن کورٹز کے کلرکز آف کورٹ بہت تیز ہوتے ہیں'' (جائزہ۔صفحہ ۵۵)۔ جسٹس صمدانی سیشن جج
سے ہائی کورٹ کے بنچ پر سرفراز ہوئے تھے علی رحمٰن کا کہنا ہے کہ سیشن ججز سے ہائی کورٹ میں تعینات
ہونے والے ججز کے بارہ میں فوجداری مقدمات کرنے والے وکلاء صاحبان کا تاثر زیادہ اچھا نہ تھا
اکثر وکلاء صاحبان کہتے تھے کہ ان جج صاحبان کا پختہ ذہن بن چکا ہوتا ہے کہ ملزم کو ہر صورت میں سزا

ہی دینی ہے حالانکہ یہ تاثر صحیح نہیں تھا" ماضی میں اکثر نامور سیشن جج صاحبان جن میں محترم جسٹس کے ایم اے صمدانی صاحب جسٹس محمد امیر ملک صاحب جسٹس محمد حسن سندھڑ صاحب جسٹس منور الہیٰ رانا صاحب جناب جسٹس اسلام بھٹی صاحب کے بارے میں وکلاء صاحبان کی سوچ اچھی تھی" (صفحہ ۲۷۶) ہم نے اپنے دوست جسٹس اسلام بھٹی سے کہا لو بھئی ہائی کورٹ کے ایک قاصد نے بھی آپ کو اچھا جج ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے۔ علی رحمٰن نے خود تو کوئی بات نہیں کی وکلاء صاحبان کا نام درمیان میں لے آئے ہیں مگر علی رحمٰن نے تو اپنے محسن جسٹس جواد ایس خواجہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے بھی ایک مشورہ ان کی خدمت میں عرض کر دیا ہے کہ" میرے خیال میں جج کو سماعت کے دوران میانہ روی اختیار کرنی چاہیئے" (صفحہ ۲۵۲)۔ جسٹس جواد ایس خواجہ تو ریٹائرمنٹ کے بعد علی رحمٰن کے گاؤں بھی گئے اور وہاں ایک روز غریبانہ ماحول میں بسر کیا۔ اور" چار پائی کی بجائے چٹائی پر آرام فرمایا" (صفحہ ۲۷۶)۔

یہ خودنوشت عدالت عالیہ کی انصاف کی کرسیوں پر بیٹھنے والے کچھ نیک دل جج صاحبان کی داستان ہے اس لئے قاری کو کشش بھی کرتی ہے۔ زبان و بیان ایک عام سادہ دل دیہاتی کا ہے اور اسے ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا۔ امید ہے یہ خودنوشت بہتوں کے لئے سود مند ہوگی۔

گئو دھول

ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اپنی خودنوشت کو "گئو دھول" کا نام دیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ شام کو جب جانور اپنی چراگاہوں سے واپس آتے ہیں تو ان کے پاؤں سے جو دھول اڑتی ہے اسے گئو دھول کہا جاتا ہے گویا انہوں نے یہ ترکیب شام زندگی کے معنیٰ میں استعمال کی تھی۔ ہمارے اورینٹل کالج کے زمانے کے ہم عصر اور ہم نشیں دوست ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے اپنی خودنوشت "یادوں کی دھول" ۱۹۹۲ میں چھاپی تھی۔ اب لاہور مزنگ روڈ کے سانجھ والوں نے اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱ میں چھاپا ہے۔ اس دوسرے ایڈیشن میں کچھ اضافے بھی کئے گئے ہیں حفیظ صدیقی نے اپنے والد گرامی مولوی علم الدین صدیقی صاحب کے احوال میں جو کچھ لکھا تھا وہ پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں تھا وہ دوسرے ایڈیشن میں شامل کر دیا گیا ہے اور یقیناً ایک مفید اضافہ ہے۔ حفیظ اورینٹل کالج کے زمانے میں تو "ابوالاعجاز" نہیں تھا مگر سکول ماسٹری کی گرد پھانکتے ہوئے اورینٹل کالج تک پہنچا تھا اس لئے ہم جماعتوں سے دیکھنے میں بھی بڑا لگتا تھا۔ ہم پر اس کی بزرگی کا اتنا رعب نہیں تھا جتنا اس کی عربی فارسی دانی کا تھا۔ یہ عقدہ تو اب آ کے کھلا ہے کہ حفیظ کے گھر کا ماحول علمی ماحول تھا اور اس کے والد محترم دیوبند کے سند یافتہ بزرگ تھے اور باقاعدہ مسند ارشاد پر تھے۔ ہمارے زمانے میں حفیظ نے ایم اے فارسی کیا تھا اس کے بعد اگلے برس ایم اے اردو کیا۔ حفیظ صدیقی سے بعد کو کوئی رابطہ نہ رہا۔ اب ان کی خودنوشت آئی ہے تو اس پرانے دوست کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ پروفیسر حفیظ صدیقی نے خود نوشت کے لئے افسانوی اسلوب چنا ہے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اپنے بزرگوں کا ذکر پھر اچھے لوگ کے عنوان سے بعض محبوب احباب کا ذکر اذکار، تنکے کے عنوان والے باب میں عام لوگوں کا

احوال پھر شاید خود بھی اس تقسیم سے تنگ آ گئے ہیں آخر میں چند مناظر اور پتنگ بازی کے سحر کے
بیان کرنے کے بعد ''اشرف المخلوقات کے خدام'' کے نام سے دو جانوروں کا ذکر جن میں ایک سانڈ
ہے دوسرا کتا۔ اس خودنوشت کے کئی حصے ایسے ہیں جنہیں افسانہ کہا جا سکتا ہے انہیں اس خودنوشت
سے علیحدہ بھی کر دیا جائے تو حفیظ صدیقی صاحب کی یادوں کے احوال میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوتا۔
اور ان حصوں کو افسانے کے نام سے شائع کر دیا جائے تو ان کے مکمل افسانہ ہونے میں کوئی خلل نہیں
آتا ''کھڑکی کھل گئی تھی''۔ ''خطرہ اور چراغی''۔ ''ودھی نوں ستے خیراں''۔ ''دوسرا تاج محل''
''پریشانی'' اور ''شیرو'' اور ''ڈبو'' مکمل افسانے ہیں۔ حفیظ انہیں علیحدہ افسانوں کی صورت میں بھی
شائع کر سکتے تھے۔

خودنوشت کے لحاظ سے پہلا حصہ جسے حفیظ نے بڑے لوگ کے نام سے موسوم کیا ہے بہت اہم
ہے کیونکہ اس سے حفیظ صدیقی کی شخصیت کی بہت سی پرتیں کھلتی ہیں۔ اس کی ذات میں جو استغنا اور
تصوف سے شغف تھا وہ تایا جی کا ورثہ ہے۔ علم اور علم کی ترویج و تحقیق میں اس کے والد محترم کا کردار
اس کے لئے مشعل راہ بنا ہے۔ باقی تینوں کردار بھی فی الواقعہ بڑے کردار ہیں۔

بابا غفور والا حصہ قصہ معلوم دیتا ہے مگر درحقیقت مستجاب الدعوات شخصیتوں کا بیان ہے جو عام
انسانوں کے روپ میں معاشرہ میں موجود ہوتے ہیں لوگ انہیں معمولی جان کر ان کی قدر نہیں
کرتے۔ یہ رویہ دنیاداروں کا عام رویہ ہے مگر معاشرے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان لوگوں کی
کھوج میں نکل پڑتے ہیں اور تلاش کر لیتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے حفیظ صدیقی اشفاق احمد سے متاثر
ہے اور اگر بابا غفور پر حفیظ کا نام نہ لکھا ہو تو اسے اشفاق احمد کا افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ زندگی کے بارے
میں یہ رویہ قدرت اللہ شہاب کا تھا اشفاق احمد کا تھا ممتاز مفتی کا تھا۔ مجھے شبہ ہے حفیظ صدیقی انہی
لوگوں کا نام لیوا اور پانی دیوا ہے۔ اس کے تایا کا حال کھلنا اور ابا کا علم کی دولت بے دریغ لٹانا، دونوں
اس کو ورثہ میں ملے ہیں اس نے ان بزرگوں کے نام پر انہیں بیان کر دیا ہے۔ حفیظ کی شخصیت کا یہ پہلو
کئی اور مقامات پر بھی کھل کر سامنے آتا ہے مگر اس کے تجزیہ کا یہ محل نہیں۔
حفیظ صدیقی نے ایک جگہ سرسید کے مجرے دیکھنے کا ذکر کیا ہے (یادوں کی دھول صفحہ ۸۹) یہ

بے سروپا بات شورش کاشمیری کی کتاب ''اس بازار میں'' کے حوالہ سے ہمارے ادب میں چلی ہے مگر
مولانا عبدالماجد دریابادی نے سختی سے اس بات کی تردید کی ہے کہ سرسید سے ایسی لغو حرکت سرزد ہوئی
ہو۔

حفیظ صدیقی کے ہاں بی بی جی ایک ایسا کردار ہے جو بچیوں کو پڑھاتی لکھاتی انہیں گھر گرہستی
سکھاتی اور ان کی شادیاں کر کے اپنی عاقبت سنوارتی ہے۔ بچیوں کے جہیز کے لئے وہ مختلف لوگوں
سے مختلف چیزیں تحفے میں اکٹھا کرتی ہیں۔ ایک بچی کے جہیز کا ذکر ہے اس کے لئے وہ ایک آدمی
سے کہتی ہیں ''شوکت مجھے ایک بہشتی زیور کی ضرورت ہے حلال کی آمدنی سے خریدنا'' (صفحہ ۴۶)۔
ہمارے ہاں بچیوں کو یہ کتاب جہیز میں دی جاتی تھی۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی مرتب کردہ یہ کتاب
بچیوں کی گھر گرہستی کی زندگی کی رہنما سمجھی جاتی تھی۔ وقت بدل گیا ہے اب لوگ ایسی کتابیں جہیز میں
دینا روا نہیں جانتے کیونکہ تہذیب و ترقی کے نام پر معاشرہ میں بہت تبدیلی آ چکی ہے۔ ابھی پچھلے
دنوں یہاں ٹورنٹو میں ہمارے دوست پروفیسر شمیم احمد کی کتابوں کی دکان سے کسی شخص نے بہشتی زیور کا
تلخیص شدہ انگریزی ترجمہ خریدا۔ اس میں بعض مقامات پر ایسی باتیں موجود ہیں جو موجودہ زمانے کی
خواتین کو بہت کھلتی ہیں۔ یہ کتاب کسی آزاد خیال مگر تنگ ذہن مبصر کے ہتھے چڑھ گئی اس نے ایسا
زہریلا تبصرہ لکھا اور لاکھوں میں چھپنے والے اخبار کے پہلے صفحے پر چھاپ دیا جس سے اسلامی
احکامات کی تخفیف و تضحیک کا پہلو نکلتا تھا۔ اس نے اسلامی تعلیمات کی ایسی گھناؤنی تصویر ایسے طریق
پر پیش کی کہ گویا اسلام خواتین پر صرف ظلم و ستم ہی روا رکھتا ہے۔ سرخیاں بھی ایسی لگائیں کہ یہ کتاب
سکھاتی ہے کہ عورتوں کو کس طرح بدنی سزا دی جائے اور کس طرح اور کتنی ایذا دی جائے حالانکہ جو
احکامات بیان ہوئے ہیں وہ بیّنہ فحاشی کی سزا کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اس معاشرہ میں تو اسلام کے
خلاف انہیں کوئی بہانہ ہی چاہیئے ہوتا ہے ریڈیو ٹی وی پر ایک طوفان آ گیا جو بہت دنوں کے بعد جا کے
تھما ہے۔ درست کہ جب یہ کتاب تالیف و مرتب ہوئی اس وقت ہمارے معاشرے میں ایسی باتوں کا
رواج تھا اب وقت بدلنے کے ساتھ حالات بدل گئے ہیں کتاب کے مؤلف تو زندہ نہیں۔ کیا سب
پرانی کتابوں کو جن میں آپ کے نزدیک کوئی قابل اعتراض مواد موجود ہے دریا برد کر دینا چاہیئے؟

افسوس اس بات کا ہوا کہ ہمارے اپنے نام نہاد آزاد خیال لوگ بھی انہی کی سی ہانکنے لگے اور اسلام کے خلاف خوب اپنا بغض نکالا۔

اس کتاب میں بعض ایسی شخصیتیں (میں تو انہیں کردار ہی کہتا ہوں کیونکہ اسلوب افسانے کا ہے) جو خوب ہیں بابا دودا ہے جو ایک برخود غلط مولوی کو راہ راست پر لے آتا ہے (صفحہ ۱۴۹) پینو ہے جوان پڑھ ہے مگر اپنے پردیسی شوہر کو خط لکھواتی ہے (صفحہ ۱۹۸) وہ ہونق کسان ہے جوان کے اجداد کا عرب سے آنے کا سن کر کہتا ہے ''تسیں مراثی ہوندے ہو'' (صفحہ ۲۵۴) یعنی آپ لوگ میراثی ہیں۔ خود حفیظ صاحب ہیں جو لڑکپن سے جادو ٹونے میں یقین نہیں رکھتے مگر ۴۸ سال کے ہو گئے ہیں تو جادوگر سے رجوع ہو رہے ہیں (صفحہ ۲۷۴)

ہمیں تو ان کے رفیق کار پروفیسر اور حافظ کا وہ سانحہ یاد آ رہا ہے جس کی بنیاد کتابت کی غلطی پر تھی۔ حافظ صاحب نے میوزیکل چیئرز کے مقابلہ میں انعام حاصل کیا۔ اخبار والوں نے میوزیکل چیئرز کا لفظی ترجمہ ''گانے والی کرسیاں'' کیا کاتب نے یہ سوچ کر کہ کرسیاں تو گا نہیں سکتیں یہ گانے والی لڑکیاں ہوں گی چنانچہ اخبار میں چھپ گیا کہ حافظ صاحب مدظلہ، نے گانے والی لڑکیوں کے مقابلہ میں اول انعام حاصل کیا ہے۔ حفیظ صاحب تو ۲۰۰۶ میں راہیء بقا ہوئے خدا معلوم حافظ صاحب کا اب کیا حال ہے؟ اور گانے والی کرسیوں سے ان کے تعلقات اب کیسے ہیں؟

ایک پرانے دوست کی خودنوشت سے جو حظ اٹھانا چاہیئے تھا وہ ہم اٹھا نہیں سکے کیونکہ خودنوشت کے لئے افسانوی اسلوب کوئی اچھا تجربہ ثابت نہیں ہوا۔ اگر تو ان کا مقصد اخفائے حال تھا تو وہ کامیاب رہے ہیں اور غالب کا دوسرا مصرعہ یہی کہتا ہے نا۔ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے!

بند گلی میں شام

ڈاکٹر توصیف تبسم کی یادداشتیں ''بند گلی میں شام'' کے عنوان سے عکاس پبلیکیشنز اسلام آباد والوں کی جانب سے ۲۰۱۰ میں چھپی تھیں ان کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد توصیف نے میری فرمائش پر امریکہ سے یہ کتاب مجھے بھیجی ہے میں ان کا شکر گذار ہوں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی یادداشتی ادب کی ایسی کتابوں کو جن میں کوئی ترتیب موجود نہ ہو اپنے تبصروں میں کشکول کا نام دیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اپنی یادداشتیں لکھنے والا اگر تاریخی یا واقعاتی ترتیب کو ملحوظ نہ رکھے تو اس کی حیثیت اس کشکول کی سی ہو جاتی ہے جس میں جگہ بجگہ سے وقتاً فوقتاً ملنے والا مواد یکجا ہوتا جاتا ہے اور مصنف مرتب کر کے انہیں دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یوں بھی یادداشتی ادب میں خودنوشت سوانح عمری کو مشکل صنف قرار دیا جاتا ہے کیونکہ زندگی کی بازیافت و بازگشت درحقیقت اپنے آپ کو دوبارہ دریافت کرنے کا عمل ہے جس میں بڑی دقت یہ ہے کہ وقت لوٹ کر نہیں آتا صرف یادیں لوٹائی جا سکتی ہیں جو وقت کے ملبے تلے دبی رہنے کی وجہ سے کبھی مکمل صورت میں بازیاب نہیں ہوتیں۔

اردو میں خودنوشت نگاری کا ان دنوں بہت چرچا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ خودنوشتیں لکھ رہے ہیں مگر ایک رجحان عام ہے کہ لوگ اپنی جان پہچان اور ان کی جان پہچان کے لوگوں کے احوال کو بھی اپنا احوال جان کر اپنی خودنوشت کا حصہ بنا دیتے ہیں ایسی خودنوشتیں طویل اور بے رنگ ہو جاتی ہیں۔ خودنوشت نگاری کے فن میں یادوں کی مکمل بازگشت کو بھی سقم کہا گیا ہے جس طرح ہر بات گفتنی نہیں ہوتی اسی طرح ہر یاد بیان کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اس کا علاج اپنی دانست میں لوگوں نے یہ تلاش کیا

ہے کہ اپنے احوال میں احوال دیگراں شامل کر دیتے ہیں۔ درست کہ انسان کے احباب اس کی زندگی کے میلانات رجحانات اور نظریات کے گواہ اور عکاس ہوتے ہیں مگر کیا ضرور ہے کہ ان کے احوال کے بیان کو احوالِ خود کا وسیلہ بنالیا جائے؟ احوال الرجال ایک حد تک روا اور لازم ہے حد سے بڑھ جائے تو خودنوشت لکھنے والے کی ذات پردہ ٔاخفا میں چلی جاتی ہے۔ اور ایسے احباب کے احوال کا بیان جسے مصنف نے دیکھا بھی نہ ہو محض شنید کے بل بوتے پر ان کو اپنی خودنوشت کا حصہ بنالینا کیسے روا ہوسکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو ادب کے دو اساتذہ کی خودنوشتیں حال ہی میں چھپی ہیں اور دونوں ہی اس عیب سے مملو ہیں۔ حسن عسکری کاظمی کی خودنوشت حاصل عمر گریزاں اور اب یہ توصیف تبسم کی بند گلی میں شام۔ یہ خودنوشت تو کشکول سے بھی کہیں آگے بڑھ گئی ہے۔ میں اسے توصیف تبسم کی زنبیل قرار دیتا ہوں جس میں ان کی زندگی کے واقعات وحالات کے ساتھ ساتھ ان کے دوستوں یاروں بزرگوں کی باتیں ان کے چٹکلے ان کی شاعری ان کی تنقیدات ان کا کھانا پینا ان کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب کچھ اکٹھا ہوگیا ہے یہ خودنوشت توصیف تبسم کی خودنوشت نہیں پشاور واہ راولپنڈی کراچی جہاں جہاں وہ رہے ہیں وہاں کے شاعر رفقاء کے احوال کا بیان ہے حتیٰ کہ توصیف تبسم کے احوال کو جاننے کے لئے بھی دوسروں کی لکھی ہوئی باتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے مثلاً شوکت واسطی کی خودنوشت کا حوالہ (بند گلی میں شام صفحہ ۴۶) یا توصیف علوی کا حوالہ (صفحہ ۱۸۴) ان کے ہم عمروں اور ساتھیوں کا ذکر تو لازم ہے احمد فراز کا ذکر کہ اس کا پہلا تخلص ''شرر برقی تھا'' (صفحہ ۷۹)، محسن احسان کا اصل نام احسان الٰہی ہے (ایضاً)، شاہد نصیر، وغیرہم تو بجا مگر ان کے دوست معراج خالد اور ان کے تیرہ صفحات پر مشتمل خطوط کا کیا جواز تھا؟ (صفحہ ۸۴ تا ۹۷) پروفیسر کرار حسین کا ذکر خیر (صفحہ ۱۱۷) تو ہوا یہ ماہر افغانی اور گورنر جنرل غلام محمد کی ''خام خیالی'' کی دوستی (صفحہ ۹۱۱) یہ ان کی خودنوشت کا حصہ کیسے بن گئی؟ نشور واحدی صاحب کو تو انہوں نے دیکھا تک نہیں ان کی شاعری اور ترنم پر دو صفحے (صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۵) لکھ ڈالے ہیں۔ قبلہ سید ضمیر جعفری صاحب کے احوال میں سات صفحے (صفحہ ۱۵۱ تا ۱۵۸) یہ تو معمولی مثالیں ہیں۔ پھر یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ ٹیگور کو نوبل پرائز سویڈن کے اس وقت کے ولیعہد ولیم کی سفارش پر دیا گیا تھا (صفحہ ۱۹۸) درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!

جہاں تک فراز کے چٹکلوں کا تعلق ہے ان میں سے بیشتر سنے سنائے ہیں۔ ضیا جالندھری کے باب میں ان کی بیان کردہ بات کہ وہ شاعروں سے نہیں ملتے تھے کشور ناہید کا بیان کیا ہوا واقعہ ہے کہ سرمد صہبائی ان کے کمرے میں چلا گیا تو ضیا جالندھری نے کہا ضیا جالندھری نہیں ضیا نثار احمد ایم ڈی مقرر ہوا ہے (شناسائیاں رسوائیاں۔ صفحہ ۱۱۵) ''تا مرد سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد'' میں تحریف والا واقعہ آب حیات میں مذکور ہے مگر آپ نے اپنے کسی دوست سے منسوب کر کے اپنی خودنوشت میں درج کر دیا ہے (صفحہ ۲۳۵) عبدالمجید سالک کے مشہور عالم مطائبات بھی بہ روایت خود درج ہیں (صفحہ ۳۱۵) نواب جعفر علی خاں اثر کے بارے میں مجاز کا لطیفہ کہ ''ایک ایٹم بم ہیروشیما پر گرا تھا اثر صاحب والا بم ہما شما پر گرا ہے'' (صفحہ ۲۸۵) بھی ماخوذ ہے۔ یہ لطیفہ پروفیسر غوث انصاری فرنگی محلی کی خودنوشت ''عمر رفتہ'' میں مذکور ہے اور سلام مچھلی شہری کے بارے میں ہے (عمر رفتہ صفحہ ۱۰۳) حیدر آباد کے جسٹس نظام الدین حسن کی خودداری اور انصاف کے واقعات دوسروں سے اخذ کردہ ہیں (صفحہ ۱۳۸) نذیر شیخ کی لمرک کے نمونے درج ہیں کیا ان کا ان کی خودنوشت سے کوئی تعلق ہے؟ (صفحہ ۱۶۴) پروفیسر منظور حسین شور کی بدحواسی تو ضرب المثل تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے سید کرامت حسین جعفری پر ان کی طویل ہجو (۲۵۷ تا ۲۷۰)

تیرہ صفحات میں تاریخ میں محفوظ کرنے کی غرض سے درج کر دی ہے۔ ان کی بدحواسی کا ذکر انہی دنوں ہم نے ایک علیگ کی زبانی بھی پڑھا ہے پروفیسر آل احمد سرور روایت کرتے ہیں ''منظور حسین شور فارسی میں ایم اے کر رہے تھے۔ جب ایم اے فائینل کا امتحان ہوا تو اسٹریچی ہال میں ایم اے کے ساتھ بی اے کے طلباء کی سیٹیں بھی تھیں۔ نگران پرچہ بانٹتے وقت پوچھتے تھے ایم اے کا پرچہ چاہتے ہو یا بی اے کا منظور حسین شور کو ایم اے کی بجائے بی اے کا پرچہ دے دیا گیا۔ ان حضرت نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ پرچہ پر بی اے لکھا ہوا ہے جب تین گھنٹے بعد امتحان ختم ہوا تو باہر نکلے۔۔۔ پتہ چلا منظور حسین شور صاحب بی اے کا پرچہ دے کر چلے آئے تھے۔ گھبرا کر اندر گئے ان کی خوش قسمتی کہ ڈاکٹر ہادی حسن صدر شعبہ فارسی ہیڈ نگران تھے۔ انہوں نے اپنی رام کہانی سنائی اس وقت کاپیاں یکجا کی جارہی تھیں۔ ہادی صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑا ایک کونے میں ایک سیٹ پر بٹھا دیا دوسرے

نگرانوں سے کہا آپ جایئے ان کا نگراں میں ہوں۔ چنانچہ پورے ہال میں ایک امیدوار منظور حسین شور اور ان کے نگران ڈاکٹر ہادی حسن پورے تین گھنٹے بیٹھے رہے منظور حسین اچھے طالب علم تھے چنانچہ ان کی فرسٹ کلاس آئی۔'' (زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی: علی گڑھ کی یادیں'' از فیاض رفعت صفحہ ۱۵۷) اور تو اور اشک رام پوری سے مولوی عزیز الحق صاحب کی سنی سنائی داستان درج فرمادی ہے (صفحہ ۱۳۴) تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

میں نے ان باتوں کی بنیاد پر جناب ڈاکٹر توصیف تبسم کی خودنوشت کو ان کی زنبیل کہا ہے مگر یہ بات کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ ان کا انداز بیان صاف ستھرا اور زبان شستہ ورفتہ ہے۔ چٹکلوں اور لطیف باتوں کے باوجود کہیں کوئی سبک بات نظر نہیں آتی۔ دوستوں کی بے تکلفی میں بھی ایک رکھ رکھاؤ کا احساس نمایاں رہتا ہے۔ آپ نے کسی دوست کو اس کے جائز ادبی حق سے محروم نہیں رکھا۔ البتہ اپنے استاد صفی حیدر دانش پر ان کی تنقید غیر مناسب دکھائی دیتی ہے۔ (صفحہ ۲۱۳)

جناب محمد احمد سبزواری نے پشاور لاہور راولپنڈی کراچی اور واہ میں رہنے کے باوجود اپنی زبان کی لطافت کو قائم رکھا ہے زندگی میں تیسرے درجے کی ملازمت بھی کی ہے مگر اپنے اندر کے ادبی آدمی کو مرنے یا خفتہ نہیں ہونے دیا نہ اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا کوئی موقعہ ضائع کیا ہے۔ گارڈن کالج سے ایم کیا اور پھر ڈاکٹریٹ بھی کی ادب پڑھاتے بھی رہے ادیبوں سے تعلق استوار رکھا۔ اللہ ان کی زندگی میں برکت دے ان کے ذوقِ سلیم کو جلا دیتا رہے۔ اپنے رفقاء ریاض مجید انور محمود خالد اور ریاض احمد ریاض کا ذکر ہمیں بہت خوش آیا۔

❁

فرشتے کی ایف آئی آر

جناب ادریس احمد آفتاب کی عجیب وغریب عنوان والی خودنوشت ''فرشتے کی ایف آئی آر'' اسی ہفتہ مجھ تک پہنچی ہے۔ ساڑھے چار سو صفحے کی دبیز کاغذ پر چھپی ہوئی دبیز تر ٹائیٹل والی یہ کتاب ساگر پبلی کیشنز، ٹیمپل روڈ لاہور کی جانب سے ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ مصنف نے اسے آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسین امتزاج قرار دیا ہے مگر یہ روداد انسانوں کی روداد سے آگے گذر کر جنوں اور غیر مرئی مخلوقات تک کو محیط ہے۔ مافوق الفطری وقوعات کو مصنف نے اپنے تجربات کی کٹھالی میں ڈھال کر یوں پیش کیا ہے کہ وہ روزمرہ کے واقعات معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اپنے بیان کردہ واقعات کے استناد کی خاطر صفحہ ۳۰۰ سے ۳۱۲ تک آپ نے قرآنِ حکیم سورۃ جن کا مکمل ترجمہ اور ساتھ میں کچھ طلسماتی نقش اور تعویذ بھی درج فرمادئے ہیں اور اپنے قارئین کو متنبہ فرمایا ہے کہ ''بعض لوگ تو دین اسلام کو بھی عقلی دلائل سے پرکھتے ہیں جن کی شرعی طور سے سخت ممانعت ہے'' (فرشتے کی ایف آئی آر صفحہ ۲۹۹) خدا معلوم ان کے پاس دین اسلام کو عقلی دلائل پر نہ پرکھنے کا کون سا شرعی جواز ہے؟ حالانکہ جتنا زور قرآن حکیم نے تدبر، تفکر اور تعقل پر دیا ہے کسی اور دین نے ایسا نہیں کیا۔ اَفَلاتعقِلون؟۔ ان کی عربی دانی کا اپنا عالم یہ ہے کہ عربی کا ایک مقولہ کُلَ قلیلً فِتنتہ اِلا عَلی بیان کرتے ہوئے 'کُل'' کو بھی ''قُل'' ہی لکھا ہے (صفحہ ۱۰۴)

آئی اے آفتاب ایک ایماندار پولیس افسر کے صاحبزادے ہیں مگران کے برادرِ اکبر قدیر احمد میں وہ تمام برائیاں اور خرابیاں موجود ہیں جن کا استیصال پولیس افسروں کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ اس کو ''جُوا کھیلنے اور دیگر بری عادتوں سے فرصت نہ تھی انتہا یہ تھی کہ مدعی ہو یا ملزم ہو جہاں داؤ لگتا یہ ان سے کسی نہ کسی طرح رقم ٹھگ لیتا تھانے کا منشی اور دیگر عملہ بھی بعض اوقات اس کے ساتھ ملے

ہوتے تھے۔۔۔ایک بار ایسا بھی ہوا کہ ان کی کوئی بڑی شکایت والد محترم کے علم میں لائی گئی غالباً والد محترم کے نام پر کسی ملزم سے جو کہ بہت بڑا زمیندار تھا مگر رسہ گیر بھی تھا رقم وغیرہ لے لی گئی'' (صفحہ ۶۹) پھر ایک اور مقام پر اس کا کچا چٹھا درج ہے (صفحہ ۸۵) مگر بیٹے کا وجود درمیان میں تھا اس لئے پولیس افسر صاحب کی ساری دیانت دھری رہ گئی اور بیٹے سے ویسی باز پرس نہ کی گئی جیسی کرنے کا حق تھا۔ پھر چھوٹا بیٹا اس کی نگرانی اور تحویل میں دے دیا گیا جس سے بڑے بھائی نے وہ ظالمانہ انتقام لیا کہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں بھائی نے اسے عادی مجرموں کی طرح نہ صرف حبس میں رکھا بلکہ اس کو پابند سلاسل بھی رکھا مگر والد صاحب پھر بھی بڑے بھائی کی طرف داری ہی کرتے پائے گئے۔ (صفحہ ۹۱) جو تکلیف دہ حالات ادریس صاحب نے بیان کئے ہیں اگر وہ کلیتہً سچ ہیں تو بڑے بھائی کے برادر یوسف ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا مگر ساتھ ہی والد صاحب کے حقوق اولاد سے ظالمانہ اغماض میں بھی کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ والد صاحب کی دیانت داری اور حق گوئی و بے باکی اور قانون کی پابندی کے جو چرچے صاحب کتاب نے کئے ہیں ان کی صحت معرض اعتراض میں آ پڑتی ہے۔ آخر ایک موقعہ پر بیٹے کی زبان پر باپ کی شکایت آ ہی جاتی ہے کہ'' والد صاحب نے ساری عمر ڈکٹیٹر شپ ہی کی تھی'' (صفحہ ۱۳۲) اور والد صاحب کی رائے ان کے باب میں یہ ہے کہ'' لڑکا آگ کا گولہ ہے'' (صفحہ ۲۷۴)۔ اس کتاب میں بڑے بھائی سمیت بہت سے لوگوں کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی ہے جن میں ضیاء الحق جیسا ظالم ڈکٹیٹر بھی شامل ہے مگر باپ کے خلاف کوئی ایف آئی آر درج نہیں ''ضمنیاں'' تو بہت ہیں فی الحقیقت یہ ساری کتاب ہی ضمنیوں سے بھری پڑی ہے۔ ضروری غیر ضروری تفصیلات کی بھرمار۔ پہلے پچاس صفحے تو بہاولپور کی تاریخ اور اپنے قبائلی پس منظر پر ہیں پھر بھائی کی قید اور اس سے فرار کی داستان۔ مرحوم استاد کی دستگیری۔ پیرا سائیکالوجی سے متعلق واقعات اور جانے کیا کیا کچھ۔ اپنے MFCP یعنی میٹرک فیل کمپاؤنڈری پاس (صفحہ ۱۳۶) ڈاکٹر بھائی کی قید میں رہتے اور رہائی کی کوششیں کرتے ہوئے ان کی عمر عزیز کے سولہ سترہ سال ضائع ہوئے ہیں۔ (صفحہ ۱۵۷)

''فرشتہ کی ایف آئی آر'' نام کا باب تو صفحہ ۱۸۶ سے شروع ہوتا ہے مگر یہ بات محسوس ہو جاتی ہے کہ مصنف کا مطالعہ جاسوسی ناولوں یا ڈائجسٹوں میں چھپنے والی بہادری کی کہانیوں سے آگے نہیں

گیا۔ ہاں شعر و ادب سے تعلق ضرور ہے شعروں کا حوالہ جہاں تہاں موجود ہے اکثر شعر غلط اور بے وزن درج ہیں۔ اور تو اور اختر شیرانی کا ایک خود ساختہ شعر بھی کتاب کی زینت ہے ''پولیس کے جوان نے جو بس روک لی ہے۔ نہ بس چل رہا ہے نہ بس چل رہی ہے'' (صفحہ ۱۷۲)۔

ہمیں کتاب موصول ہونے سے قبل ان کی ایک ای میل موصول ہوئی تھی کہ کراچی کے انجینیئر راشد اشرف صاحب کے کہنے پر اپنی بیٹی کے ہاتھ اپنی خود نوشت آپ کو بھیج رہا ہوں۔ نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھا تھا۔ اپنے مہربان زاہد کاظمی کی بھیجی ہوئی کتاب ان کی بھیجی ہوئی کتاب سے ایک دن پہلے ملی۔ اس میں بھی آپ نے اپنے اسم گرامی کے ساتھ ڈاکٹر لکھا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم انہیں ویسا ہی ڈاکٹر سمجھے تھے جیسا ان کے بھائی صاحب ہیں مگر کتاب کے مطالعہ نے یہ معمہ حل کر دیا۔ انگلستان میں ان کی مہربان دوست نصرت جہاں نے ان کی سراغ رسانی پر انہیں داد دیتے ہوئے کہا'' میں آپ کو شاہی بیگمات کے امور میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کرتی ہوں'' (صفحہ ۳۴۶) اور ان شاہی امور کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں اس کے ڈانڈے ان کے کتے کو نہلانے والے کی بیٹی شہزادی جہاں آراء سے شروع ہو کر ملکہ وکٹوریا اور ان کے ہندوستانی ملازم عبدالکریم خاں کے تعلقات سے جا ملتے ہیں۔ اور ڈیوڈ ڈف اور سٹینلے وائین تروب اور روزینا وزرم کی کتابوں کے مستند حوالوں سے ان نظریات کو تقویت دی گئی ہے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ خدا جانے ان امور کا ان کی خود نوشت سے کیا تعلق ہے؟ اتنا تو ظاہر و باہر ہے کہ مصنف کو جاسوسی کہانیاں پڑھنے ہی کا شوق نہیں لکھنے کا بھی شوق ہے۔ ایک شوق انہیں اور بھی ہے وہ ہے سراپا لکھنے کا شوق۔ جہاں کوئی حسین عورت ان کی راہ کاٹتی ہے یہ اس کا سراپا لکھنے بیٹھ جاتے ہیں'' جنی ایک اٹھارہ بیس سال کی نوجوان عورت تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا پیشانی چوڑی بال اس کے بہت خوب صورت تھے کالے سیاہ اور بہت لمبے۔ اگر اس نے بال کھولے ہوں تو محسوس ہوتا تھا کہ جنی کے عقب میں ایک عورت چلی آ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں کٹورہ سی بولتی آنکھیں تھیں مگر بہت خوب صورت اور بڑی بڑی گردن لمبی تھی ہونٹ پتلے پتلے اور کالے سیاہ تھے بالوں کی دو لٹیں اس کے ماتھے کے دونوں طرف انکھیلیاں کرتی نظر آتیں چہرہ گول تھا گالیں بھری بھری تھیں کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے بھی ہوتے قد اس کا کافی

لمبا تھا بالکل سیدھی ہو کر مستانی چال چلتی تھی باقی تمام جسمانی زاویے تیر کمان کی طرح تھے۔۔۔ایسا معلوم ہوتا تھا کالی ہرنی راستہ بھول کر چولستان سے شہر میں داخل ہوگئی ہے'' (صفحہ ۴۷) زخمی حالت میں فرار ہونے پر بھی اپنی تیماردار نرس کا سراپا لکھنے سے نہیں چوکے (صفحہ ۱۵۳) یہی سراپا نگاری ان کی شہزادی جہاں آراء کے بیان میں بھی ہے۔ (صفحہ ۲۲۷) اس کا مطلب ہے کہ تمام تر مصیبتوں کے باوجود ان کے اندر کا رومان پرور آدمی غفلت کی نیند نہیں سویا۔

اپنے ملک میں رشوت ستانی، مال و دولت کی لوٹ مار، بے غیرتی اور بے حیائی کے خلاف ان کی ایف آئی آر بہت لوگوں کے خلاف کٹی ہے۔ ''اعجاز الحق اور ہمایوں اختر اپنے باپوں کے مجاور ہیں'' (صفحہ ۲۵٦) یحیٰی خاں کے سکینڈلز کا بیان ہے (صفحہ ۳٦۷) حکمرانوں کی عیاشیوں کی تفصیلات دوسروں کی کتابوں کے حوالے سے بیان ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کی تفصیل کتابیات میں درج ہے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ یک گونا ہمدردی ہے اور ان کے احمدیوں کے نوے سالہ مسئلہ کو حل کرنے پر انہیں فخر بھی بہت ہے مگر ان کا بیان غلطیوں سے پر اور حقائق کے منافی ہے۔ لکھتے ہیں ''قادیانیوں کے اس وقت کے مذہبی پیشوا مرزا محمود احمد (جن پر جرح بھی کی گئی) کو پارلیمنٹ کی چار دیواری کے اندر صاحبزادہ فاروق علی خاں اسپیکر قومی اسمبلی کی زیر صدارت سنا گیا'' (صفحہ ۳۷۰)۔ احمدیوں کے سربراہ اس وقت مرزا ناصر احمد تھے مرزا محمود احمد تو ۱۹٦۵ میں انتقال کر چکے تھے۔ قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں مرزا ناصر احمد پیش ہوئے تھے۔ ان پر جرح اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار صاحب نے کی تھی۔ آگے جو بات آپ نے لکھی ہے وہ پہلی سے بھی زیادہ بے سروپا ہے۔ اٹارنی جنرل نے سوال کیا ''جو لوگ مرزا غلام احمد کو نہیں مانتے ان کے متعلق آپ لوگوں کا کیا عقیدہ ہے؟'' مرزا محمود احمد نے جواب دیا ''ہم انہیں کافر سمجھتے ہیں''۔ اٹارنی جنرل نے ذوالفقار علی بھٹو کی طرف دیکھا جنہوں نے کہا میں سمجھ گیا ہوں'' (صفحہ ۳۷۱) اب تو اس کمیٹی کی کارروائی چھپ کر سامنے آ گئی ہے اس میں کہیں کوئی ایسا جواب درج نہیں جو مرزا صاحب سے منسوب کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ بات بھی ان کی تردید کو کافی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک بار بھی سپیشل کمیٹی میں جرح کے دوران اسمبلی میں نہیں آئے چہ جائیکہ اٹارنی جنرل نے ان کی طرف دیکھا ہو اور انہوں نے کہا ہو میں سمجھ گیا ہوں در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟ آپ نے ایک اور انکشاف بھی

فرمایا ہے ''لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس کے ایم اے صمدانی نے حکومت کی ہدایت پر پاکستان میں قادیانیوں کے ہیڈ کوارٹرز واقع ربوہ ضلع جھنگ اور وہاں قائم شدہ قبرستان کا ملاحظہ و معائنہ کر کے اپنی رپورٹ معہ تصاویر قبرستان پیش کی'' (صفحہ ۳۷۰) جسٹس صمدانی نے اپنی خودنوشت جائزہ میں لکھا ہے ''انکوائیری کا تعلق اس واقعہ سے تھا جو ربوہ ریلوے سٹیشن پر پیش آیا تھا''۔۔۔۔ جسٹس صمدانی ربوہ تشریف لائے بہت سی جگہوں کا معائنہ فرمایا اور اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی مگر حکومت نے اس رپورٹ کو شائع نہیں کیا۔۔۔ ''جب انکوائری مکمل ہوگئی اور حکومت پنجاب کو رپورٹ دے دی گئی تو وہ رپورٹ عوام کے لئے شائع نہیں کی گئی؟ کیوں؟ کیا عوام کو انکوائیری کا نتیجہ جاننے کا حق نہیں ہے۔۔۔'' (جائزہ صفحہ ٦۹۔۷۰)۔ ادریس صاحب نے قبرستان یا قبرستان کی تصاویر کا جو ذکر فرمایا ہے وہ محض ان کی پرانی داستان طرازی کی عادت کا شاخسانہ ہے جس کا انکوائری سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے جسے۔ بڑھا لیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے۔

ایک بات ہم ان کے علم میں اضافے کے لئے عرض کئے دیتے ہیں کہ حکومت نے عدالت عالیہ کے حکم پر ۱۹۷۴ کی سپیشل کمیٹی کی روداد اکیس جلدوں میں شائع کر دی ہے اور حکومت کی دیانت اور امانت داری کا یہ عالم ہے کہ جماعت احمدیہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد کا بیان جو کارروائی کا حصہ تھا اس روداد میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ کیا ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب صاحب اس ناانصافی کے خلاف بھی کوئی ایف آئی آر درج کروائیں گے؟

بہر طور یہ طول طویل بوجھل آپ بیتی فنی لحاظ سے اچھی خودنوشتوں میں جگہ نہیں پائے گی ہاں جگ بیتی میں دلچسپی رکھنے والوں کو اس میں تلاش بسیار اور صبر آزما مطالعہ کے بعد شاید کچھ چیزیں دلچسپی کی بھی مل جائیں۔

کتاب کا سرورق ان کی ٹورنٹو میں مقیم بیٹی نوشین عثمان فاروق نے بنایا ہے اور خوب ہے۔ بے انت صحرا میں بھٹکتا ہوا ایک تنہا آدمی۔ بیٹی کا ڈیزائن کیا ہوا ٹائیٹل ابا کی کتاب سے کہیں زیادہ بلیغ ہے۔

یادوں کی تسبیح

اسلامی جمعیت طلبہ، جماعت اسلامی اور بعد کو تنظیم اسلامی کے سرگرم تحریکی کارکن جناب قاضی عبدالقادر کی خودنوشت ''یادوں کی تسبیح'' کے عنوان سے نشریات اردو بازار لاہور کی جانب سے چھپی ہے۔ میرے پیش نظر اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جو اکتوبر ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔

قاضی عبدالقادر، انتظار حسین کے وطن مالوف ڈبائی کے رہنے والے ہیں۔ بارشوں سے اتنے دل تنگ تھے کہ ''خدا سے دعا مانگی کہ وہاں لے چل جہاں بارش کم ہو۔ قدرت انہیں کراچی لے آئی'' (یادوں کی تسبیح صفحہ ۲۸)۔ ڈبائی میں ان کے والد خاصے خوش حال تھے زمینیں تھیں بے فکری سے دن گذرتے تھے مگر ہجرت کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ جانا پڑا کراچی میں بڑی عسرت اور تنگ دستی سے دو چار رہے مگر اللہ پر توکل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ صبر شکر کے ساتھ اپنے وسائل میں رہ کر زندگی کرتے رہے۔ ابتدائے عمر سے دین سے رغبت تھی اس لئے ڈبائی میں بھی دینی جماعتوں سے تعلق استوار رکھا۔ کراچی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک ہوئے اور دامے درمے قدمے سخنے ان کی ''جنگی سرگرمیوں'' (صفحہ ۱۴۱) میں سرگرمی سے شریک رہے اور ''مخالفوں کے ورائیٹی پروگرام کو درہم برہم کرتے رہے'' (صفحہ ۲۸۳) یہی فعال شراکت بعد کو انہیں تحریک اسلامی کے متفق اور پھر رکن بن جانے کے مراحل تک لے آئی۔ تحریک اسلامی کے فعال رکن رہے پھر ۱۹۷۳ میں ڈاکٹر اسرار احمد کی تنظیم اسلامی کے رکن بنے (صفحہ ۳۳۲) اور ڈاکٹر صاحب کے حین حیات اس سے وابستہ رہے۔ یہ روداد ۱۹۸۳ تک کے واقعات کو محیط ہے (صفحہ ۴۹۳)۔

ہم نے تحریک اسلامی کے بعض جید ارکان خرم جاہ مراد صاحب اور عبدالکریم عابد صاحب کی خود

نوشتوں کا مطالعہ کیا ہوا ہے مگر اس خودنوشت میں ان دونوں خودنوشتوں سے زیادہ صاف گوئی اور خلوص دکھائی دیا ہے۔ قاضی صاحب نے جماعت یا تحریک کے رہنماؤں سے اپنے اختلاف رائے کو ملائم لفظوں میں لپیٹ کر پیش کرنے کی بجائے صاف اور سیدھے انداز میں بات کہہ دی ہے اور کہیں یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ لکھنے والا ناراض کن بے باکی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ''تحریک میں سب چھوٹے بڑے کام کرتے تھے پھر درجہ بندی ہونے لگی'' (صفحہ ۱۱۸) تو یہ بددل ہوئے۔ ''تحریک اسلامی کے ہمہ وقتی کارکن سکیلوں اور گریڈوں کے لئے کام کرنے لگے'' (صفحہ ۲۳۸) تو ان کا دل دکھا۔ ایک وقت تھا کہ انہیں کہا گیا ''تحریک کی انتخابی مہم جہاد کی مانند ہے اس لئے اعتکاف ملتوی کردیں'' (صفحہ ۲۸۵) تو انہیں کوئی تردد نہ ہوا۔ حتیٰ کہ محترمہ فاطمہ جناح کی انتخابی مہم میں کام کرتے رہے (صفحہ ۳۱۹)۔ غرض ان کی ساری عمر تحریک اسلامی سے والہانہ وابستگی میں گذری۔ ان کے سامنے ان کے دوسرے ساتھی اپنی تعلیمی قابلیتیں بڑھاتے رہے مگر انہیں خدمت کی ایسی لگن لگا دی کہ انہیں اپنی پڑھائی اور ترقی کی پرواہ نہیں رہی۔ خرم جاہ مراد، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر اسرار احمد یہ سب ان کی جمعیت کے زمانے کے ساتھی ہیں۔ پھر انہیں ایک اور دھچکا لگا ''کہ جماعت کے بڑے جو اقدار اور معیار اپنی تقاریر بیانات اور نصیحتوں میں ہمارے سامنے رکھتے ہیں جب ان کے گھر میں معاملہ پیش ہوتا ہے تو یہ معیار یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں'' (صفحہ ۲۶۶)۔ مزید یوں کہ ''میں مذہبی جماعتوں اور تحریکوں کے ایسے قائدین کو جانتا ہوں جن کے پاس پہلے بمشکل سائیکل ہوا کرتی تھی یا وہ بس میں سفر کیا کرتے تھے یا زیادہ سے زیادہ ۵۰ سی سی ہونڈا موٹر سائیکل چلاتے تھے لیکن رتبہ بلند ہوتے ہوتے اب اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ پجارو یا اس جیسی کسی گاڑی سے کم پر پاؤں ہی نہیں دھرتے اور چلے ہیں اسلامی شریعت نافذ کرنے!'' (صفحہ ۲۵۱)۔ غرض یہ خودنوشت ان کی تحریک اسلامی سے دور ہونے کی روداد نہیں تحریک کے کارکنوں کے عمل کے خلاف ان کے رد عمل کی داستان ہے جس کا جزو اعظم خلوص اور نیک نیتی ہے۔

جماعت اسلامی کے بعد آپ ڈاکٹر اسرار احمد کی انجمن خدام قرآن سے وابستہ ہوئے اس میں ''انہیں صدر کی حین حیات صدارت اور حق استرداد'' سے اتفاق نہ ہوا (صفحہ ۳۸۸) ''تنظیم اسلامی'' میں بیعت کے وقت ایک عہد نامہ رفاقت تنظیم اسلامی لیا جاتا تھا (صفحہ ۴۱۶) ابھی بیعت علی الاعلان

نہیں لی جاتی تھی ڈاکٹر صاحب بعض ارکان سے خفیہ بیعت لیتے تھے کیونکہ بیعت میں مکمل اطاعت کا اعلان کیا جاتا تھا۔ قاضی صاحب نے وضاحت کردی ہے کہ "یہ بیعت دراصل بیعت جہاد تھی نہ کہ بیعت ارشاد" (صفحہ ۴۲۰) پہلی بیعت میں ۳۷ آدمی بیعت ہوئے (صفحہ ۴۲۹) پانچ سال میں بیعت کرنے والوں کی تعداد ۱۰۵ ہوگئی (صفحہ ۴۴۶)۔ بعد کو ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے صاجزادے ڈاکٹر عاکف رشید کو اپنا مرشد و مطاع بنالیا اور خود بھی ان کی بیعت کرلی۔ "ماشاءاللہ الحمدللہ اب دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صاحب امر ہیں باپ تو بیٹے کے لئے پہلے ہی سے تھا اب بیٹا بھی باپ کے لئے امیر تنظیم اسلامی ہونے کی حیثیت سے ہوگیا ہے کہ باپ نے بھی بیٹے کے ہاتھ پر ہماری ہی طرح برضا و رغبت بیعت کی ہوئی ہے اور سمع وطاعت کے پابند ہوگئے ہیں!" (صفحہ ۱۵)

ایک دلچسپ بات کہہ دینے کی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی نے عہد فرمایا تھا کہ آئندہ وہ کسی ایسی شادی میں شرکت نہیں کریں گے جو مسجد میں منعقد نہ ہو اور جس میں لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلایا جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اور قاضی عبدالقادر صاحب جنوبی ہند کے دورہ پر گئے وہاں ایک دوست کی بیٹی کی شادی تھی اس نے ڈاکٹر صاحب اور قاضی صاحب کو شرکت کی دعوت دی جو قبول کرلی گئی۔ "امپیریل ہوٹل میں تقریب ہوئی۔ نکاح پڑھا گیا پھر بہت پر تکلف کھانا کھلایا گیا جو ہم نے بھی کھایا میں (ڈاکٹر صاحب کے عہد کے بارے میں سوچ رہا تھا) کہ یہاں تو نکاح بھی ہوٹل میں ہوا ہے جس میں ہم نے برضا و رغبت شرکت کی ہے اور لڑکی والوں کی طرف سے کھانا بھی ہم نے تناول کیا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب سے کہنے کی تو ہمت نہیں تھی لیکن وہ تاڑ گئے خود ہی کہنے لگے کہ عہد تو میں نے پاکستان کے لئے کیا تھا" (صفحہ ۴۴۲)

اس خودنوشت میں بہت کام کی باتیں ہمیں نظر آئی ہیں۔ اخوان المسلون کے رہنما حسن البنا کی بات کہ میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی "صرف انسان تصنیف کئے ہیں" (صفحہ ۲۳۲) کراچی کی جماعت اسلامی کے امیر غلام محمد صاحب ضرورت کے موقعہ پر اپنے ہاتھوں سے پاخانے صاف کرلینے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے (صفحہ ۲۳۲)۔ ماہر القادری کا ایک شعر "مستی نواز شوخی انداز کافرانہ۔ زلفیں سیاہ گھٹائیں آنکھیں شراب خانہ" لکھ کر فرماتے ہیں بہت بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ شعر مولانا ماہر القادری مرحوم کے ابتدائی دور کا ہے (صفحہ ۴۶)

ہم انہیں بتائے دیتے ہیں کہ مولانا ماہر القادری تو جوانی میں فلموں کے گانے بھی تصنیف فرمایا کرتے تھے۔ فلمی دھن پر یہ گانا انہی کا تصنیف کردہ ہے "لو چمک چمک کر آئی چراغوں والی۔ میرے سونے گھر واڑو لے سکھی دیوالی" (نوشاد کی خودنوشت صفحہ ۵۸)۔ "ایک دوست کے گھر گئے تو ان کے آتش خانہ پر دو تصویریں پہلو بہ پہلو سجی تھیں مولانا مودودی کی اور لینن کی" (صفحہ ۹۴)۔

۱۹۷۱ کے انتخابات میں جماعت کو عبرت ناک شکست ہوئی تو آپ نے اپنا غصہ یوں نکالا کہ "بھ" سے جو الفاظ آتے ہیں وہ ذوق لطیف پر گراں گذرتے ہیں۔ مثلاً بھاشانی، بھٹو، بھارت بھکاری، بھیڑیا، بھالو، بھینسا، بھگوڑا، بھٹہ، بھدا، بھڑوا، بھوت، بھانڈ، بھگدڑ، بھوکا، بھاڑ بھنگڑا بھینگا وغیرہ" (صفحہ ۳۲۴) اگر خدانخواستہ جماعت کو کامیابی مل جاتی تو قاضی صاحب اسمبلی میں "بھاری" اکثریت پر پھولے نہ سماتے! اور یہ جو رفیقانِ تحریک کے لئے آپ نے "خورشید احمد بھائی" "اسرار احمد بھائی" "خرم جاہ مراد بھائی" کے الفاظ برتے ہیں ان کی "بھ" کی کیا حیثیت ہے؟

مولانا مودودی کی حس مزاح کا ایک عمدہ نمونہ ہمیں پہلی بار ان کے ہاں نظر آیا۔ ایک صاحب باقر علی خاں کی دو بیویاں تھیں ایک بار اپنے ایک بچے کو لے کر وہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مولانا نے مسکرا کر پوچھا "یہ کون سی باقر خانی کا کلچہ ہے؟" (صفحہ ۱۵۵)

قاضی صاحب کو لکھنے کی بہت مشق ہے نثر میں روانی ہے جا بجا برمحل شعر بھی استعمال کرتے ہیں مگر ایک موقعہ پر اپنی ایک طویل آزاد نظم درج کرکے قاری کو حیرت میں ڈال دیا ہے (صفحہ ۳۵۰) یہ نظم کتاب میں درج نہ ہوتی تو خودنوشت میں کیا کمی رہ جاتی؟

قاضی صاحب کو اس بات کا بہت خیال رہتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کا لٹریچر نہیں پڑھتے وہ گویا اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہیں (صفحہ ۱۲۸) مگر یہ کہیں بیان کرکے نہیں دیا کہ آں محترم موصوف نے جماعت اسلامی کے علاوہ کس کس کا لٹریچر پڑھ کر حق کو جاننے کی کوشش کی ہے؟ ان جیسے دینی ذوق والے فرد سے تو توقع تھی کہ وہ دوسروں کا لٹریچر نہایت فراخ دلی سے پڑھ کر محاکمہ کریں گے اور حقائق کی تہ تک پہنچنے کی سعیِ بلیغ فرمائیں گے۔

عرض وسماع

میرے دیرینہ کرمفرما جناب راشد اشرف نے کراچی سے برصغیر پاک وہند کے ایک مشہور سابق ریڈیو، ٹی وی نیوز ریڈر اور براڈ کاسٹر سید مظفر حسین، کی خودنوشت ''عرض وسماع'' کمپیوٹر کے ذریعہ منعکس کر کے مجھے بھجوائی ہے۔ یہ خودنوشت جون ۱۹۹۰ میں پہلی بار غالباً کراچی سے چھپی۔ کتاب پر کسی پبلشر کا نام درج نہیں۔ متن سے بھی یہی مترشح ہے کہ مصنف نے بعض دوستوں کے تعاون سے اسے چھاپا ہے اور ''گزشتہ نصف صدی کے آل انڈیا ریڈیو، ریڈیو پاکستان اور لاہور ٹی وی کے پروڈیوسروں ڈرامہ نگاروں اور فنکاروں شاعروں ادیبوں پروفیسروں اور دیگر مشاہیر کی دلچسپ باتیں'' محفوظ کر دی ہیں۔ سید مظفر حسین (جھن میاں) کا تعلق دہلی اور شملہ کے ایک خوشحال تاجر گھرانے سے ہے۔ اپنے شوق سے نشریات کے شعبہ میں داخل ہوئے اور ساری عمر اسی کارِ ''بربادی'' میں برباد کر دی۔ سید مظفر حسین کا پہلا ریڈیو پروگرام ۱۹ ستمبر ۱۹۴۳ کو دہلی سے ہوا (عرض وسماع صفحہ ۲۳) اور اس خانہ بربادی سے آپ ۱۹۸۲ میں سبک دوش ہوئے (صفحہ ۶) گویا یہ داستان چالیس برس کو محیط ہے۔ اقبال کے لاہور کے قریبی رفقاء میں مرزا جلال الدین بیرسٹر کا ذکر جا بجا آتا ہے سید مظفر حسین ان کے نبیرے ہیں۔ کتاب کا عنوان نشریات کی مناسبت سے نہایت مناسب عنوان ہے ''عرض وسماع'' اور مصنف کے صاحب ذوق ہونے کی دلیل مگر متن میں مصنف نے بہت سے مشہور اشعار بھی دوسرے شعراء سے منسوب کر کے خوش ذوقی کا ثبوت نہیں دیا۔ میر کی مشہور عالم غزل ہے ''اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی۔ شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی۔ دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے۔ جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی'' اپنے سید صاحب نے دوسرے شعر کو مومن کا شعر قرار دے

دیا ہے۔ (صفحہ ۲۰۱) اور دو جگہ ''متعصب'' کو ''متعصف'' لکھا ہے (صفحہ ۲۱۶۔ مکرر صفحہ ۲۴۶) ایسی باتوں سے لکھنے والے کی علمی حدود کا پتہ چلتا ہے تس پر آپ ذوالفقار علی بخاری کو صرف میٹرک پاس ہونے کا طعنہ دینے سے نہیں چوکتے۔ (صفحہ ۵۴) بھائی میرے ذوالفقار علی بخاری میٹرک پاس ہی سہی مگر ان کے علمی تبحر میں کسے کلام ہے؟ اردو عربی فارسی زبانوں کی باقاعدہ تحصیل انہوں نے کی تھی ان کے سامنے بڑے بڑوں کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ اگر وہ شملہ میں آپ کے والد گرامی کے خوردوں اور نیاز مندوں میں شامل تھے تو آپ کو ان پر جا و بے جا تنقید کا حق تو نہیں مل جاتا؟ آپ تو ان کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ قائداعظم کے جنازہ کی تین چوتھائی کمنٹری بخاری صاحب نے کی ''وہ اپنی آواز کے جوہر دکھا رہے تھے لیکن قوم کا حوصلہ بڑھانے کی بجائے پوری قوم کے حوصلے پست کرنے پر تلے ہوئے تھے'' (صفحہ ۲۵۱)۔ عین ممکن ہے جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے وہ درست ہو مگر بخاری صاحب کے بارے میں آپ کا پہلا بیان تو یقیناً درست نہیں۔ ۱۸ علی پور روڈ پر کام کرواتے ہوئے بخاری صاحب باغبان سمیت کنوئیں میں گر گئے ادھ موئے ہو کر نکلے'' تو فیلڈن نے انہیں چھ مہینے کے لئے صحت کی بحالی کے لئے آسٹریلیا بھجوا دیا'' (صفحہ ۱۱)۔ سرگزشت میں بخاری صاحب کا اپنا بیان ہے ''پندرہ سولہ دن کے بعد میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔۔۔ میں سلام کے لئے حضرت نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو کے دربار میں حاضر ہوا اور وہاں سے رخصت لے کر فیلڈن کے ساتھ الموڑے پہاڑ پر سادھوؤں کی گپھاؤں میں چلا گیا'' (سرگزشت صفحہ ۵۹)۔ کہاں آسٹریلیا کہاں الموڑہ؟ غرض بخاری صاحب کے باب میں ''جھن میاں'' نے اپنا بخار خوب نکالا ہے اور صفحات ۱۷۹، ۱۸۱، ۲۵۱، اور ۲۷۰ پر ان کا ذکر بانداز دگر موجود ہے۔

یہی حال جناب ن۔ م۔ راشد کا ہے۔ ایک تو آپ ان کے فوجی ہونے سے بہت نالاں تھے دوسرے ن۔ م۔ راشد نے ان کے خلاف ضابطہ کی کوئی کارروائی کی تھی۔ ان کی رائے ہے ''راشد کا دماغ یعنی ذہن بڑا تھا لیکن دل بہت چھوٹا تھا'' (صفحہ ۲۷۳) مگر ساتھ ہی راشد صاحب کی وسعت قلب کا ایک واقعہ بھی لکھ دیا ہے کہ ''راشد نے گورنر جنرل کی خاص اجازت سے انہیں ریڈیو کی شاف کا استعمال کرنے کا اجازت نامہ دلوایا تھا'' (صفحہ ۲۸۴) کیونکہ سید صاحب ''بچپن میں پولیو ہو جانے

کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور تھے اور بیساکھی استعمال کرتے تھے'' (صفحہ ۲۸۳) ریڈیو سے ان کے بچوں کے پروگرام میں راشد کے صاحبزادے شہریار بھی آیا کرتے تھے جو اپنی توتلی زبان میں اپنا نام ''ٹھہر یار'' بتایا کرتے تھے۔ (صفحہ ۲۷۹) راشد کو ان کی وصیت کے مطابق جلایا گیا تھا اس پر سید صاحب نے بہت نوحہ کیا ہے اور شہریار کو بھی مورد الزام ٹھہرایا ہے مگر یہ ساری روداد ساقی فاروقی اپنی کتاب پاپ بیتی میں لکھ چکے ہیں اس لئے تفصیل میں جانے سے حاصل؟ سحاب قزلباش نے اپنی کتاب ''میرا کوئی ماضی نہیں'' میں بھی راشد والے خاکہ میں راشد کے جلائے جانے کا بہت تاسف کیا ہے اور ان کی بیگم کے ساتھ شہریار اور ساقی فاروقی کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ (پس نوشت اور پس پس نوشت صفحہ ۲۶۰)

ن۔م۔راشد کے پشاور کے دو اور رفقاء احمد ندیم قاسمی اور حمید نسیم نے بھی راشد کی طبیعت کا گلہ کیا ہے۔ حمید نسیم تو انہیں از رہ تعریف ہمیشہ ہی کیپٹن راشد کہتے رہے اس وقت ناممکن کی جستجو دستیاب نہیں مگر اتفاق سے احمد ندیم قاسمی صاحب اور راشد صاحب کی جو جھڑپ ہوئی اس کا حوالہ میرے پاس موجود ہے۔ راشد صاحب نے ندیم صاحب کی منہ بولی بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے بارے میں کہہ دیا میں ریڈیو کے لئے لڑکیاں کہاں سے لاؤں؟ ''دو ذہین لڑکیاں تھیں انہیں آپ اغوا کئے بیٹھے ہیں'' ندیم صاحب غصے سے کھڑے ہو گئے اور کمرے سے باہر چلے گئے پانچ سات منٹ بعد واپس آئے کہنے لگے راشد صاحب اگر آپ ن۔م۔راشد نہ ہوتے تو میں اتنے زور سے طمانچہ مارتا کہ آپ کا چہرہ بگڑ جاتا'' (ندیم شناسی صفحہ ۳۷)۔

اس کتاب میں ریڈیو کے بہت سے نامور لوگ موجود ہیں۔ مختار صدیقی کا ذکر خیر ہے (صفحات ۱۹۔مکرر ۶۹ اور ۷۰) محمود نظامی صاحب ہیں (صفحہ ۱۸) راجہ مہدی علی خاں ہیں اور ان کا مصرعہ جنت کی دیوار پہ چڑھ کر میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے (صفحہ ۷۱۔۷۳) شکیل بدایونی ہیں اور ان کے اپنے وطن بدایوں میں فقید المثال استقبال کا حال (صفحہ ۷۵۔۷۷) اختر شیرانی ہیں (صفحہ ۷۹) رفیع پیرزادہ ہیں (صفحہ ۸۵۔۸۹) اخلاق احمد دہلوی ہیں (صفحہ ۹۳) شمشاد بیگم ہیں (صفحہ ۱۰۳) بیگم اختر ہیں (صفحہ ۱۰۸) ملکہ پکھراج ہیں (صفحہ ۱۱۵) اپنے ''مرزا ابراہیم بیگ خاطر غزنوی ہیں'' (صفحہ ۲۴۲)

جو ''کلرک تھے، شاعر تھے پھر پروفیسر ہوئے اور دنیا میں نام کمایا'' (صفحہ ۲۳۳) ''شیر محمد قیصر ہیں جو بعد کو ابن انشاء کے نام سے مشہور ہوئے'' (صفحہ ۱۲۳) ان کے دوست نور الحسن ہاشمی ہیں جنہیں ان کے نیوز کے شعبہ میں ہونے کی وجہ سے لوگ ''نیوز الحسن ہاشمی'' کہتے تھے (صفحہ ۲۱۲) محمد قوی خاں ہیں جو ان کے بچوں کے پروگرام سے ریڈیو پر متعارف ہوئے اور بڑے فنکار بنے۔ (صفحہ ۲۵۸) سعد راشد الخیری ہیں جنہیں اپنے ابوجہل کی نسل ہونے پر بہت فخر ہے (صفحہ ۳۸۰) اور اب میرا جی اور ان کی ''بادلی بیگم'' سحاب قزلباش کا ذکر۔

میرا جی ''کم گو تھے۔ مہینے کے آخر میں ان کی جیب خالی ہوتی تو میرے پاس آتے آپ کے پاس دو روپے ہیں؟ میں جیب میں ہاتھ ڈالتا وہ فوراً کہتے واپس نہیں کروں گا۔۔۔ ایک گھنٹہ بھی نہیں گذرتا کہ میرا جی پھر آتے لیجئے چار آنے۔۔۔ سنجیدگی سے کہتے سوا روپے کا ٹھرا۔ چار آنے کی دال اور چار آنے چپراسی کو حق خدمت اور مجھے کچھ نہیں چاہیے'' (صفحہ ۶۸)۔

سحاب قزلباش ''ریڈیو میں ان سے سینئر اور عمر میں جونیئر ہیں'' (صفحہ ۲۵) ''کسی افسر کی دھونس میں نہیں آتی تھیں۔۔۔ ''ذات'' کی اناؤنسر تھیں لیکن اگر کوئی گانے والا نہ آیا تو کوئی مضائقہ نہیں سحاب نے فوراً کوئی نظم پڑھ دی اور وقت پورا ہو گیا۔ سحاب کی ہنسی مجھے بہت پسند ہے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنستی ہیں جب لڑتی ہیں تو گول دیدے مٹکا مٹکا کر بڑے مزے سے لڑتی ہیں مگر چند منٹ بعد وہی خلوص اور وہی پیار اور وہی ہنسی جتنی وضع دار ہیں اتنی ہی بے فکری بھی ہیں اور اسی قدر بے پروا بھی'' (صفحہ ۲۵۔۴۶)

جفن میاں کے قبلہ والد صاحب نے ذوالفقار بخاری کو ریڈیو میں ملازمت کا انٹرویو دینے کے لئے جاتے وقت چٹھی دیتے ہوئے کہا تھا ''تمہارے بڑے بھائی بھی تو ریڈیو میں ہیں'' (صفحہ ۵۳) اس کی حقیقت اخلاق احمد دہلوی نے بیان کی ہوئی ہے۔ بڑے بخاری انٹرویو بورڈ میں پنجاب حکومت کے نمائندے کے طور پر شریک تھے۔ پروفیسر مرزا محمد سعید پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی بورڈ کے اراکین میں تھے۔ جب ذوالفقار علی بخاری صاحب کی باری آئی تو احمد شاہ بخاری یہ کہہ کر باہر چلے گئے کہ میں انٹرویو میں شریک نہیں ہوں گا کیونکہ میرا چھوٹا بھائی انٹرویو دے رہا ہے۔ (میرا بیان صفحہ

۱۳۴)۔

اب ان کے چچا میر انوار حسین۔ ہم جب پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے تو ہمارا اٹھنا بیٹھنا مال روڈ پر واقع ''چینیز'' ریستوران میں تھا۔ کافی ہاؤس میں بڑے لوگ براجمان ہوتے تھے ٹی ہاؤس پر شعرا ادبا کی اجارہ داری تھی ۔ ہم چینیز والوں کے ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے طلباء کی بہت خدمت کی۔ باقاعدگی سے آنے والے طلباء پر میر صاحب بہت مہربان تھے اور انہیں ادھار سدھار بھی دے دیا کرتے تھے۔ اب سید صاحب نے لکھا ہے کہ میر صاحب ان کے چچا تھے اور ''بڑے دل و دماغ کے آدمی تھے'' (صفحہ ۲۱) ہم ان کی وسعت قلب کی گواہی دیتے ہیں۔ یونیورسٹی سے نکلے ہوئے مدتیں ہوگئیں مگر ان کا چینیز ریستوران ہمیں یاد ہے اور ان کی میٹھی محبت آمیز مسکراہٹ! خدا معلوم وہ حیات ہیں یا گذر گئے، ہمیں آج ان کو یاد کرنے کا موقعہ مل گیا ہے تو ہم سید مظفر حسین کی ''عرض وسماع'' کے حوالے سے انہیں سلام کرتے ہیں۔

نثار عزیز بٹ نے اپنی خود نوشت ''گئے دنوں کا سراغ'' میں لکھا ہے کہ پشاور ریڈیو پر بہاریہ پروگرام کرنے کے لئے انہیں دعوت دی گئی تھی۔ وہاں انہیں پہلی بار اصغر بٹ اسسٹنٹ سٹیشن ڈائریکٹر سے متعارف ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ سید مظفر حسین صاحب کا دعویٰ ہے کہ ''میں سیدھا سادہ بھولا بھالا آدمی میں نے بٹ صاحب سے بھی محترمہ کا تعارف کروایا''۔ (صفحہ ۳۱۱) اس کے کچھ عرصہ بعد محترمہ نثار فاطمہ عزیز اور اصغر بٹ رشتہء ازدواج میں منسلک ہوگئے۔

سید مظفر حسین جگہ بجگہ اپنے رفقائے کار کی برائیاں نہ کرتے تو کتاب کا مزاج معتدل رہتا۔ کتاب ابتدا میں بہت دلچسپ معلوم دیتی ہے مگر جوں جوں بیان آگے بڑھتا ہے بعض رفقاء پر نکتہ چینی پڑھنے والے کو بہت کھلنے لگتی ہے۔ بایں ہمہ کتاب پڑھنے میں رواں ہے اور ریڈیو والوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دلچسپ بھی۔

❀

کشمکش

کشمیر کی تحریک آزادی کے رہنما جناب چوہدری غلام عباس کی خود نوشت سوانح عمری ''کشمکش'' کے عنوان سے ۱۹۵۰ میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور خود چوہدری صاحب کے قول کے مطابق ''وسط اکتوبر ۱۹۴۶ میں میرے آخری بار جیل جانے کے حالات تک محدود ہے۔ بعد کی روداد جس میں قیام پاکستان کے ریاست کے خونیں واقعات جہاد کشمیر اور پاکستان میں ہماری چار سالہ سیاسی زندگی شامل ہے ضبط تحریر میں لانے کے لئے ہمت ماحول اور قلم کی ضرورت ہے'' (کشمکش صفحہ ۱۶)۔ بعد کے حالات شائع ہوئے یا نہیں اس باب میں یہ کتاب خاموش ہے۔

کتاب کا دیباچہ عبدالمجید سالک جیسے صحافی نے لکھا ہے جو خود تحریک آزادی کشمیر کے ہراول دستے میں شمار ہوتے ہیں۔ سالک صاحب نے لکھا ہے اور بصراحت فرمایا ہے کہ ''یہ سوانح عمری تحریک حریت کشمیر کی مستند ترین تاریخ ہے اور اس شخص کے قلم سے ہے جس کی ساری زندگی اسی مقصدِ مقدس کے لئے جدوجہد کرتے گذری ہے اور جس نے گذشتہ پچیس سال کی مدت میں اپنے ذاتی مفاد اپنی ذاتی آسائش اور اپنے متعلقین کی خوش حالی کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کے لئے درویشانہ وقلندرانہ جہاد کیا جیل خانوں کی سختیاں جھیلیں، ناداری کی کڑیاں سہیں اور اپنے رفقاء کی غداریوں کے تلخ جام نوش کئے۔ لیکن اس خود غرض اور مطلب پرست دنیا میں اپنے بے نظیر ایثار اور اپنے شبانہ روز عمل کے جھنڈے گاڑ دیئے'' (صفحہ ۱۳) راولپنڈی کے رائل پبلشنگ ہاؤس والوں نے شیخ محمد عبداللہ کی ''آتشِ چنار'' کے بعد چوہدری غلام عباس کی کشمکش شائع کر کے یقیناً تحریک آزادیء کشمیر کی تاریخ مرتب کرنے میں اہم کام سرانجام دیا ہے۔ میرے سامنے ''کشمکش'' کا ۲۰۱۲ کا جدید

ترین ایڈیشن ہے۔

چوہدری غلام عباس جموں کے ایک معزز دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ طبیعت میں دین سے رغبت تھی یہاں تک کہ بشارات وکشف کے بھی قائل تھے ''مئی ۱۹۳۰ میں داتا صاحب کے دربار پر حسب معمول پہنچا مقبرہ کے ساتھ کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد دعا میں مصروف ہو گیا بعد میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عالم خواب میں ہوں اس حالت میں محسوس ہوا کہ کسی غیر مرئی طاقت نے مجھے آہستگی سے یہ کہا ہے کہ تمہارا اس سال امتحان میں کامیاب ہونا ٹھیک نہیں۔ اس واقعہ کے بعد میری آنکھ کھل گئی'' (صفحہ ۴۷)۔ چوہدری صاحب کی کشف وکرامات سے وابستگی ان کے والد محترم کی دینداری کی دین تھی اور خود انہیں اعتراف بھی تھا کہ ''میرے والد محترم بے حد متشرع اور دیندار تھے اور یہ امر واقعہ ہے کہ میں نے اپنی عمر میں ان کو ہمیشہ معمولاً اور التزاماً دو بجے صبح کے لگ بھگ بیدار ہوتے پایا تہجد و نماز پنج گانہ اور روزہ سوائے علالت کے انہوں نے کبھی ناغہ نہ کیا مجھے ان سے بعض عقائد میں اختلاف تھا لیکن مین جو کچھ بھی ہوں اور جو کچھ بھی میں نے اس دنیا میں حاصل کیا سب ان کی بدولت ہے یہان تک کہ میری موجود زندگی بھی انہی کی مرہون منت ہے'' (صفحہ ۲۰۲) ان کے والد محترم جموں کشمیر کے ممتاز احمدیوں میں شمار ہوتے تھے۔ چوہدری صاحب ان کے جنازہ میں شامل نہیں ہوئے۔

چوہدری صاحب نے خود کو تحریک حریت کشمیر کا پہلا اسیر قرار دیا ہے ''ریاست کے بتیس لاکھ مسلمانوں میں میں پہلا فرد حقیر تھا (جسے قدرت نے یہ قبولیت اور امتیاز بخشا) کہ تحریک حریت کشمیر کا پہلا اسیر بنایا گیا'' (صفحہ ۸۰) مگر شیخ محمد عبداللہ کو ان کے دعویٰ سے اتفاق نہیں ''محمد اسمٰعیل کو جس کو اس محلّہ میں پوسٹر چسپاں کرنا جہاں میں رہتا تھا پولیس نے سب سے پہلے گرفتار کر لیا یہ ہماری تحریک آزادی کا پہلا سیاسی قیدی تھا'' (آتش چنار صفحہ ٦٨)۔

عجیب تربات ہے کہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے یہ دونوں ممتاز رہنما ایک دوسرے پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے رہے۔ چوہدری صاحب کا کہنا ہے کہ ''شیخ محمد عبداللہ جیل سے ہمیشہ چور دروازے سے باہر آتے رہے'' (صفحہ ۱۲۷) مگر خود اپنی بات لکھ چکے ہیں کہ ''حکومت نے مجھ پر زیر

دفعہ ۱۲۴۔الف مقدمہ چلانا چاہا۔ راجہ محمد افضل خاں گورنر جموں نے مجھ سے کہا کہ اگر میں پرائم منسٹر کے سامنے اظہار معذرت کر دوں تو حکومت مقدمہ چلانے کا ارادہ ترک کر دے گی کیونکہ بقول ان کے کرنل کولون پرائم منسٹر تمہارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا دل سے مخالف ہے۔ میں نے اس بارے میں کسی سے مشورہ نہ لیا اور ایک روز کرنل کالون کے پاس جا کر اظہار افسوس کر دیا ابھی میں کرنل کولون کے ہاں ہی تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میں کسی گناہ عظیم کا مرتکب ہوا ہوں۔ اب بھی اس واقعہ کو یاد کر کے میں اکثر ندامت سے پانی پانی ہو جاتا ہوں میرے اتنے سے گناہ نے میرے ضمیر کو آج تک بوجھل کر رکھا ہے''۔ (صفحہ ۱۱۹) اگر معافیاں مانگ کر جیل سے باہر آنا گناہ تھا تو یہ گناہ تو کشمیر کے دونوں رہنماؤں سے سرزد ہوتا رہا ہے اور ان کا اسوہ ''ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنم'' رہا ہے۔ شیخ صاحب کا تجزیہ ان کے نزدیک یہ ہے ''جب تک وہ دوست ہیں پکے دوست ہیں لیکن جب وہ آنکھیں پھیر لیتے ہیں تو دشمنی میں بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔۔۔ ان کی طبیعت کا سب سے بڑا سقم آزادیٔ رائے کا فقدان رہا ہے ان کے لئے ہمیشہ ایک مشیر خاص کا ہونا ضروری ہے اور یہ مشیر حالات کے مطابق بدلتے بھی رہے ہیں ہر اہم معاملہ کے حسن و قبح پر وہ سنجیدگی سے غور کر سکتے ہیں اور بحث و تمحیص میں حصہ بھی لے سکتے ہیں لیکن آخری فیصلہ کبھی ان کے بس کا روگ نہیں رہا'' (صفحہ ۱۵۸۔۱۵۹) ''اور اسی بات نے انہیں دنیائے اسلام میں ذلیل و رسوا کر رکھا ہے'' (صفحہ ۲۲۵)۔ ہم تو دونوں کی شخصیتوں کا محاکمہ کرنے کے اہل نہیں۔

مؤرخ کشمیر اور سرینگر کے اخبار الاصلاح کے ایڈیٹر خواجہ عبد الغفار ڈار صاحب نے دونوں رہنماؤں کا تقابلی تجزیہ اپنی کتاب ''داستان کشمیر'' میں کیا ہے۔ ڈار صاحب تحریک آزادی کشمیر کے ساتھ شروع ہی سے وابستہ رہے ہیں۔ ''شیخ محمد عبداللہ کی اپنی اور کشمیر کی بدقسمتی کہ قوم نے بام عروج پر پہنچایا مگر یہ بے وفا کا بے وفا ہی نکلا۔ وادیٔ کشمیر میں مذہب پرست، جموں پہنچے تو اشتراکی بھارت میں وطن پرست''۔ ادھر چوہدری غلام عباس ''قناعت پسند درویش طبیعت مگر موقع پرست دوسرے درجہ کا لیڈر مگر ہمیشہ سپریم ہیڈ بننے کا خواہاں۔ دوران اقتدار متکبر اس کے بعد عاجزی انکساری کا نمونہ نہ کسی کا بھلا چاہا نہ کسی کا بھلا کر سکا'' (داستان کشمیر صفحہ ۲۳۰)۔

تحریک آزادیءِ کشمیر کا ذکر ہو اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی خدمات جلیلہ کا ذکر نہ ہو تو بات عجیب لگتی ہے مگر چوہدری صاحب نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی مساعیءِ جمیلہ کا ذکر و اعتراف ضرور فرمایا ہے اول یہ کہ کشمیر کمیٹی کے وکلا اسیران تحریکِ آزادی کے کیس لڑنے کے لئے آتے رہے اور دوسرے یہ کہ بین الاقوامی حلقوں میں کشمیر کے حقوق کا چرچا ہونے لگا۔ (صفحہ ۹۴۔۹۵)۔ سالک صاحب نے اپنے دیباچہ میں اپنوں کی جس دشمنی کا ذکر کیا ہے اس کا تفصیلی ذکر چوہدری صاحب اور شیخ محمد عبداللہ دونوں نے کیا ہے۔ چوہدری غلام عباس کا کہنا ہے کہ حضرت علامہ اقبال مرحوم مغفور اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی مظلومین کی امداد کے لئے میدان عمل میں آچکے تھے مجلس احرار اسلام نے کئی ہزار کی تعداد میں پنجابی مسلمانوں کو جتھوں کی شکل میں مظلومین کشمیر کی امداد کے لئے ریاست کی حدود میں داخل کر دیا۔۔۔" جماعت احرار کے لیڈروں اور بزرگوں سے جموں کشمیر کے مسلمانوں کو شدید اختلافات تھے یہ تحریک انہوں نے ہماری شدید مخالفت کے باوجود ایسے حالات میں شروع کی تھی جو اسلامیان ریاست کی اس وقت کی سیاسی فضاء کے لئے ساز گار نہ تھی کمشن (آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی مساعی سے قائم ہونے والے گلانسی کمشن) کی طرف ہندوستان اور ریاست کے مسلمانوں کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور ہر معقول آدمی اس وقت کسی غیر آئینی کارروائی کو مفاد ملت کے خلاف ایک تخریبی حرکت تصور کرتا تھا" (صفحہ ۹۹)۔

اس خودنوشت کا اختتام یوں ہوتا ہے "ریاست میں ہماری اس آخری قید کے زمانے میں خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں قسم کے کئی انقلاب آئے۔ پاکستان بنا مشرقی پنجاب اور ریاست جموں وکشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی گو میں نے اس ہولی کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ۔۔۔اس آخری زمانہ میں جہاد کشمیر کی ابتدا ہوئی اور جب چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا" یہاں یہ خود نوشت ختم ہوتی ہے اس پر مئی ۱۹۵۰ کا اندراج ہے۔ (صفحہ ۲۷۲)

ہماری زندگی

حیدرآباد کی پہلی ایم اے علیگ خاتون بیگم صوفی پاشا کی خودنوشت عمری "ہماری زندگی" کے عنوان سے ایوان اردو تیموریہ کراچی کی جانب سے مارچ ۱۹۷۳ میں پہلی بار چھپی۔ بیگم صوفی پاشا، حیدرآباد دکن کے ایک معزز عالم نواب محمد یار جنگ کی صاحبزادی ہیں۔ حیدرآباد دکن کی متوطن ہی نہیں انہیں اپنے وطن سے بے پناہ لگاؤ اور پیار ہے ہجرت کر کے کراچی آجانے کے باوجود ان سے دکنی محاورہ اور دکنی زبان نہیں چھوٹی۔ اس خودنوشت کی زبان خالص دکنی زبان ہے جو پڑھنے والے کو لطف دیتی ہے۔ یا مرزا ظفر الحسن کے ہاں دکنی روزمرہ تھا یا ان کے ہاں نظر آیا۔ تقریباً پونے دوسو صفحات کی یہ خودنوشت در حقیقت ان کی نہیں ان کے اور وطن اور پورے خاندان کی سرگزشت ہے۔ پہلا باب تو خالصۃً دکن کی تاریخ پر مشتمل ہے جس میں ہندوستان میں حیدرآباد کی حیثیت گولکنڈہ اور حیدرآباد کے آثار قدیمہ، معدنیات، نباتاتی پیداوار، مذہب، نظام حکومت، کتب خانے، اخبارات ورسائل تعلیمی ادارے غرض ہر چیز کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ ہمیں تو پہلی بار یہ پتہ چلا ہے کہ شہرہءِ آفاق کوہ نور ہیرا گولکنڈہ کی ایک کان سے نکلا تھا۔ (ہماری زندگی صفحہ ۱۵) پھر ان کے ددھیال ننھیال کے تفصیلی حالات ہیں تب کہیں جا کر ان کے اپنے حالات کے بیان کا موقع آیا ہے۔

محترمہ امتہ اللہ پاشا بیگم، ۱۹۰۰ میں تولد ہوئیں۔ حیدرآباد دکن کے مدرسہ اعزہ نامپلی میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کے بعد گھر پر پرائیویٹ طور سے تعلیم حاصل کرتی رہیں اور شادی کے بعد ۱۹۲۸ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پہلی ایم اے علیگ ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ حیدرآباد کی تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں نمایاں رہیں پاکستان آجانے کے بعد بھی ان کی سماجی سرگرمیاں جاری رہیں اور اپوا میں نمایاں کام کیے۔

بیگم پاشا صوفی کو علیا حضرت سلطان جہاں بیگم، والیہءِ ریاست بھوپال نے اپنا پرائیویٹ سکرٹری

بنانا چاہا تو پاشا صوفی صاحبہ نے کہا "آپ کی پرائیویٹ سکرٹری تو مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمشیرہ آبرو بیگم ہیں" (صفحہ۹۳) مگر بیگم بھوپال نے فرمایا ان کے فرائض اور ہیں آپ کے فراض مختلف ہوں گے مگر ان کے شوہر نے اجازت نہیں دی۔ حیدرآباد کی تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں سرگرم رہیں اس سلسلہ میں انہیں یورپ کا دورہ کرنے کا موقعہ بھی ملا۔ اپنے فرائض کے سلسلہ میں یہ ۱۹۳۵ سے ہرامپیریل ہائینس شہزادی درشہوار کی اتالیق تھیں اور انہیں اردو سکھاتی تھیں۔ ۱۹۳۷ میں یورپ گئی ہیں تو انہیں شہزادی درشہوار کے والد سلطان عبدالمجید سے بھی ملاقات کا موقعہ ملا۔ سلطان عبدالمجید ترکی کے آخری سلطان تھے اور جنیوا میں جلاوطنی اور معزولی کی زندگی گذار رہے تھے۔ ان کے پاس ان کے آٹوگراف موجود ہیں (صفحہ۱۰۶) جب جنیوا سے واپس آنے لگی ہیں تو سلطان کے سکرٹری انہیں خاص طور سے سلطان کی جانب سے خدا حافظ کہنے کو آئے۔ شہزادی درشہوار کی یہ بات ہمیں بہت خوش آئی کہ جب یہ پڑھانے کو کمرے میں داخل ہوتیں تو "شہزادی بڑے احترام سے اٹھ کر کھڑی ہو جاتیں۔ میں ان سے کہتی یور رائیل ہائی نس آپ شہزادی ہیں، ہم آپ کی خدمت کے لئے آتے ہیں تو فرماتیں استاد کی تعظیم کرنی چاہئیے" (صفحہ۹۶)۔ یہی عزت داروں کا وطیرہ ہوتا تھا۔

کتاب میں حیدرآباد نظام شاہی کے تمام حکمرانوں کی تصویریں موجود ہیں۔ نظام سادس میر محبوب علی خاں نہایت کم سنی کے زمانہ میں تخت نشین ہوئے تھے اس لئے ان کی ریجنسی کونسل بنائی گئی تھی۔ ان کے قبلہ والد گرامی مولوی غلام محمد اسی زمانے میں حیدرآباد میں ادنیٰ خدمت پر ملازم ہوئے اور نظام سابع میر عثمان علی خاں کے زمانہ میں تعلقہ دار یعنی ڈپٹی کمشنر کی خدمت سے وظیفہ یاب ہوئے۔ عربی کے عالم تھے اس لئے حیدرآباد کے دائرہ ٔ معارف کے صدرنشیں رہے اور دیگر علمی اداروں سے انتظامی طور سے متعلق رہے۔ محمد یار جنگ کا خطاب پایا۔ کتب خانوں سے انہیں خاص شغف تھا۔ ان کی اپنی کتاب امرءالقیس کے سبع معلقہ میں شامل قصیدہ "قفیٰ نبکِ من ذکریٰ حبیب و منزل" کی توضیح وتشریح پر مشتمل ہے اگرچہ کتاب میں دوجگہ اس کتاب کا ذکر ہے اور دونوں جگہ "قفیٰ نبکِ" کو "قِفیٰ بَنکِ" لکھا گیا ہے (صفحہ۴۹)

نظام سابع میر عثمان علی خاں اپنے لباس کے باب میں حد سے زیادہ لاپروا تھے "انہوں نے بادشاہی میں درویشی کی زندگی گزاری۔ سر پر ایک میلی کچیلی ترکی ٹوپی ہوتی تھی سادہ موٹے ململ کا کرتا لٹھے کا پاجامہ سوتی شیروانی زیب تن رہتی" (صفحہ۳۰) مگر برصغیر کے تعلیمی اداروں کو دل کھول کر

عطیات دیتے تھے۔ "پاکستان وجود میں آیا تو قائداعظم کو مالی دشواریوں کا سامنا ہوا تو انہوں نے نظام دکن سے خفیہ طور سے درخواست کی کہ پاکستان کو بطور قرضہ معقول رقم دی جائے۔ اعلیٰ حضرت نے میر لائق علی سے جو اس وقت حیدرآباد کے وزیراعظم تھے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا دس کروڑ بھجوا دیجئے۔ لیکن حضور نظام نے بیس کروڑ روپے بھجوادئے" (صفحہ۳۱) نظام سابع جزرس مشہور تھے مگر یہ جزرسی ان کی دادودہش میں حائل نہیں ہوتی تھی۔

یورپ کے سفرنامے میں بعض باتیں ہمیں حیران کن لگیں۔ جنیوا کے ٹاؤن ہال کے ایک حصہ میں کورٹ آف جسٹس ہے دیواروں پر ججوں کی ایسی تصویریں لگی ہیں جن کا ایک ایک ہاتھ کٹا ہوا ہے۔ یہ اس لئے کہ کوئی جج کبھی پورا عدل وانصاف نہیں کرسکتا" (صفحہ۱۰۹)

بیگم صاحبہ نے پیرس کے ایک گرجے میں سینٹ جون کا "جنازہ" دیکھا "یہ ایک مشہور خاتون گذری ہے جو لوگوں کے لئے دعائیں مانگتی تھی اور مریضوں کو شفا ہو جاتی تھی۔ اس کے جنازے کے اطراف موم بتیاں سلگاتے ہیں او جس شخص کو مراد مانگنی ہوتی ہے وہاں جا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔ سینہ پر صلیب کا اشارہ کرتا ہے اور اس جنازے کو ہاتھ لگا کر مرادیں مانگتا ہے تعجب ہوا کہ اب تک لوگوں کے دل میں مردہ پرستی باقی ہے" (صفحہ۹۸)۔ کیا بیگم پاشا صوفی نے اپنے ہاں ہونے والی قبر پرستی اور شرک نہیں دیکھا؟ اولیاء اللہ کے مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے وہ ہر ایک کے علم میں ہے۔ ہمارے قدرت اللہ شہاب نے تو اپنی خودنوشت میں صدر سکندر مرزا کی عراق کی ایک تصویر چھاپی ہے جس میں وہ کسی مزار پر سربسجدہ ہیں۔ چلئے یہ تو مردہ پرستی ہے اپنے مشہور ادیب اشفاق احمد اپنے مریدوں کو اپنے پاؤں پر سجدہ کرنے کی اجازت دیا کرتے تھے اور یہ بات کسی اور نے نہیں ان کی رفیقہ ٔحیات بانو قدسیہ نے اپنی خودنوشت میں لکھی ہے۔ (راہ رواں صفحہ۱۵۰)۔ بیگم پاشا کس کس بات کا نوحہ کریں گی؟

غرض بیگم پاشا صوفی کی یہ مختصر سی خودنوشت اپنے مندرجات کی وجہ سے دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ دیباچہ ممتاز حسن صاحب کا لکھا ہوا ہے اور یہی اس کے استناد کی دلیل ہے۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے

پیپلز پارٹی کی ایک عام کارکن محترمہ فرخندہ بخاری کی خودنوشت ''یہ بازی عشق کی بازی ہے'' کے عنوان سے سنگ میل لاہور کی جانب سے ۲۰۱۲ میں چھپی ہے۔فرخندہ بخاری پیپلز پارٹی کے ان اسیر کارکنوں میں ایک تھیں جنہیں الذوالفقار کے طیارہ اغوا کرنے والے کارکنوں نے طیارے کے مسافروں کی رہائی کے عوض رہا کروانے کا مطالبہ کیا تھا۔فرخندہ بخاری اس وقت لاہور کے قلعہ میں قید تھیں اور فوجی ظلم وستم کا نشانہ بن رہی تھیں۔انہیں کچھ علم نہ تھا کہ انہیں کیوں جلاوطن کیا جارہا ہے۔دنیا کو ان کی جبری جلاوطنی کی خبر انگلستان کے اخبار دی آبزرور میں چھپنے والی اس تصویر سے ملی جس میں ایک عورت کو ہتھکڑیوں سمیت جہاز میں سوار ہوتے دکھایا گیا تھا۔جبری جلاوطنی کا یہ عرصہ محترمہ فرخندہ بخاری نے ضمیر کے قیدی کی حیثیت میں انگلستان میں گذارا۔پاکستان ان کی واپسی ناممکن تھی کہ ان پر سنگین مقدمات تھے۔بے نظیر کے عہد میں واپس آئیں تو شوہر نے سیاست سے تائب ہوجانے کا حکم دیا اور محترمہ فرخندہ بخاری نے اپنے شاعر شوہر شہرت بخاری کی مرضی پر سر تسلیم خم کر دیا حالانکہ محترمہ نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر دونوں ان کی قربانیوں سے آگاہ اور ان کے اخلاص کی معترف تھیں اور لاہور اور لندن میں ان کے گھر بھی آتی جاتی رہی تھیں۔ان کے فوجی میجر جنرل بہنوئی نے از رہ تعریض انہیں کہا تھا کہ جن لوگوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا وہ وزیر بن گئے ہیں تم ابھی تک در بدر کی خاک چھان رہی ہو۔(یہ بازی عشق کی بازی ہے صفحہ ۱۶۸)

یہ تو دنیا کا دستور ہے ہی۔منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔لے دے کے ان کے شوہر نامدار شہرت بخاری کو بے نظیر کے دور اول میں اقبال اکیڈمی کا ڈائریکٹر بنایا گیا تھا تو یہ عہدہ بھی انکے لئے

سانپ کے منہ میں چھچھوندر بن گیا۔اگلے بنے نہ نگلے بنے۔

فرخندہ بخاری کوئی خاندانی یا موروثی سیاسی کارکن نہ تھیں۔ضیاء الحق نے بھٹو کو قید کیا تو موروثی ایم این اے ایم پی اے جسم وجان بچانے کے لئے کونوں کھدروں میں چھپ گئے تو یہ پیپلز پارٹی یا بھٹو سے جذباتی وابستگی کی وجہ سے میدان میں کود پڑیں کہ کیا ہم اپنے ''دانشور لیڈر کو جلادوں کے ہاتھوں میں اکیلا چھوڑ دیں؟''(صفحہ ۶۴) پیپلز پارٹی کی خواتین عہدیداروں نے بھی انہیں ڈرایا مگر یہ اپنا سا احتجاج کرتی رہیں۔بیگم بھٹو لاہور سٹیڈیم میں زخمی ہوئیں تو یہ ان کے ہمراہ تھیں۔زخمی ہوئیں تو کہا مجھے جنرل اقبال کے پاس لے چلو۔وہ لاہور کے کور کمانڈر تھے بیگم بھٹو نے انہیں دیکھتے ہی کہا ''اپنے محسنوں کا یہ حال کرتے ہو؟ کیا تمہیں اسی لئے دشمنوں کی قید سے آزاد کروایا تھا؟''(صفحہ ۶۵)۔بیگم بھٹو نے کہا اس لاٹھی چارج کے خلاف احتجاج کرو۔ملک معراج خالد نے عورتوں سے کہا ''بیبیو گھروں کو جاؤ یہ بڑی لمبی جنگ ہے''(صفحہ ایضاً)۔

تحریک چلانے کے لئے فنڈ درکار تھے مگر بیگم خاکوانی نے جو خواتین پیپلز پارٹی کی عہدیدار تھیں یہ کہہ کر کچھ دینے سے انکار کر دیا ''کہ یہ پارٹی لائن نہیں ہے''(صفحہ ۷۰) مگر چند سر پھری خواتین یہ کام کرتی رہیں تا آنکہ انہیں گرفتار کر لیا(صفحہ ۷۲)

ان کے لیبیا بھیجے جانے کا قضیہ بھی لکھا گیا ہے۔بھٹو صاحب کے عدالتی قتل کے بعد یوسف کامران اور کشور ناہید ان کے گھر آئے اور انہیں جی او آر لے جا کر ڈاکٹر کنیز یوسف سے ملوایا۔کہا گیا کہ پاکستان میں رہ کر کام مشکل ہو رہا ہے اس لئے باہر کے کسی ملک میں جا کر سیمینار کریں گے تا کہ پیپلز پارٹی کا کام جاری رکھا جا سکے۔(صفحہ ۸۵) انہیں ترکی اور پھر وہاں سے لیبیا بھجوا دیا گیا جہاں قذافی نے انہیں لیکچر دیا(صفحہ ۹۰) وہاں سے ہفتہ دس دن کے بعد یہ بہت مایوس اور دل گرفتہ واپس آئیں۔انہیں یقین تھا کہ ''انہیں دھوکے سے لیبیا بھیجا گیا تھا''(صفحہ ۱۰۱) واپس آتے ہی قید ہو گئیں اور لیبیا جانے کی سازش میں پکڑی گئیں اور لاہور کے قلعہ میں بے پناہ تشدد کا نشانہ بنتی رہیں۔فوجیوں کا یہ مطالبہ تھا ''آپ صرف یہ کہہ دیں ہمیں بیگم نصرت بھٹو نے لیبیا بھیجا تھا''(صفحہ ۹۶) اسی سازش میں قید تھیں کہ انہیں الذوالفقار والوں کے مطالبہ پر جلاوطن کیا گیا۔حالانکہ یہ انہیں جانتی تک نہ تھیں۔

ڈاکٹر کنیز یوسف اور پروفیسر افضل توصیف پر انہیں اعتماد نہیں۔ کنیز یوسف پر تو افضل توصیف نے بھی اپنی خودنوشت ''دیکھی تیری دنیا'' میں یہ الزام لگایا ہے کہ ''ڈکٹیٹر شپ میں جمہوریت کی سخت دشمن تھیں۔ جمہوریت آئی تو اس کی سب سے بڑی چمپیئن ٹھہریں'' (دیکھی تیری دنیا۔ صفحہ ۱۶۱) کنیز یوسف کے بھائی بریگیڈئر عثمان خالد جلاوطنی میں ان کے ساتھ رہے۔ دوسرے جن لوگوں کا ذکر ہے ان میں ڈاکٹر غلام حسین اور منیر وڑائچ کو تو ہم بھی جانتے ہیں کیونکہ دونوں سویڈن میں پناہ گزین تھے ڈاکٹر غلام حسین نے پیپلز پارٹی کی حکومت آنے پر خوب فائدہ بھی اٹھایا۔

دمشق میں ان کی ملاقات مرتضٰی بھٹو سے ہوئی (صفحہ ۱۱۱) دمشق کے ہوٹل میں اقوام متحدہ کے نمائندے نے ان کے انٹرویو لئے اور انہیں ضمیر کے قیدی قرار دیا۔ ''بھٹو کی جان بچانے کے لئے سڑک پر نکلنے والی یہ خاتون'' (صفحہ ۶۲۱) لمبے عرصہ تک جلاوطن رہی۔ اس نے بھٹو اور بھٹو کی بیٹی کی شہادت اور بیگم نصرت بھٹو کی دردناک موت بھی دیکھی۔ شوہر کی وفات کے بعد اب اپنے بچوں کے ساتھ زندگی کر رہی ہے۔ پس ورق پر درج ہے کہ یہ خودنوشت اس نے بے نظیر سے کئے ہوئے وعدہ کے مطابق لکھی ہے۔

لندن میں ''بے نظیر ان کے گھر آئیں اور فرمائش سے مسور کی دال پکوا کر کھائی'' (صفحہ ۱۵۴) لندن میں ہی پیپلز پارٹی کے جلاوطن لیڈروں میں مناقشت شروع ہوگئی تھی۔ بریڈفورڈ میں بی بی کے جلسہ میں ڈاکٹر غلام حسین زندہ باد کے نعرے لگتے رہے۔ (صفحہ ۱۵۸)۔ بی بی کی لندن آمد کے موقع پر کنیز یوسف ائیر پورٹ پر موجود تھیں مگر کنیز یوسف ان کی میٹنگ میں نہیں آئیں۔ ''بی بی نے ان سے کہا تم کنیز یوسف کے منہ نہ لگو'' (صفحہ ۱۵۹)

فرخندہ بخاری نے انگلستان کے قیام کے دوران ''بہت خوف میں وقت گذارا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کمانڈو اغوا نہ کرلیں'' (صفحہ ۱۳۸) مگر میاں بیوی نے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا بیٹا علی جو ڈاکٹر بنا اور بیٹی مقسومہ بخاری بیرسٹر بنی اور اب اپنی بے سہارا والدہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔

کتاب کے اواخر میں کچھ بھٹو صاحب کا دوسروں کا بیان کردہ احوال ہے۔ کچھ ان کے شوہر کے

حالات ہیں۔ کچھ اپنے خاندان اور بھائی بہنوں کا ذکر ہے۔ مگر بھٹو صاحب کے احوال میں ہمیں پاک ٹی ہاؤس میں بھٹو صاحب کے آنے کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ بھٹو صاحب پاک ٹی ہاؤس میں حبیب جالب فنڈ میں اپنا عطیہ دینے آئے تھے اور چپ چپاتے بیرے الٰہی بخش کو اپنا عطیہ دے گئے تھے (صفحہ ۲۰۹)

فرخندہ بخاری کی یہ خودنوشت کسی سیاسی مدبر کی خودنوشت نہیں ایک عام سیاسی کارکن کی سرگزشت ہے اور فرخندہ نے خود بھی ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ ''میں سیاسی تجزیہ نہ اس وقت کرتی تھی نہ اب دانشورانہ قسم کا اظہار خیال کرتی ہوں'' (صفحہ ۵۴) اور یہ خودنوشت ان کے اس قول کی گواہی ہے۔

ایک ستم ظریفی کا ذکر ہو جائے۔ شادی کے بعد شوہر شہرت بخاری نے انہیں دو تحفے دئے برقعہ اور دو پنجرے۔ (صفحہ ۴۸) یعنی ان کی شادی شدہ زندگی قید و بند کی علامتوں سے شروع ہوئی اور انہی علامتوں کے درمیان گذر گئی۔ پنجرے میں ایک طوطا تھا وہ ان کی سہیلیوں نے اڑا دیا۔ خالی پنجرہ ان کے گھر کی علامت بنا رہا۔

سادہ لفظوں میں لکھی گئی یہ خودنوشت اپنی سادگی اور خلوص کی وجہ سے قارئین کے دلوں میں جگہ پائے گی۔

❁

یادوں کی دستک

محترمہ صوفیہ انجم تاج کی خودنوشت ''یادوں کی دستک'' کے عنوان سے زین پبلشرز، ناظم آباد کراچی والوں نے جنوری ۲۰۰۷ میں پہلی بار شائع کی۔ محترمہ صوفیہ انجم تاج شمالی امریکہ میں برسوں سے مقیم ہیں مگران کے شعور ولاشعور میں ان کے بچپن اور بچپن کا ماحول رچا بسا ہوا ہے۔ وہی وطن وہی گلیاں کوچے وہی لوگ وہی تہذیب وہی انداز ہست و بود۔ یوں محسوس ہوتا ہے وہ ٹیگور کے کردار'' کابلی والا'' کی زندہ تصویر ہیں۔ ''صوفیہ انجم نام کی لڑکی جواب امریکہ میں ہے اپنا دل وہیں چھوڑ آئی ہے جہاں اس کے بچپن اور لڑکپن کے دن گذرے ہیں'' (یادوں کی دستک صفحہ ۹۲) یادوں کی دستک نامی یہ کتاب محض ماضی کی داستان نہیں رہی ان کے وطن کی موئی مٹی مٹی کی تہذیب و ثقافت کا نوحہ بن گئی ہے۔ چالیس برس کے بعد اپنے بچپن کے مسکن عدالت گنج کو دیکھنے گئی ہیں جہاں یہ پیدا ہوئی تھیں پلی بڑھی تھیں۔ اور جب تلاش بسیار کے بعد'' مکان تو تلاش کرلیا مگر نئے مکینوں نے انہیں اندر جانے اور مکان دیکھنے کی اجازت نہیں دی''۔ (صفحہ ۱۵۵)۔ تب یہ مایوسی سے واپس آ گئیں مگر وہ مکان ان کے تصور میں تو بسا ہوا ہے موجود ہے اسی طرح آباد ہے۔ اور ان کے تصور کا آراستہ پیراستہ خزانہ ہے۔

صوفیہ انجم تاج مصور بھی ہیں اور شاعر بھی۔ ان کی شعری کاوشوں کے حوالے تو جا بجا ان کی خود نوشت میں مل جاتے ہیں مگر مصوری کا ایک ہی نمونہ کتاب کے سرورق پر ملتا ہے اور ان کی پختہ فن کاری کا جیتا جاگتا ثبوت ہے وہی آنگن جس کی ہر چیز ایک تاریخ ہے۔ ''میں اپنے ماضی کی خاک ہوں اور اپنی ڈیوڑھی کی دھول ہوں، اپنے ماضی کے گذرے ہوئے لوگوں کی یادگار ہوں'' (صفحہ ۱۹)۔۔۔

''اگر کوئی مانگے تو ایک ایک پل کا حساب دے سکتی ہوں'' (صفحہ ۲۳۶) اور خودنوشت ایک ایک پل کا حساب ہی تو ہوتا ہے جو کوئی دوسرا نہیں مانگتا خود اپنا وجود مانگتا ہے۔ اور اچھی خودنوشت وہی ہوتی ہے جو مکمل حساب رکھتی ہے مگر کسی کو دیتی نہیں یہ بھی اپنی نانی کی طرح ''اپنے ماضی کے ملبے سے۔۔۔ جملوں کو چنتی رہتی ہیں جو ان کی نظروں کے سامنے کی دھند میں دیئے کی طرح روشن رہتے ہیں اور اس دھند میں پھر انہیں ایک نیا راستہ ملنے لگتا ہے''۔ (صفحہ ۸۲)

محترمہ صوفیہ انجم ایک چابک دست مصور ہیں اور ایک ماہر نقاش کی طرح اس ماحول کی تصویر کشی کرتی ہیں جو ان کے تصور میں رچا بسا ہوا بلکہ وہیں رکا ہوا ہے۔ وقت سالوں آگے گذر آیا ہے پرانی نسلیں نئی نسلوں میں بدل گئی ہیں اور نئی نسل تیسری نسل کا روپ دھار چکی ہے مگر ان کے ہاں رکے ہوئے وقت کی چاپ ماضی کی چاپ بن کر سنائی دیتی بلکہ صدائے بازگشت کی طرح گونجتی ہے۔ اس مقصد کے لئے مصنفہ نے اپنے اجداد میں اپنی نانی دادی کو چنا ہے انہی کے ذکر خیر سے یہ داستان شروع ہوتی ہے اور تیسری نسل کی پرانے دور کی تاریخ وتہذیب سے نا التفاتی کے نوحے پر ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کتھا مردوں پڑدادا، دادا، بڑے ابا، کے ذکر سے شروع ہوتی تو گھروں کے اندر کی تہذیب وثقافت کا بیان اور اس کا زیاں ان کے قابو میں نہ آتا تاریخ تو بیان ہو جاتی ثقافتی زیاں رہ جاتا۔

میرے دوست ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے انہیں دو دنیاؤں کا شہری قرار دیا ہے مگر یہ دو دنیاؤں کی شہری نہیں ہیں ایک ہی دنیا کی شہری ہیں اور وہ دنیا ان کا ماضی ہے، ماضی کا ماحول ہے ماضی کے لوگ ہیں یہ انہی کے درمیان جیتی اور زندگی کرتی ہیں۔ جس طرح ہمارے انتظار حسین کو لوگ باگ طعنے دیا کرتے تھے کہ وہ اپنے ماضی میں جیتے ہیں حال سے لاتعلق ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے۔ انتظار حسین تو اپنے وطن کو کھوج آئے (جستجو کیا ہے صفحہ ۲۹۴) اور آ کر ایک نئی جستجو میں لگ گئے مگر انہیں تو اپنے ماضی کو اپنی آنکھوں دیکھنے بھی نہ دیا گیا ان کے ہاں جو ناسٹلجیا ہے وہ انتظار حسین سے زیادہ شدید اور کربناک ہے۔ ہاتھ میں آ کر نکل جانے والی تتلی کی طرح۔ شکیب جلالی کی کیا خوبصورت بات یاد آئی۔ مری گرفت میں آ کر نکل گئی تتلی۔ پروں کے رنگ مگر رہ گئے ہیں مٹھی میں۔

یادوں کی دستک محض ان کے خاندان کی یاد آوری اور بازگشت ہی نہیں سیاسی اور سماجی ماحول کی

باریکیاں بھی جہاں تہاں مل جاتی ہیں۔'' یہ بات بہت مشہور ہے کہ بڑے نانا اور موتی لال نہرو میں
ملاقات ہوتی تو موتی لال نہرو ہمیشہ پہلے انہیں سلام کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا تو نانا نے نہرو جی سے کہا'
کبھی تو ہمیں سلام کرنے کا موقعہ دیجئے۔ ہمیشہ آپ ہی سلام کرتے ہیں۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ہم
سے بڑے ہیں اور سلام کرتے ہیں' نہرو جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا آپ شاہ صاحب ہیں
سید ہیں۔ اس لئے ہمیں سلام کرنے دیجئے۔ اور اپنی دعاؤں میں ہمیں یاد رکھئے'' (صفحہ ۱۲۷) یہ
پرانے شرفا کی وضع داریاں تھیں۔ اور اب کیا حال ہو گیا ہے'' اب پٹنہ کے ایک ایک گھر کے سامنے
سون پور کا میلہ لگا رہتا ہے۔ جس کا جی چاہے ہاتھی خریدے، جس کا جی چاہے کتا خریدے کہ اب ہاتھی
اور کتے کا ایک ہی مول ہو گیا ہے'' (صفحہ ۱۲۴) ادھر ہمارے ہاں؟ بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اپنی خود
نوشت میں لکھا ہے کہ اے کاش، ہم لوگ سجدے کر کر کے خدا کو اور درود پڑھ پڑھ کر رسول کو دھوکا دینے
والے نہ ہوتے۔'' زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند۔ حق را بسجودے و نبی را بہ درودے'' (پردہ سے
پارلیمنٹ تک صفحہ ۱۸۰)۔

احوال الرجال میں اپنے آبا و اجداد کے علاوہ علامہ جمیل مظہری کا ذکر ہے اور ان کی وہ غزل
پوری درج ہے جس کا مطلع مشہور عالم ہے کہ'' بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر سر میں ہے خودی کا۔ اگر نہ ہو یہ
فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا'' (صفحہ ۲۲۷) کلیم عاجز کے حوالہ سے علامہ فضل حق آزاد کا ذکر
ہے۔'' لکھنؤ کے کسی مشاعرہ میں کسی شاعر نے عظیم آباد کے شعراء کی تعریف کی تو شمشاد لکھنوی مرحوم
نے بڑے طنز سے یہ شعر پڑھا، اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے۔ دعویٰ غزل کا لکھنو والوں کے
سامنے؟ تو فضل حق دادا نے یہ شعر پڑھا'' یہ بستی اب بھی بازارِ ختن ہے باکمالوں سے۔ غزال آنکھیں
چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے'' (صفحہ ۲۱۸) مگر اظہار بوئے مشک والا شعر اور ملحقہ فقرہ مصنفہ نے یا
کسی اور نے کتاب میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر ایزاد کیا ہے کتابت میں رہ گیا ہوگا۔

ڈاکٹر اختر اورینوی اور شکیلہ اختر کا ذکر ہے شکیلہ ان کی امی کی قریبی بہن تھیں اس لئے خالہ تھیں
اختر اورینوی ان کے خالو ہوئے اور آپ انہیں اختر خالو کہہ کر ہی مخاطب کرتی ہیں۔'' ہم لوگوں کے گھر
سلطان گنج میں وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور نظامت کی باگ ڈور وہی سنبھالتے تھے۔

ان کی گفتگو کا انداز بے حد مختلف اور نرالا تھا۔ ان کی زبان سے ادا کئے ہوئے جملوں کو سن کر میں تو بالکل
بے بس ہو جاتی اور سوچتی ارے یہ کیا بول گئے۔ ایسا لگتا کہ کوئی چیز ریشم کی طرح پھسل گئی اور میں کھڑی
کی کھڑی رہ گئی'' (صفحہ ۲۲۲)

صوفیہ انجم تاج کی یہ خود نوشت نہایت خوبصورتی اور سلیقہ سے چھاپی گئی ہے۔ ایسی رواں دواں
زبان میں اور مصورانہ چابک دستی سے لکھی گئی کتاب ایسی ہی فنکارانہ چھپوائی کی سزاوار تھی۔ خدا اسے
قبول عام کی سند عطا فرمائے۔ آمین۔ ایسی کتابیں ہمارے عام قارئین کی نظروں تک نہیں پہنچتیں
حالانکہ اہلِ ذوق ان کے متلاشی رہتے ہیں۔ اگر میرے بزرگ دوست اکرام بریلوی مجھ پر کرم نہ
فرماتے تو میں اس کتاب کے مطالعہ اور تجزیہ سے محروم رہ جاتا۔

✿

سویہ ہے اپنی زندگی

پروفیسر نظیر صدیقی کی خودنوشت ''سویہ ہے اپنی زندگی'' پہلی بار ۱۹۹۱ میں سرحد اردو اکیڈمی ایبٹ آباد کی جانب سے شائع ہوئی۔ نظیر صدیقی چھپرہ بہار کے رہائشی تھے تقسیم ملک کے بعد ڈھاکہ چلے گئے اور نوجوانی کا بیشتر حصہ وہیں گذارا۔ سقوط مشرقی پاکستان سے پہلے کراچی آ گئے۔ تعلیم و تعلم سے ان کا واسطہ رہا۔ ڈھاکہ میں پڑھاتے رہے پھر اسلام آباد کے فیڈرل گورنمنٹ کالج میں استاد رہے بعد ازاں اوپن یونیورسٹی سے وابستہ رہے ایک سال چین میں بھی گذارا۔

نظیر صدیقی، ادبی تنقید کا معروف نام ہے مگر ان کی خودنوشت اس بات کا تاثر دیتی ہے کہ انہیں ان کے خیال کے مطابق ادبی دنیا میں وہ پذیرائی نہ ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''میں اپنے دور کا نامقبول ترین انسان اور ادیب ہوں'' (سویہ ہے اپنی زندگی صفحہ ۱۷۵) اس کی وجوہات آپ نے خود بیان کی ہیں۔ پہلا اعتراض تو انہیں انسان کے صاحب جسم ہونے پر ہے ''انسان پر قدرت نے بہت سے ظلم کئے ہیں ان میں سے ایک بڑا ظلم یہ ہے انسان کو جس قسم کا جسم عطا کیا گیا ہے وہ اس کے کائناتی مقام سے مطابقت نہیں رکھتا۔۔۔۔ یہ حقیقت کتنی تکلیف دہ ہے عام انسانوں سے قطع نظر دنیا کی حسین سے حسین اور ذہنی طور پر عظیم سے عظیم شخصیت جسم و جنس کی تمام آلودگیوں سے لبریز ہوتی ہے'' (صفحہ ۱۲) ''انسان کے ساتھ انسان کے رومانی جذبات جس جسمانی انجام پر منتج ہوتے ہیں اس پر قدرت کو شرم آنی چاہیئے تھی جو نہیں آئی'' (صفحہ ۱۳) زندگی کی کراہت آمیزی کے بارے میں اتنا حساس ہونے والا انسان زندگی میں کس طرح خوش رہ سکتا تھا؟ کمزور حافظہ (صفحہ ۸) اور خود اذیتی (صفحہ ۱۱) کے رجحان نے عمر بھر ان کا پیچھا نہیں چھوڑا خود انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ ''نظیر صدیقی جہاں کھڑا

ہوتا ہے تنہا کھڑا ہوتا ہے'' (صفحہ ۱۳۱) عندلیب شادانی ان کے استاد تھے مگر ''ان سے جو کچھ سیکھا وہ کلاس سے باہر سیکھا'' (صفحہ ۲۹) ''ان کے لئے جو کوشش کر سکتے تھے انہوں نے کوشش نہیں کی جنہوں نے کی وہ کامیاب نہ ہوئے'' (صفحہ ۱۶۲) جو انہیں قناعت کا درس دیتے تھے وہ خود اپنے مفادات کے حصول میں سرگرداں رہے (صفحہ ۱۷۸)

غرض یہ خودنوشت ایک ایسے شخص کی سرگزشت بن کر رہ گئی ہے جسے ہر قدم اور ہر مقام پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اس کی خواہشات پوری نہیں ہوئیں لوگ باگ اس کے مرتبہ سے آشنا نہیں ہوئے حالانکہ وہ کسی غیر معمولی ناکامیابی یا حق تلفی کا شکار نہیں ہوئے صرف یہ ہوا کہ ان کی توقعات ان کی توقعات کے مطابق پوری نہ ہوئیں۔ انہیں ذرا سی ناکامی بھی بہت بڑی دکھائی دیتی ہے حالانکہ انہیں احساس ہے ''میں کہیں اس لئے ناکام رہا کہ میرے لئے کوئی سفارش نہ تھی کہیں اس لئے کہ میری صحت ضرورت سے کم تر پائی گئی کہیں اس لئے کہ میرے مقابلہ میں فرزند سرزمین کو ترجیح دینا ضروری تھا اور کہیں اس لئے کہ میں پختہ ذہن کا مالک تھا'' (صفحہ ۱۱۹) اور جہاں مقابلہ کی بات ہوتی ہے وہاں یہ سب باتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ ہمارے ایک مرحوم پرنسپل سے کسی طالب علم نے اپنی ناکامی کی یہ وجہ بیان کی کہ میرے مدمقابل کی بڑی تگڑی سفارش تھی۔ مرحوم استاد نے فرمایا اگر آپ کے نمبر نمایاں طور پر ''تگڑے'' ہوتے تو کسی کو سفارش ماننے کی جرات بھی نہ ہوتی۔ علمی برتری ہمیشہ انسان کے کام آتی ہے۔ نظیر صدیقی صاحب اردو میں فرسٹ کلاس ایم اے تھے انگریزی میں پرائیویٹ طور سے ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا اور تیسرے درجہ میں کیا تھا۔ تنقید نگاری کا شوق تھا مگر ہر چیز کو اپنے انداز میں بیان کرتے تھے۔ آپ نے اپنی کتاب ''اردو ادب کے مغربی دریچے'' کے دیباچے میں لکھا تھا کہ ''میں نے ان چھ مضامین میں جس طرح کے کام کئے ہیں ان میں میری اہلیت کو اتنا دخل نہیں جتنا میرے جسارت کو۔ مغربی ادب اور فلسفہ میں نہ تو میری باقاعدہ تعلیم ہے نہ باقاعدہ تربیت۔ یہاں جو کچھ ہے محض شوق اور دلچسپی کا نتیجہ ہے ممکن ہے میری معلومات ناقص اور میری فکر گمراہ کن ہو پھر بھی یہ ممکن ہے یہ صفحات کسی بہتر کام کا محرک ثابت ہوں''۔ اپنی خودنوشت میں آپ نے شاد عظیم آبادی پر اپنے مضمون کا ذکر کیا ہے کہ نیاز فتحپوری نے نگار میں اس لئے شائع کر دیا کہ ''اگرچہ مضمون بہت کمزور ہے

لیکن اس خیال سے شائع کر رہا ہوں کہ ممکن ہے کسی کو اس سے بہتر مضمون لکھنے کی تحریک ہو"۔۔۔ "لیکن شاد پر ایک اچھا مضمون دیکھنے کی آرزو اب تک پوری نہ ہو سکی"۔۔۔ "میرے مضمون کی اشاعت کے مدتوں بعد غالباً نقوش میں شاد پر عزیز احمد کا مضمون۔ یقیناً ایک معیاری مضمون تھا لیکن وہ مجھے پورے طور پر آسودہ نہ کر سکا"۔ (صفحہ ۶۵) یعنی ان کے کئے ہوئے کام کے بعد کسی بہتر کام کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔ جہاں پندار کا یہ عالم ہو وہاں مایوسیاں بھی اسی درجہ کی شدت والی ہونگی۔ اسی قسم کی بات آپ نے انشائیہ کے سلسلہ میں کی ہے "خود وزیر آغا نے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ نظیر صدیقی انشائیہ نگار نہیں طنز نگار ہیں اور ان کا طنز بھی کند چھری سے مشابہ ہے"۔۔۔ کنہیا لال کپور نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ "آپ میں ایک اچھا طنز نگار بننے کی صلاحیت ہے مبارکباد قبول فرمائیے کہ اردو طنز و مزاح آپ کی بدولت زندہ ہے اور وہ ڈھاکا جو کبھی ململ کے لئے مشہور تھا اب نظیر صدیقی کی وجہ سے مقبول ہو رہا ہے"۔ (صفحہ ۱۱۲) یہ دونوں باتیں ان کی خودنوشت میں درج ہیں ایک نظیر صدیقی صاحب کو پسند ہے دوسری ناپسند (ہمیں اس بات پر اطمینان ہے کہ نظیر صدیقی صاحب کا ذہن ڈھاکے کی ململ کی نزاکت اور اس کے چھینٹے کے تلازمے کی طرف منعطف نہیں ہوا)۔ تیسری بات مشفق خواجہ کے ہاں سے حوالہ کے طور پر ہم لکھ رہے ہیں "عورتوں کی شاعری پر لکھنے کا حق اگرچہ نظیر صدیقی کا ہے۔ جن موضوعات پر ہمیں کالم لکھنے چاہئیں ان پر وہ تنقیدی مقالے لکھ دیتے ہیں کالم پر لوگ ہم سے بدظن ہو جاتے ہیں جب کہ نظیر صدیقی کے مقالے پڑھ کر ادب سے بدظنی پیدا ہوتی ہے نظیر صدیقی کو کوئی کچھ نہیں کہتا" (کالم رجحان ساز یا کتاب ساز ۷ جون ۱۹۸۵ بحوالہ خامہ بگوش کے قلم سے طبع اول ستمبر ۱۹۹۵) گویا اپنے آپ کو متنازعہ بنانے میں خود خودنوشت نگار کا اپنا کمال اور ہاتھ بھی تھا۔

طنز و مزاح کے ساتھ ایسا مضبوط تعلق خاطر رکھنے کے باوجود یہ "شوکت تھانوی اور دلاور فگار کی خشک اخلاقی" سے نالاں ہیں "شوکت تھانوی سے ایک مشاعرے میں تین چار منٹ کی گفتگو ہوئی تھی ان سے دوبارہ ملنے کی آرزو نہ رہی۔۔۔ شوکت تھانوی جیسے مزاح نگار کی خشک اخلاقی سے دلاور فگار جیسے مزاح گو شاعر کا دامن بھی بھرا ہوا ہے"۔ (صفحہ ۱۰۱) دلاور فگار سے تو ان کے نالاں ہونے کی

وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ فیض صاحب نے ان کی جگہ دلاور فگار کو اپنے کالج میں رکھ لیا تھا (صفحہ ۹۱) مگر شوکت تھانوی سے انہیں کیوں شکوہ ہے؟ قرۃ العین حیدر سے بھی انہیں بے اعتنائی کا گلہ ہے "دلی کے سیمینار میں ڈاکٹر (صدیق) شبلی نے مجھے بتایا کہ میرے قریب جو خاتون بیٹھی ہیں وہ قرۃ العین حیدر ہیں تو میں نے ان سے سرگوشیوں میں اپنا تعارف کرایا اور انہیں ہال سے باہر چل کر گفتگو کی دعوت دی انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اب سیمینار میں آ گئی ہوں تو یہاں کی گفتگو سن ہی لوں۔ میں نے ان کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ انہوں نے اجلاس کے خاتمے کے بعد بھی مجھ سے گفتگو کو اپنا اخلاقی فریضہ نہ جانا" (صفحہ ۱۹۵) ڈاکٹر صاحب انصاف کریں کہ اگر یہ خود قرۃ العین کی جگہ ہوتے تو سرگوشیوں میں تعارف کرانے والے ایک اجنبی سے ان کا کیا رویہ ہوتا؟

مصنف کا قول فیصل ہے کہ یہ خودنوشت میری مکمل خودنوشت نہیں خاکوں کی کتاب "جان پہچان" اور دو سفرناموں کو شامل کئے بغیر خودنوشت مکمل نہیں کہلا سکتی (صفحہ ۹۶) اور دونوں چیزیں ہمیں بدقسمتی سے میسر نہیں۔

ہمارے نزدیک تو اس خودنوشت کا "بیت الغزل" ان کا یہ ارشاد ہے اور حکمت کا نچوڑ کہ "پنجاب یونیورسٹی نے اپنی پوری تاریخ میں دو شخصیتوں کے ساتھ سب سے زیادہ ناانصافی کی ہے علامہ اقبال کو فلسفہ میں تھرڈ ڈویژن دے کر اور نظیر صدیقی کو انگریزی میں تھرڈ ڈویژن دے کر"۔ ہم اسی شہ پارے پر اس تجزیے کو ختم کرتے ہیں۔ کتاب کے اواخر میں آپ نے مختلف لوگوں کے جو اقوال زریں درج کئے ہیں اس فقرہ کے بعد ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔

نہ قفس نہ آشیانہ

اردو کے اسارتی ادب کی تازہ ترین خودنوشت سہیل فدا کی خودنوشت ''نہ قفس نہ آشیانہ'' ہے جو کراچی سے ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔

اردو خودنوشتوں کی تاریخ میں اسارت کے موضوع پر پہلی خودنوشت مولانا جعفر تھانیسری کی ''کالا پانی'' تھی۔ انیسویں صدی میں لکھی گئی یہ خودنوشت اب بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے نادر اور جرم آزادی میں ملوث ہونے کی وجہ سے قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے۔ مولانا جعفر تھانیسری کو انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والوں کی اعانت کے جرم میں پہلے سزائے موت سنائی گئی اور پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ سرپھرے لوگ سزائے موت کو شہادت اور اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہیں ان کی سزائے موت کو ''سزائے عمر قید بہ عبور دریائے شور'' میں تبدیل کر دیا گیا۔ تعزیرات ہند میں Transportation for life کا یہ ترجمہ مولانا نذیر احمد دہلوی نے کیا تھا اور انگریزوں کے زمانے تک مستعمل رہا۔ عوامی محاورہ میں اس سزا کو کالے پانی کی سزا کہا جاتا تھا۔ اسارت کے موضوع پر دوسری قابل ذکر کتاب مولانا حسین احمد مدنی کی اسیر مالٹا اور تیسری ظفر اللہ پوشنی کی کتاب ''زندگی زنداں دلی کا نام ہے'' ہے۔ اس میں نام نہاد راولپنڈی سازش کیس میں ملوث لوگوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کے ملزمان بھی سزائے موت کے مجرم سمجھے جاتے تھے مگر سوائے ایک جنرل اکبر خاں کے کسی دوسرے کو بارہ برس قید تنہائی کی سزا نہ ہوئی پھر تمام لوگ کسی آئینی شق کے غیر آئینی قرار دئے جانے کی وجہ سے رہا کر دئے گئے۔ یوں تو اسارت کے موضوع پر مشہور ترین کتاب حمید اختر کی ''کال کوٹھڑی'' ہے مگر اس کے ملزمان سزائے موت کے ملزم نہیں تھے اگر چہ سزائے موت والے قیدیوں کی چکیوں کے

وارڈ میں رکھے گئے تھے۔

اسارتی ادب میں ایک اور نمایاں کتاب میجر اکرم کی سرگزشت ہے ''میں تو بھارتی جاسوس نہیں تھا''۔ میجر اکرم کو ایک غلط رپورٹ کی بنا پر صدر ایوب کے زمانے میں سزائے موت سنائی گئی تھی جو بعد از خرابی بسیار ان کے سر سے ٹلی۔ میجر اکرم کی خودنوشت بر خود غلط ملٹری افسران کی انا پروری کی مکروہ داستان ہے۔ ایک اور کتاب مولانا الیاس منیر کی ہے جو اب تک چھپ کر سامنے نہیں آئی اگرچہ میں نے اس کی کمپیوٹر ورشن دیکھی اور پڑھی ہے مگر میں اس کا ذکر کرنے کا مجاز نہیں۔ مولانا الیاس منیر کو اپنی عبادت گاہ کی حفاظت کے جرم میں دوسرے دو ساتھیوں کے ہمراہ سزائے موت سنائی گئی تھی اور ضیاء الحق کی تمام تر مارشل لائی قوتوں اور ملاؤں کی کوششوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دس سال کے بعد ان بے گناہوں کی رہائی کو ممکن بنا دیا تھا۔ مولانا نے بھی جیل اور سزائے موت کے سائے میں ایم اے کے امتحان پاس کئے تھے۔ اس کا ابتدائیہ یاد رکھنے کا ہے ''اچانک ہمیں بلا کر پھر بیڑیاں پہنا دی گئیں اور پھانسی وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ صدر ضیاء الحق نے آپ کی رحم کی درخواست مسترد کر دی ہے۔ ہمیں حیرانی ہوئی کہ ہم نے تو رحم کی کوئی اپیل کی ہی نہیں تھی یہ کس اپیل کا ذکر کر رہے ہیں۔ مگر پھانسی گھاٹ والا وارڈ نمبر ۷ تو ایک حقیقت تھا۔ یہاں وہی قیدی رکھے جاتے ہیں جنہیں تختہ ءدار پر کھینچنا مقصود ہوتا ہے۔ جیل کا ایک ملازم آیا جس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے ایک تو وکالت نامہ تھا دوسرا ایک پراسرار قسم کا صالح اقرار نامہ تھا جس میں اس قسم کی تحریر تھی ''مجھے مقدمہ قتل نمبر فلاں میں ناجائز طور پر ملوث کیا گیا تھا۔ پھر ملٹری کورٹ نمبر ۶۲ میں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا جس نے مجھے فلاں تاریخ کو موت کی سزا سنا دی۔ جس کے بعد میں نے پٹیشن دائر کی جسے صدر پاکستان نے خارج کر دیا۔ آج سے میری ملاقات بند ہے صرف آخری ملاقات ہوگی۔ اور مجھے سات یوم کے اندر تختہ ءدار پر لٹکا دیا جائے گا''۔

غرض ہمارے مقدمہ کے جملہ مراحل کو انہوں نے نمبروار درج کر کے بات آخر تک پہنچائی تھی میں نے وارنٹی کے کہنے کے مطابق اس تحریر پر بھی اپنے بائیں انگوٹھے کا نشان ثبت کر دیا۔ اس کارروائی کے بعد میرے خیالات دوراہوں پر تیزی سے دوڑنے لگے ایک راستہ زندگی کی طرف جاتا

تھا دوسرے پر اگلی زندگی کا بورڈ آویزاں تھا۔۔۔اس سفر کی شروعات کیسے ہوئیں اور کیا کیا وقوع میں آیا اور خدائے قادر و توانا نے کس طرح اپنے جلوے دکھائے اگلے صفحات میں ان کی تفصیل درج ہے ۔۔۔"

اب آکر میرے دوست زاہد کاظمی نے سہیل فدا کی خودنوشت "نہ قفس نہ آشیانہ" مجھے بھیجی ہے یہ خودنوشت پیراماؤنٹ پبلشنگ انٹر پرائز پی ای سی ایچ ایس کراچی والوں کی جانب سے ۲۰۱۱ میں چھپی ہے۔ یہ روداد سوات کے ایک "نوعمر اسیر زندگی کی اندوہناک اور جراتمندانہ آپ بیتی ہے"۔ سہیل فدا ابھی عمر کے دوسرے عشرے میں اور طالب علم ہی تھا کہ اپنے چچا زاد بھائی کے قتل کے جھوٹے الزام میں اسے سزائے موت سنادی گئی۔ پولیس نے بے پناہ تشدد کر کے اس سے ناکردہ جرم کا اقبال کروایا اور یوں ایک نوجون کی زندگی داؤ پر لگادی مگر آفرین ہے اس نوجوان کی جواں ہمتی پر کہ اس نے نامساعدت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور جیل میں رہ کر اپنی تعلیمی قابلیتیں بڑھاتا رہا۔ ایف اے بی اے اور بین الاقوامی تعلقات اور تاریخ جیسے مشکل موضوعات پر ایم اے کے امتحان پاس کیے۔ سہیل فدا اس لحاظ سے خوش قسمت رہا کہ اسے کم سن ہونے کی وجہ سے جیل کے اندر ان اذیتوں کا سامنا نہ کرنا پڑا جو دوسرے قیدیوں کو کرنا پڑتا ہے پھر تعلیمی ترقی کی وجہ سے اسے بی کلاس مل گئی اس لئے سہیل فدا کی جیل کی داستان میں وہ ہولناکیاں بیان میں نہیں آئیں جن کا تذکرہ دوسری اسارتی سرگزشتوں میں ملتا ہے۔ اس کم سن قیدی کو اس کے حوصلہ اور اولوالعزمی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے کسی صورت میں حوصلہ پست نہیں ہونے دیا۔ دوسری خوش نصیبی اس کی یہ رہی کہ اسے جیل کے اندر ہمدرد استاد میسر آجاتے رہے۔ کتابوں اور رسالوں کے شوق کی وجہ سے سٹرٹیجک سٹڈیز والوں نے اس کی بھیجی ہوئی رسالہ کی فیس واپس کردی۔ (نہ قفس نہ آشیانہ صفحہ ۹۴) ادبی کتابوں کے مطالعہ نے اس کے ذوق کو پختہ کر دیا جس کی مثال شہاب نامہ کے باب میں اس کی رائے سے ہوتا ہے کہ شہاب نامہ شروع میں پسند تھا اب پسند نہیں رہا۔ (صفحہ ۸۳)

بین الاقوامی تعلقات کے مطالعہ نے اسے یہ باور کروادیا کہ "پھانسی دینا غیر انسانی فعل ہے" (صفحہ ۱۰۲) ہمارے ہاں اسلام کے نام نہاد علمبردار حاکم ضیاء الحق کے زمانہ میں سرعام پھانسی کی سزا

دینے کی رسم قبیح بھی ہوتی رہی۔ سہیل فدا نے اس عورت کو بھی داد دی ہے جس نے ہری پور میں تعمیر ہونے والی جیل کی زمین اس شرط پر فروخت کی تھی کہ اس زمین پر کسی کو پھانسی نہیں دی جائے گی۔ (صفحہ ۸۴)

یہ خودنوشت سوات کے ایک سیدھے سادے مسلمان خاندان کے ایک فرد کی ہے جس نے سوات کے ماحول کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے "یہ محبت کرنے والے لوگوں کا پرامن اور شانت علاقہ تھا جہاں ہر کوئی اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ مذہب کی طرف لوگوں کا رجحان تھا لیکن اس میں انتہا پسندی شامل نہیں تھی۔۔۔والیء سوات کی تب بھی عزت کی جاتی تھی اب بھی کی جاتی ہے کیونکہ وہ اپنی رعایا کی سماجی اقتصادی بہبود اور ریاست کے بنیادی ڈھانچے کی ترقی میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔۔۔لوگوں کے ذہن کشادہ تھے بعض اوقات میں حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ کندہ ناتراش ملا کہاں سے ٹپک پڑے ہیں" (صفحہ ۱۸) لوگوں کی سادہ لوحی کی مثال یہ تھی کہ والیء سوات کار میں کسی جگہ گئے تو لوگوں نے اپنے مالک کی سواری کے سامنے چارہ لا کر ڈال دیا (صفحہ ۲۳)

خودنوشت نگار جیل کے ماحول کا شکرگذار ہے کہ اس ماحول نے اس کی صلاحیتوں کو پنپنے کا موقع دیا۔ ہمیں ظفر اللہ پوشنی کی خودنوشت پر فیض صاحب کا لکھا ہوا فلیپ یاد آرہا ہے کہ" پوشنی کے لکھے ہوئے اس منظر نامے پر آپ کو سارے کردار پردہء تصویر پر نظر آئیں گے اور جیل کے وہ سارے ڈراپ سین بھی جس سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ پوشنی نے یہ سب کچھ چٹخارے لے کر لکھا ہے اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ اسے پڑھ کر لوگ یہ نہ سوچنے لگیں کہ۔۔۔جیل خانہ ایسے ہی لطف کی چیز ہے تو یہ تفریح ہم کیوں نہ کر دیکھیں؟" (فلیپ زندگی زندان دلی کا نام ہے)

اس خودنوشت کا آخری باب کتاب میں شامل نہیں۔

کتاب کے اواخر میں اختتامیہ ونگ کمانڈر ہادی رضوی کا لکھا ہوا ہے اور قطعاً اس بات کا پتہ نہیں دیتا کہ سہیل فدا پر اس کے بعد کیا کیا بیتی؟ آخر میں ان کی زندگی کا خاکہ درج ہے اور متوقع رہائی ۲۰۱۲ لکھی ہے۔

سیاحت ماضی

''سیاحتِ ماضی'' کے عنوان سے جناب احمد حسین صدیقی نے اپنی بے ترتیب یادداشتوں کو قلمبند اور دانیال کراچی والوں نے دسمبر ۱۹۹۳ میں اسے شائع کیا ہے۔ صدیقی صاحب امروہے کے ہیں اس لئے جب یادداشتوں کو مرتب کرلیا تو جون ایلیا کے پاس گئے کہ وہ دیکھ لیں اور اشاعت کے بارے میں مشورہ دیں جون صاحب تو اپنے وطن مالوف امروہے گئے ہوئے تھے اور ''امروہے کے ریلوے سٹیشن کی خاک اپنے سر پر ڈال کر رو رہے تھے'' (ندا فاضلی کی خودنوشت۔ دیواروں کے باہر صفحہ ۱۱۹) اس لئے آپ نے ان کی اس وقت کی شریکہء حیات زاہدہ حنا کو مسودہ دکھایا جنہوں نے آپ کی بہت راہنمائی فرمائی (سیاحتِ ماضی صفحہ ۹) اس کا مطلب یہ ہوا جون ایلیا نے مسودہ ملاحظہ نہیں فرمایا مگر جون ایلیا کی پس ورق پر لکھی ہوئی گمراہ کن رائے پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ کہ ''اگر احمد حسین کے لہجے کا سلسلہ نسب تلاش کیا جائے وہ باغ و بہار اور آرائش محفل (قصہء حاتم طائی) سے شروع ہوتا ہے اور غالب کے خطوط تک آتا ہے۔ یہ اردو ادب کا ایک سلسلۃ الذہب ہے۔ احمد حسین ایک ایسی سادگی سلاست اور سامان طرازی کے نثر نگار ہیں جو لکھنے والے کی ہمت کو پست کردیتی ہے'' کم از کم مجھ جیسے کم علم کو تو جون صاحب کی بات کی سمجھ نہیں آئی کہ ان کی غایت کیا ہے؟ اس خودنوشت میں باغ و بہار جیسی محاورہ اور روزمرہ کی خوب صورتی تو دور کی بات ہے عبارت کی روانی اور سلاست ہی محل نظر ہے۔ آرائش محفل جیسی لفظوں کی آرائش ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ غالب کے خطوط جیسی سادگی و پرکاری؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اس کتاب کی نثر تو لکھنے والے کے اعلیٰ ادبی ذوق کا بھی پتہ نہیں دیتی چہ جائیکہ اس کا غالب کے اسلوب سے موازنہ کرنے کی

جسارت کی جائے۔ کیا امروہے کا باسی ہونا اور جون ایلیا کے جد امجد کے مزار مبارک پر دوبار زندہ بچھوؤں کی گواہی دینا (صفحہ ۷۷ اکبر صفحہ ۲۰۴) مصنف کو اس بات کا سزاوار بنا دیتا ہے کہ ان کی عام سی کتاب کو باغ و بہار اور آرائش محفل کے سلسلۃ الذہب میں پرو دیا جائے؟ جون ایلیا کا آخری فقرہ تو ان کے بعض شعروں اور ان کے ''شاید'' کے دیباچہ کی طرح ناقابل فہم ہے۔

جملہ معترضہ کے طور پر یہ بیان کر دینا شاید قارئین کے لئے ازدیاد ایمان کا باعث ہو۔ جون ایلیا نے اپنے جد امجد کے مزار پر بچھوؤں کی موجودگی کا ذکر فرمایا تو مشفق خواجہ نے کیا اچھا سوال اٹھایا تھا'' تازہ انٹرویو میں جون ایلیا نے یہ مژدہ سنایا ہے کہ ان کے جد امجد کے مزار پر بچھو نہیں کاٹتے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس کرہء ارض پر ایک جگہ تو ایسی ہے جہاں بچھوؤں کے ڈنک بے ضرر ہو جاتے ہیں تاہم جون ایلیا نے یہ نہیں بتایا کہ صاحبِ مزار نے آخر بچھو پال کیوں رکھے ہیں'' (کالم ۱۰ نومبر ۱۹۹۴۔ بحوالہ سخن ہائے ناگفتنی صفحہ ۱۱۸)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب کا فرمان ہے'' سیاحت ماضی ان ادب پاروں میں سے ایک ہے جو اپنے آپ کو قاری سے بصد شوق پڑھاتا ہے اور احمد حسین صدیقی کو ایک تخلیق کار کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے'' تخلیق کار کی صف میں لا کھڑا کرنا اور بات ہے باغ و بہار اور آرائش محفل سے تقابلی مطالعہ کا سزاوار بنا دینا شاعرانہ غلو کی انتہا ہے۔

سیاحت ماضی ایک عام سی یادداشتی کتاب ہے جس میں احمد حسین صدیقی صاحب نے سادہ اور غیر ادبی زبان میں اپنے بچپن اور لڑکپن کی باتیں لکھ دی ہیں۔ اور اس علاقہ سے ہجرت کر کے آنے والے اکثر مہاجرین کی طرح اپنی فرضی جائیدادوں اور باغوں کا نوحہ نہیں کیا اپنی غربت اور تنگ دستی کے بیان میں انہیں کوئی باک نہیں اور اس اعتراف میں بھی انہیں انقباض نہیں کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ ''کوئی مجھ پر ترس کھائے'' (صفحہ ۳۰۲)

سیاحت ماضی ایک سیدھی سادی یادداشتی کتاب ہے جس کا پہلا حصہ ان کے امروہے کے قیام سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ پاکستان ہجرت کے بعد نسبتاً کشائش کی زندگی کا ترجمان ہے۔ اپنے وطنِ مالوف کے سفر پر گئے ہیں تو اس کا سفرنامہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے دوستوں مہربانوں کا ذکر تو

ہے ہی ملنے کے لئے آنے والے ایک پرانے کہار کا ذکر بھی کیا ہے۔ (صفحہ ۲۱۹)

اس کتاب کے تین مضامین خالہ جان، چاچی اور پیارے ماموں باقی مندرجات سے انفرادیت بھی رکھتے ہیں اور پڑھنے والے کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ صدیقی صاحب مدتوں بعد اپنی مہربان چاچی سے ملنے اس کے گاؤں ہربنس پورہ پہنچ جاتے ہیں جس نے ان کو بچپن میں گود لیا تھا اور ماں کی سی محبت دی تھی۔۔ میر زمان کو ان کے خاندان والے ماموں کہتے ہیں انہوں نے بھی عمر بھر اس خاندان کا فرد بن کر ہی بسر کی حالانکہ ان کے دادا نے انہیں ان کی کس مپرسی کے عالم میں اپنی تولیت میں لیا تھا۔

آخری باب مختار بیگم کے ذکر خیر پر مشتمل ہے جس سے ان کی ذرا سی دفتری ملاقات ہوئی۔ جی ہاں وہی آغا حشر والی مختار بیگم۔ چوری کہیں کھلے نہ نسیم بہار کی۔ خوشبو اڑا کے لائی ہے گیسوئے یار کی۔ مختار بیگم نے انہیں اپنے گھر مدعو کیا اور جگجیت سنگھ اور چترا سے ان کی ملاقات کروائی۔

احمد حسین صدیقی صاحب نے انیس کے مشہور عالم سلام کے شعر کو میر کا شعر بنا دیا ہے۔ یہ بے سبب نہیں سونے گھروں کے سناٹے۔ مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو۔ (صفحہ ۱۳۱)

رو میں ہے رخشِ عمر

پاکستان کے مشہور ماہر باغبانی جناب اے کے خان (عبدالکریم خاں) کی خودنوشت ''رو میں ہے رخشِ عمر'' جیسمینا نمبرانیشنل بنک بلڈنگ کلفٹن روڈ کراچی کی جانب سے اگست ۲۰۰۵ میں چھپی۔ اے کے خان ریاست جے پور کے رہنے والے ہیں اور مشتاق احمد یوسفی کے ہم وطن اور ہم جماعت دوست ہیں۔ یوسفی صاحب نے ہی ان کی اس کتاب کا دیباچہ ''بابائے باغبانی کی چمن آرائی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ کتاب میں یوسفی صاحب کی وہ تقریر بھی شامل ہے جو آپ نے ان کی پہلی کتاب باغبانی کی تقریب رونمائی کے موقع پر فرمائی تھی۔ یوسفی صاحب نے انہیں غالب کے اس شعر کا مصداق ٹھہرایا ہے۔ ''آشفتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل۔ قانونِ باغبانی صحرا نوشتہ ایم''۔ اور لفظ گل کے ساتھ جتنی تراکیب وابستہ ہیں ان کے نام کر دی ہیں۔ گل ریز، گل خیز، گل انداز، گل افشاں اور گل پاش۔ غالباً ان کی ریش مبارک کا لحاظ رکھتے ہوئے فقط گل رو نہیں کہا ورنہ بعید نہ تھا کہ ان کے بچپن کی رعایت سے یہ بھی کہہ گزرتے اور آخر میں کہہ بھی گذرے ہیں۔

اے کے خان صاحب نے اپنی خاندانی روایت کے مطابق زراعت کی تعلیم حاصل کی اور پھر اپنے بزرگوں کی طرح باغبانی کے شعبہ سے وابستہ ہوئے اور اسی کارِ خیر میں عمر بسر کر دی۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کے باغوں اور پارکوں کے افسر رہے ریٹائرمنٹ کے بعد باغبانی اور گل رانی میں پرائیویٹ بزنس شروع کیا۔ ملک کے دیگر حصوں میں ہونے والے کارہائے باغبانی میں ان کا نمایاں حصہ ہے اور ان کی کی ہوئی لینڈ سکیپنگ میں مزار قائد کے ارد گرد کا باغ، جی آئی کے یونیورسٹی کے باغ باغیچے شامل ہیں۔ بین الاقوامی کانفرنس میں بھی اپنے ملک کی نمائندگی کا شرف انہیں ملتا رہا اور اس

میدان میں اپنے ملک کا سب سے بڑا اعزاز پرائیڈ آف پرفارمنس بھی حاصل کر چکے ہیں۔ خان صاحب دیندار آدمی ہیں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے ان کا گہرا رشتہ رہا اور ہے۔

ان کی خودنوشت ان کی گلبانی کی سرگرمیوں کی شگفتہ داستان ہے۔ پھولوں کی نمائشوں میں انہیں شغف ہے اور پاکستان کی فن باغبانی کی سوسائیٹی کے بانی مبانی ہیں۔ مگر ان کی خودنوشت میں ساری دلچسپی دوسروں کی باتوں کے سہارے ہے۔ بابائے اردو کا یہ قول ہم نے انہی بابائے باغبانی کے ہاں پڑھا ہے کہ "صرف دو ہی آدمی جنت میں جائیں گے وہ جس نے اردو کی خدمت کی ہوگی اور وہ جس نے الہٰ آباد کے امرود کھائے ہوں گے" (رو میں ہے رخشِ عمر صفحہ ۶۱) اکبرالہٰ آبادی تو الہٰ آباد کے امرودوں کے باب میں کہہ ہی چکے ہیں "اب الہٰ آباد میں سامان نہیں بہبود کے۔ یاں دھرا کیا ہے سوا اکبر کے اور امرود کے۔"

احوال الرجال میں عبدالستار ایدھی کا ذکر "انہی دنوں ستار ایدھی بھی کونسلر تھے لیکن ان کا طرز زندگی اس وقت بھی وہی تھا جو آج ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہتے تھے اور فٹ پاتھ پر بیٹھتے تھے لوگوں کی خدمت کے لئے ۲۴ گھنٹے تیار اور ہمہ وقت اپنے کاموں میں مصروف یہ ان کی سوشل سروس کا آغاز تھا پھر دھیرے دھیرے اس اکیلے شخص نے خدمت خلق کا اتنا بڑا ادارہ بنا لیا جو آپ اپنی مثال آپ ہے" (صفحہ ۱۱۱)

ایک عورت کو ان کے سامنے اس الزام میں لایا گیا کہ اس نے منی پلانٹ کی چوری کی ہے۔ "میں نے ان سے پوچھا یہ مالی آپ کو کس لئے یہاں لایا تھا؟ بولیں میں نے چوری کی ہے۔ میں نے حیرت سے پوچھا کس چیز کی چوری۔ بولیں منی پلانٹ کی انہوں نے ایک شاخ جو شاید بارہ یا آٹھ انچ لمبی ہوگی ساڑھی سے نکال کر دکھائی۔۔۔ اس قسم کی شاخ نرسری سے دو آنے کی مل جاتی تھی ۔۔۔ بولیں جناب میں نے چرائی ہے قصہ یہ ہے کہ میں آپ کی نرسری سے کئی بار منی پلانٹ خرید کر لے گئی ہوں گھر میں لگائی تو بیل مرجاتی ہے۔ اتفاق سے میری ایک سہیلی سے جب میں نے ذکر کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ دراصل منی پلانٹ چوری کر کے گھر پر لگانے سے پھلتی پھولتی ہے اور منی بھی تب ہی آتی ہے اسی لئے اس کا نام منی پلانٹ ہے" (صفحہ ۱۱۴)

آپ نے حج کے لئے چار ہزار روپے جمع کئے اب ان کا مصرف۔ انہی کی زبان مبارک سے سنئے "کچھ کم تین ہزار کے دونوں کے ائیر ٹکٹ ہو گئے ایک ہزار میں نے بچوں کو دے دیا کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ہماری واپسی پر ہمارے استقبال کی تیاری کے سلسلے میں ان کے پاس کچھ رقم موجود ہو۔" (صفحہ ۱۲۱) حج کے مناسک تو مانگ تانگ کرا دا کر لئے مگر واپسی کے لئے "اسراف بے جا" کے لئے رقم بچانا ضروری سمجھا۔ خدا معلوم ان کی پسندیدہ تفہیم القرآن میں آیہء مبارکہ **لا تُسرِفُوا** کی کیا تفسیر لکھی ہے۔ بعض اوقات دیندار لوگ بھی لایعنی رسم و رواج کی رو میں بہہ کر ایسی بے تکی باتیں کر جاتے ہیں کیا حج سے واپسی اور استقبال کی تیاری بھی مناسک حج میں شامل ہے؟

اپنے وطن جے پور گئے تو وہاں مہارانی جے پور گیاتری دیوی نے انہیں کسی دعوت میں مدعو کیا۔ ان کے بچے متردد تھے کہ ہمارے پاس دعوت کے شایان شان کپڑے نہیں ہیں مگر وہاں گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ "تمام لوگ بہت ہی عام سے ملبوسات زیب تن کئے ہوئے تھے بلکہ اکثر لوگوں کے کپڑے ان سے کمتر ہی تھے۔ اور کھانے میں بہت سادہ چیزیں تھیں اس تقریب سے واپسی پر سب یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ شاید ہمارے پاکستان میں دکھاوا، بناوٹ نمود و نمائش اور شان و شوکت کچھ زیادہ ہی ہے" (صفحہ ۱۳۷) عین ممکن ہے قبلہ اے کے خاں صاحب کو حج کی واپسی پر ایک ہزار خرچ کرنے والا اسراف بھی یاد آیا ہو؟ مہارانی جے پور گیاتری دیوی کی خودنوشت ہم نے پڑھی ہے مہارانی شادی سے قبل کوچ بہار کی شہزادی تھیں اور اپنے حسن کی بدولت ساری دنیا میں مشہور تھیں پھر جے پور جیسی ریاست کی مہارانی بن گئیں۔ ہمیں ان کی خودنوشت کا ایک فقرہ نہیں بھولتا مہاراجہ شکار کے لئے ان کے علاقہ کوچ بہار آئے اور ان کے ہاں ٹھہرے لکھتی ہیں "میں سوچا کرتی تھی کہ کیا یہ ممکن ہوگا کہ میں اس خوبصورت نوجوان کے کپڑے کو ہاتھ سے چھو سکوں؟" اور شادی ہوگئی تو بھی مہاراجہ کے کپڑوں کو چھونے سے قبل ان کے ہاتھ کانپنے لگتے تھے۔ حیف کہ وہ خودنوشت انگریزی میں تھی اور مدتوں ہمارے بک شیلف میں موجود رہی یہ پتہ ہوتا کہ کسی جے پور کے رہنے والے کی خودنوشت میں مہارانی گیاتری دیوی کا ذکر آ جائے گا تو ہم بھی ان کی یادداشت کا حوالہ متحضر رکھتے۔

احوال الرجال میں ان کے ایک جمعدار کا ذکر۔ ان کے ہاں چوری ہوگئی تو لوگ باگ ہمدردی

کے لئے آنے لگے "ایک بہشتی جسے دہلی میں جہاں میں کام کرتا تھا جمعدار بنادیا تھا وہ بھی پاکستان آگیا تھا مگر وہ میرے پاس کام نہیں کرتا تھا وہ بھی چوری کی خبر سن کر آیا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ بار بار یہی کہتا رہا کہ صاحب آپ کو کپڑوں کی ضرورت ہوگی۔۔۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر شاید ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہی ایک بات بار بار دہراتا تھا پھر کہنے لگا صاحب جب میں دہلی سے آیا تو اندر کپڑوں میں سی کر چار ہزار روپیہ لے کر آیا تھا خدا کا شکر ہے کہ وہ پیسے یہاں خیریت سے پہنچ گئے۔ اور اس کے بعد وہی پرانی بات کہ کپڑے تو آپ کو چاہئے ہی ہوں گے۔ میں سوچنے لگا یہ جاتا کیوں نہیں آخر اس نے ہمت کر کے جیب سے وہ رقم نکالی اور نظریں نیچی کر کے بولا صاحب یہ روپیہ لایا ہوں آپ کچھ کپڑے بنوا لیجئے پھر اس نے رقم میری طرف بڑھائی مگر نظریں اونچی نہیں کیں۔ میں بے حد متاثر ہوا۔ اور اس سے کہا میرے پاس پیسے ہیں حالانکہ مجھے سخت ضرورت تھی۔ آج اس واقعہ کو ۵۶ سال ہوگئے جب بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے اس کے لئے دعا نکلتی ہے" (صفحہ ۱۹۵)

اب آخر میں رشید احمد صدیقی اور پطرس کا ایک مکالمہ "پطرس، صدیقی صاحب سے گپ شپ کے دوران کہہ رہے تھے کہ آپ اردو کی بڑی غلطیاں نکالتے ہیں اگر میں یہ کہوں کہ "میں نے نہیں کھانا میں نے نہیں پینا" تو اس میں کیا ہرج ہے؟ صدیقی صاحب نے فرمایا "ہرج تو کوئی نہیں بس آدمی پہچانا جاتا ہے"۔ (صفحہ ۲۸۴)

پہچانے تو اپنے اے کے خاں صاحب بھی گئے ہیں یوسفی صاحب کے فقرے پر ہی تجزیہ ختم کرتا ہوں "ایک مشہور پنجابی بیت ہے جتھے لچھی پب دھردی اُتھے اُگدا سرُو دا بوٹا۔ مطلب یہ ہے جہاں وہ نازنیں قدم رکھتی ہے وہاں سرو کا درخت نمودار ہوجاتا ہے۔ خاں صاحب اگر عاشقانہ طرز تکلم پر خفا نہ ہوں تو ہم یہ کہنے کی جسارت کریں گے کہ ایسے ہی لچھن ان کے بھی ہیں" (صفحہ ۲۲۷)

خودی نہ بیچ

مغربی پاکستان اسمبلی کے ایک رکن جناب اجون خاں جدون کی خود نوشت "خودی نہ بیچ"، جدون ہاؤس۔ محمدی سٹریٹ پشاور سے ۲۰۰۷ میں شائع ہوئی۔ کسی زمانہ میں مشرقی پاکستان کو دوسرے صوبوں کے برابر درجہ دینے کے لئے پاکستان کے دیگر چار صوبوں کو ایک صوبہ قرار دیدیا گیا تھا اس نئے صوبہ کو مغربی پاکستان کہا جاتا تھا جسے ون یونٹ کا منصوبہ کہتے تھے۔ مغربی پاکستان میں پنجاب سندھ سرحد اور بلوچستان اور قبائلی علاقے شامل تھے۔ مغربی پاکستان کا دارالحکومت لاہور تھا اور اس کی اسمبلی بھی مغربی پاکستان اسمبلی کہلاتی تھی۔ ہمیں یاد ہے مغربی پاکستان کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کو بہ طور وزیراعلیٰ ریڈیو سے پہلی تقریر نشر کرنا تھی جو اعلان کے باوجود نہ ہوئی۔ اس کی وجہ یوں معلوم ہوئی کہ مولانا صلاح الدین احمد نے جنہیں یہ تقریر لکھنے کا کام تفویض کیا گیا تھا عین وقت پر یہ تقریر لکھنے سے انکار کردیا تھا کہ میں کسی ایسے شخص کی تقریر لکھنے سے اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کرسکتا جس نے قیام پاکستان کی مخالفت کی ہو (میرا بیان۔ خود نوشت اخلاق احمد دہلوی صفحہ ۱۶۲)۔ یعنی ہمارے ہاں بھی ایسے غیرت مند لکھنے والے موجود تھے جو اپنے ضمیر کے خلاف کام کرنے سے انکار کردیا کرتے تھے۔

اجون خان جدون ۱۹۶۲ میں اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اپنے قبیلہ گدون اور صوابی کے علاقے کی نمائندگی کرتے رہے۔ اس وقت ایوب خاں ملک کے صدر اور امیر محمد خاں مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ ان دونوں کے ساتھ اجون خان صاحب کی دلچسپ ملاقاتوں کا احوال بڑا دلچسپ بھی ہے اور اس بات کا غماز بھی کہ قبائلی ضابطہ اخلاق میں حاکم ومحکوم کے مابین تکلف وتملق راہ نہیں پا سکتا۔ ایوب خاں صاحب نے ان سے کہا کہ "اپنے علاقہ میں فیملی پلاننگ کا چرچا کریں۔ خاں

صاحب نے فرمایا میں آٹھ بچوں کا باپ ہوں میں کس منہ سے دوسروں کو کہوں؟ صدر ایوب مسکرائے فرمایا میرا اپنا بھی یہی حال ہے" (خودی نہ بیچ صفحہ ۳۳۴)

اجون خاں کا بچپن کراچی میں گذرا آپ نے بمبئی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا کراچی میں مختلف ملازمتیں کرتے رہے کچھ عرصہ تک برطانوی ہند کی فوج میں بھی رہے پاکستان بننے کے بعد ان کا خیال تھا کہ فوج میں خدمت جاری رکھیں گے مگر ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ آپ امریکی تیل کمپنی میں کام کرتے رہے اور معزز عہدوں پر رہے۔ افغانستان کو تیل کی ترسیل کے سلسلہ میں کمپنی ان کی کارکردگی سے بہت خوش رہی اس لئے ان کی اسمبلی کی رکنیت کے زمانہ میں بھی ان کو ممکنہ حد تک مراعات دیتی رہی۔

جاپان کے بارے میں پڑھتے ہوئے پہلی بات ان کے ساموراِئی کلچر کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوتی ہے جسے اصطلاح میں "بوشیدو" کہا جاتا ہے اسی طرح ہمارے ہاں پختون قبائلی کلچر کا اپنا ضابطہء اخلاق ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں ہمیں پختون کلچر اور روایات کی تعریف نظر آئی ہے" ننگ، بہادری، شجاعت، مہمان نوازی، سخاوت، غیرت، بدلہ لینا، عفو، دیانت، ارادے کی پختگی، پکی اور بے غرض دوستی اور پت پالنے میں سر دھڑ کی بازی لگانا، ایثار اور 'پختو' کے اعلیٰ اقدار اور روایات کے لئے جانی و مالی قربانی سے دریغ نہ کرنا اور شرمندگی کے کاموں سے بچنا اور ان سے نفرت کرنا وغیرہ وغیرہ جس پختون میں ان اوصاف سے روگردانی ظاہر ہو اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں پختو نہیں" (صفحہ ۲۴) اجون خاں صاحب کی یہ خودنوشت ان کے کھرے پختون ہونے کی گواہ ہے۔

کتاب میں جگہ بجگہ خاں صاحب نے پشتو کے حکمت آمیز مقولے درج کئے ہیں۔ حج کے سفر میں جب ان کے ساتھی مشکلات سفر سے گھبرا گئے تو خاں صاحب نے انہیں تسلی دی اور پشتو کا ایک مقولہ سنایا کہ "جنگل میں چھوٹے شکار کے لئے نکلو تو شیر کے شکار کا سامان بھی تیار کر کے نکلو" (صفحہ ۲۶۹) اور انہیں اپنی جیب سے بہت سی رقم نکال کر دکھائی کہ میں اس مقولہ پر عمل کرتے ہوئے اپنے ممکنہ خرچ سے چار گنا رقم زیادہ لے کر نکلا تھا۔

امریکی تیل کمپنی میں ملازم تھے کہ ان کے مالکوں میں سے مسٹر راک فیلر پاکستان آئے۔ یہ ان

کی مہمان داری پر مقرر ہوئے۔ پاکستانی افسروں نے انہیں ہدایت دی کہ مسز راک فیلر بھی ساتھ ہیں اس لئے کم از کم ایک لاکھ روپیہ مہیا رکھو ممکن ہے وہ کوئی خریداری کرنا پسند کریں مگر کتاب یہ بتاتی ہے کہ مسز راک فیلر نے صرف ہزار ڈیڑھ ہزار کی خریداری کی اور مسٹر راک فیلر نے کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا (صفحہ ۱۲۶) شاید یہ بات ہمارے غیر ملکی سفروں پر جا کر اللے تللے کرنے والے رہنماؤں اور صنعتکاروں کی آنکھیں کھولنے کا موجب ہو۔

یہ تو دوسروں کی باتیں ہیں اپنوں کی اسی بے ڈھنگی چال کا احوال سنئے۔ الیکشن کے لئے یہ بھی اپنے ووٹروں کو اکٹھا کر کے ایک ہوٹل میں لے گئے تا کہ دوسرے ان کو ورغلا نہ سکیں اور عین پولنگ کے وقت اچانک سب کو لے کر پولنگ سٹیشن پہنچے اور دوسروں کو حیران کر دیا (صفحہ ۲۲۱)۔ انہیں شکر گذار ہونا چاہئے ایوب کے بنیادی جمہوریت کے نظام کا جس میں ووٹ کا حق چند منتخب لوگوں کو حاصل تھا اور یہ دو چار ویگنوں میں اپنے ووٹروں کو بھر کر لے آئے تھے۔ ورنہ اپنے نواز شریف صاحب نے جس طرح بسیں بھر بھر کر اسمبلی کے اراکین کو مری کے پانچ ستارہ ہوٹلوں میں پابند رکھا تھا جس کی روداد بیگم کلثوم سیف اللہ کی کتاب میری تنہا پرواز میں درج ہے، ان کے بس کی بات نہ ہوتی۔ خان صاحب کو اقبال بہت پسند ہے اور ہر جگہ اس کے شعروں کا حوالہ دیتے ہیں خدا معلوم خاں صاحب اپنے اور بعد کو نواز شریف کے اس جمہوری اقدام پر کون سے شعر کا حوالہ دیتے؟ غالباً یہ شعر ان کے کام آتا۔ جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔

ہمیں تو خاں صاحب کی اقبال پرستی بہت خوش آئی خاص طور سے آپ نے علامہ کے اس شعر کا حوالہ دیا ہے جو آپ نے اپنے بیٹے جاوید اقبال کے لئے کہا تھا" حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی۔ خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ۔" (صفحہ ۱۳۴) امید ہے جاوید اقبال کی خودنوشت "اپنا گریباں چاک" خاں صاحب کی نظروں سے گذری ہوگی اور آپ نے علامہ صاحب کی اس دعا کی قبولیت کے بہت سے نظارے جاگتی آنکھوں ملاحظہ کئے ہوں گے۔

احوال الرجال میں جلال بابا کا ذکر بھی ہے۔ ان کے باب میں اب تک یہ تضحیک آمیز بات ہی سننے میں آتی رہی کہ مرکز میں وزیر تھے تو رکشہ میں سفر کرتے ہوئے قومی پرچم اپنے ہاتھ میں اٹھا کر بیٹھے رہے۔ خاں صاحب نے ان کی جو بات بیان کی وہ بھی قابل قدر اور یاد رکھنے کی ہے کہ یہ اپنے

کام سے جلال بابا کو ملنے گئے جلال بابا کا سکریٹری موجود نہیں تھا جلال بابا اٹھے اور خود چل کر اپنے سکریٹری کے گھر گئے اسے بلا کر لائے اور ان کا کام کرنے کو کہا۔ (صفحہ ۱۰۳) ایسی باتیں وہی کر سکتا ہے جو حد سے زیادہ بے ریا اور مخلص ہو موجودہ دور میں تو کسی ایسے شخص کا تصور بھی امر محال ہے۔

خاں صاحب چاہتے تو صدر ایوب سے اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے مراعات لے سکتے تھے مگر ان کا کہنا ہے ''میرے ضمیر نے اجازت نہیں دی کہ میں اپنی ذات کے لئے صدر سے کچھ طلب کروں'' (صفحہ ۳۳۶) اور ہم ان کی اس بات پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس تجزیہ کو سمیٹتے ہیں۔ اے کاش ہمارے ملک میں ان جیسے دو چار لوگ ہی موجود ہوتے۔

اس خودنوشت سے ایک بات ہمیں پہلی بار معلوم ہوئی کہ تحریک مجاہدین کے ''اہم رہنما سید اکبر شاہ خود اور ان کا بیٹا میاں عبدالجبار شاہ ریاست سوات کے حکمران رہے اور قادیانیت سے تعلق ہونے کی بنا پر انہیں حکمرانی سے برطرف کیا گیا اور ان کی جگہ میاں عبدالودود (باچہ صاحب) والی بنائے گئے'' (صفحہ ۱۱۸) میں نے اپنے بزرگ دوست کرنل انور احمد سے اجون خان صاحب کی بات کی تصدیق چاہی۔ انہوں نے تصدیق کی کہ سید عبدالجبار شاہ جماعت احمدیہ کے پہلے خلیفہ حضرت مولوی نورالدین صاحب مرقاۃ الیقین کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے۔ کرنل صاحب نے ہی سوات کے آخری والی میاں گل جہانزیب کی انگریزی خودنوشت The Last Wali of Swat مرتبہ فریڈرک بارتھ عطا فرمائی جس میں لکھا ہے کہ ''دریائے سوات کے مغربی حصہ کے والی سید عبدالجبار شاہ کے خلاف حالات پلٹا کھا رہے تھے ایک وجہ تو یہ تھی کہ انہوں نے باہر سے اپنے بہت سے عزیز بلا لئے تھے اور سوات کا انتظام ان کے سپرد کر دیا تھا دوسرے یہ کہ معلوم ہؤا تھا کہ ان کا تعلق احمدیہ فرقہ سے ہے۔ اس لئے ملا ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان سے کہا یا تو آپ حلف اٹھائیں کہ آپ مرزا (غلام) احمد کے پیروکار نہیں یا چلے جائیں۔ انہوں نے کہا میں امن و امان سے لایا گیا تھا اب امن و مان سے ہی جانا پسند کروں گا۔ اس طرح ستمبر ۱۹۱۷ میں انہیں آرام سے رخصت کر دیا گیا''۔

(لاسٹ والی آف سوات صفحہ ۳۲)

کتابیات ۴

۱۔ بشیر موجد۔ ''بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں''۔ پاکستان کیلیگراف آرٹسٹس گلڈ لاہور ۲۰۰۴

۲۔ جیون خاں۔ ''جیون دھارا: قصر سلطانی کے سائے تلے'' سنگت پبلشرز لاہور ۲۰۱۰

۳۔ ڈاکٹر خالد سہیل۔ ''سچ اپنا اپنا''۔ لاہور ۲۰۱۰

۴۔ ائیر کموڈور سجاد حیدر۔ ''فلائٹ آف دی فیلکن''۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی ۲۰۰۹

۵۔ عبدالوحید ظفر ''قصوروار کون؟'' آواز پبلشرز کولون جرمنی۔ ۲۰۰۹

۶۔ حنہ شاہ۔ ''امام کی بیٹی''۔ زاندروان پبلشرز امریکہ ۲۰۱۰

۷۔ آغا اشرف علی۔ ''کچھ تو لکھئے کہ لوگ کہتے ہیں''۔ کشمیر ٹائمز پبلیکیشنز سرینگر ۲۰۱۰

۸۔ رالف رسل۔ ''جوئندہ یابندہ'' آج پبلیکیشنز کراچی ۲۰۰۵

۹۔ وقار بن الہیٰ۔ ''ماں میں تھک گیا ہوں''۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۲۰۰۶

۱۰۔ شائستہ سہروردی اکرام اللہ۔ ''پردے سے پارلیمنٹ تک''۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کراچی ۱۹۹۸

۱۱۔ اکرام بریلوی۔ ''سرسری تم جہان سے گذرے''۔ بختیار اکیڈمی کراچی۔ ۲۰۱۰

۱۲۔ ملا واحدی۔ ''میرا افسانہ''۔ نشریات اردو بازار لاہور ۲۰۰۹

۱۳۔ سید مظہر حسین۔ ''ایک سفارت کار کی سرگزشت''۔ مجلس تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی۔ ۲۰۰۳

۱۴۔ ملک زادہ منظور احمد ''رقصِ شرر''۔ دہلی ۲۰۰۴

۱۵۔ سید مینو چہر۔ ''میرے شب و روز'' سنگ میل لاہور ۲۰۰۹

۱۶۔ غوث انصاری۔ ''عمر رفتہ'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۲

۱۷۔ محمد اسد۔ ''بندہ ءصحرائی''۔ دی ٹروتھ سوسائٹی گلبرگ لاہور ۲۰۰۰

۱۸۔رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی۔دہلی ۲۰۰۳

۱۹۔زیڈ اے احمد۔''میرے جیون کی کچھ یادیں'' نیشنل بک ٹرسٹ دہلی ۲۰۰۹

۲۰۔رفعت سروش۔''پتہ پتہ بوٹا بوٹا''۔نورنگ کتاب گھر دہلی ۱۹۹۶

۲۱۔جنرل ابوبکر عثمان مٹھا۔''بمبئی سے جی ایچ کیو تک'' دوست پبلیکیشنز اسلام آباد۔۲۰۰۹

۲۲۔محمد اسلم لودھی۔''لمحوں کا سفر''۔سدرہ ایمپوریم اردو بازار لاہور ۲۰۰۹

۲۳۔وفا راشدی۔''داستانِ وفا'' مکتبہ اشاعت اردو شاہ فیصل ٹاؤن کراچی ۱۹۹۷

۲۴۔شیخ انعام منظور۔''کچھ یادیں''۔پنجند اکیڈمی اردو بازار لاہور ۲۰۱۰

۲۵۔صدیق مرزا۔''میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' بیت الحکمت لاہور ۲۰۰۸

۲۶۔فیروز خاں نون۔''چشم دید''۔تخلیقات مزنگ روڈ لاہور ۲۰۰۶

۲۷۔مسعود احمد خاں دہلوی۔''سفرِ حیات''۔اردو جرمن کلچرل سوسائٹی ۔۲۰۱۱

۲۸۔ملک غلام نبی۔''قصہ ایک صدی کا''۔سنگ میل لاہور ۲۰۰۴

۲۹۔سید عبداللہ شاہ۔''میری داستان''۔آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور ۱۹۸۵

۳۰۔یونس احمر۔''ماضی کے تعاقب میں''، فضلی سنز کراچی۔۱۹۹۱

۳۱۔منصور عاقل''حرفِ محرمانہ'' مکتبہ اتحاد المصنفین اسلام آباد ۱۹۹۴

۳۲۔ڈاکٹر سید محمد عقیل''گئو دھول''، انجمن تہذیب نو الہ آباد ۱۹۹۵

۳۳۔علی محتشم''یادوں کی باتیں''۔رائٹرز اکیڈمی بخاری مارکیٹ وحدت لنک روڈ لاہور ۱۹۸۴

۳۴۔شفیع نیاز ''عمرِ رواں''۔نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۲۰۰۹

۳۵۔بانو قدسیہ''راہِ رواں'' سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲۰۱۱

۳۶۔ڈاکٹر اقبال حسین۔''داستاں میری''۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۱۵۔۱۹۸۹

۳۷۔وارث کرمانی۔''گھومتی ندی''۔رام پور رضا لائبریری قلعہ رام پور یوپی۔پہلی بار۔۲۰۰۶

۳۸۔کرن بیدی۔''سب کچھ ممکن ہے'' انڈیا ویژن فاؤنڈیشن ۲۔تال کٹورا لین نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱۔۲۰۰۵

۳۹۔فرمان فتحپوری''بلا جواز''الوقار پبلیکیشنز واپڈا ٹاؤن لاہور ۲۰۰۹

۴۰۔لفٹیننٹ کرنل عبدالقادر''بے تیغ سپاہی''۔علم و عرفان پبلشرز لاہور اپریل ۲۰۱۱۔

۴۱۔جاوید اختر چوہدری۔''سوہاوہ: میری بستی میرے لوگ''۔مہر بک فاؤنڈیشن لاس اینجلس امریکہ۔۲۰۰۷

۴۲۔ڈی ڈی ٹھاکور۔''یادوں کے چراغ''۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ پہلی بار۔۲۰۰۶

۴۳۔حکیم احمد شجاع''خوں بہا'' آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۱

۴۴۔صلاح الدین ناصر۔''زندگی ایک سفر''۔روداد پبلیکیشنز اسلام آباد۔پہلی بار۔۲۰۱۰

۴۵۔لطف اللہ۔''لطف اللہ کی آپ بیتی''۔اردو ترجمہ ڈاکٹر مبارک علی۔ فکشن ہاؤس لاہور۔۱۹۹۶

۴۶۔فیاض رفعت۔''زندگی ہے تو کہانی بھی ہوگی'' معیار پبلیکیشنز گیتا کالونی دہلی ۲۰۰۰

۴۷۔ڈاکٹر اطہر پرویز۔''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی دسمبر ۱۹۷۷

۴۸۔بریگیڈیئر جعفر علی خاں۔''بریگیڈیئر جعفر علی خاں کی کہانی انہی کی زبانی۔'' حیدرآباد انڈیا ۲۰۰۲

۴۹۔ڈاکٹر اعجاز حسین۔''میری دنیا'' کارواں پبلشرس منٹو روڈ الہ آباد پہلا ایڈیشن اگست ۱۹۶۵

۵۰۔ڈاکٹر اطہر صدیقی''میں کیا میری حیات کیا'' حصہ دوم۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ نومبر ۲۰۰۳

۵۱۔کلثوم سیف اللہ خاں۔''میری تنہا پرواز'' علمی پبلشنگ بیورو۔پوسٹ بکس ۱۸۶۷ جی پی او اسلام آباد ۲۰۱۱

۵۲۔سعیدہ وحید۔''خواب جو حقیقت بنے: سعیدہ وحید کی کہانی ان کی اپنی زبانی۔کچھ رفقاء کی زبانی'' سنگ میل لاہور ۲۰۱۱

۵۳۔چوہدری جلیل احمد خاں،'' جدو جہد حیات۔دلی سے پاکستان آج تک کا سفر''۔جہانگیر بکس لاہور راولپنڈی کراچی۔ پہلا ایڈیشن ۲۰۱۱

۵۴۔حسن عسکری کاظمی۔''حاصلِ عمرِ گریزاں''۔اظہار سنز لاہور۔۲۰۱۱

۵۵۔انتظار حسین۔''جستجو کیا ہے''۔طبع اول۔سنگ میل لاہور۔۲۰۱۱

۵۶۔ڈاکٹر احمد حسن دانی۔''دانی کی کہانی دانی کی زبانی''۔طبع اول۔سنگ میل لاہور۔۲۰۱۱

۵۷۔رضا علی عابدی۔ریڈیو کے دن۔سنگ میل لاہور ۲۰۱۱۔بار اول

۵۸۔ظہور حسین۔مجاہد روس و بخارا کی آپ بیتی۔قادیان ۲۰۰۹۔بار پنجم

۵۹۔میاں اکبر شاہ۔آزادی کی تلاش۔قومی ادارہ برائے تحقیق و ثقافت۔اسلام آباد ۱۹۸۹

۶۰۔مولوی عبدالرزاق کانپوری۔یادِ ایام۔آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۳

۶۱۔کرنل محمد عطاء اللہ۔دو دنیاؤں کا شہری Citizen of Two Worlds ہارپر اینڈ برادرز نیویارک

مؤسسہ مطبوعات فرینکلن مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۶۴

۶۲۔توصیف تبسم۔ بندگلی میں شام۔عکاس پبلیکیشنز اسلام آباد۔۲۰۱۰

۶۳۔حفیظ صدیقی ''یادوں کی دھول''۔ سانجھ۔مزنگ روڈ لاہور دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۱

۶۴۔رفیع الزمان زبیری۔''یادوں کے دریچے''۔ فضلی سنز کراچی ۲۰۱۲

۶۵۔علی رحمن۔''عدالت عالیہ کے قاصد کی کہانی''۔صدیقی پبلشرز۔مراتب علی روڈ لاہور جون ۲۰۱۱

۶۶۔آئی اے آفتاب۔''فرشتے کی ایف آئی آر''ساگر پبلیکیشنز ٹمپل روڈ لاہور ۲۰۱۱۔

۶۷۔قاضی عبدالقادر۔''یادوں کی تسبیح''۔نشریات۔اردو بازار لاہور طبع دوم ۲۰۱۰

۶۸۔محمد ابوالفضل فاروقی۔''نشیب وفراز''۔اپلائیڈ پبلیکیشنز۔دریا گنج دہلی طبع دوم ۲۰۰۳

۶۹۔سید مظفر حسین۔''عرض وسماع''۔کراچی ۱۹۹۰

۷۰۔چوہدری غلام عباس۔''کشمکش''۔رائیل پبلشنگ کمپنی، فضل داد پلازہ کمیٹی چوک راولپنڈی 2012

۷۱۔بیگم پاشا صوفی۔''ہماری زندگی''ایوان اردو تیموریہ کراچی ۲۲۔اشاعت اول ۱۹۷۳

۷۲۔صوفیہ انجم تاج۔''یادوں کی دستک''زین پبلیکیشنز ناظم آباد کراچی ۷۴۰۰۷۔جنوری ۲۰۰۷

۷۳۔نظیر صدیقی''سویہ ہے اپنی زندگی''سرحد اردو اکیڈمی قلندر آباد ایبٹ آباد۔۱۹۹۱

۷۴۔سہیل فدا۔''نہ قفس نہ آشیانہ''۔پیراماؤنٹ پبلشنگ انٹر پرائز کراچی ۲۰۱۱

۷۵۔احمد حسین صدیقی۔''سیاحتِ ماضی''۔دانیال۔کراچی۔دسمبر ۱۹۹۳

۷۶۔اے کے خان۔''رو میں ہے رخشِ عمر''جیسمیا نمبرا، نیشنل بنک بلڈنگ کلفٹن روڈ کراچی اگست ۲۰۰۵

۷۷۔اجون خان جدون۔''خودی نہ بیچ''جدون ہاؤس۔محمدی سٹریٹ پشاور ۲۰۰۷

کتابیات سوم

۱۔کچھ دیر پہلے نیند سے۔سجاد نقوی۔العصر پبلیکیشنز۔۱۴ مزنگ روڈ لاہور۔پہلا ایڈیشن مارچ ۲۰۰۹

۲۔ایک ادھوری سرگزشت۔انیس ناگی۔جمالیات۔لاہور ۱۹۹۸

۳۔روداد قفس۔حفیظ نعمانی۔تنویر پریس لکھنؤ۔نومبر ۲۰۰۰

۴۔سفیر اور سفارت کاری ایک دور کی کہانی۔سمیع اللہ قریشی۔پیراماؤنٹ پبلشنگ انٹر پرائز کراچی نومبر ۲۰۰۶

۵۔تیسرا جنم۔ڈاکٹر خالد جمیل اختر۔زیب پبلشرز اردو بازار لاہور۔ستمبر ۲۰۰۵

۶۔یادوں کی دھنک۔بریگیڈیئر ظفر اقبال چوہدری۔اذان سحر پبلیکیشنز لاہور۔فروری ۲۰۰۱

۷۔کچھ لمحے مرے نصیبوں کے۔محمد اعظم سبزواری۔کراچی لائبریری پروموشن بیورو۔۲۰۰۷

۸۔کاروان حیات۔مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی نومبر ۲۰۰۳

۹۔آشرم۔شکیل الرحمن۔عصمت پبلیکیشنز دہلی۔مارچ ۱۹۹۲

۱۰۔مرد آہن۔خودنوشت حق نواز اختر مرتبہ عبادت اللہ خان دانیال اکادمی کراچی۔مئی ۲۰۰۶

۱۱۔مرد آہن دوسرا حصہ خودنوشت حق نواز اختر مرتبہ عبادت اللہ خان دانیال اکادمی کراچی اگست ۲۰۰۶

۱۲۔قصہ بے سمت زندگی کا۔وہاب اشرفی۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔۲۰۰۸

۱۳۔یاد ہے سب ذرا ذرا، عبیدالرحمن ایڈووکیٹ، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی مارچ ۲۰۰۳

۱۴۔شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔شاد عظیم آبادی۔انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔نومبر ۱۹۵۸

۱۵۔کچھ دھاگے سے بندھی یادیں۔توصیف چغتائی۔نتاشا کامنیکیشن کراچی ۱۹۹۵

۱۶۔دھوپ چھاؤں۔ڈاکٹر فاطمہ شاہ۔عشبہ پبلشنگ انٹرنیشنل۔کراچی ۲۰۰۶

۱۷۔ذوق پرواز۔محمد صدیق تہامی۔شرکت المتیاز۔اردو بازار لاہور سن اشاعت درج نہیں

۱۸۔مبالغہ نہ مغالطہ۔میاں محمد ارشد۔رحمان جی پبلشرز۔ٹرنر روڈ لاہور جولائی ۲۰۰۶

۱۹۔ بیتی کہانی۔ شہر بانو بیگم۔ القمر انٹر پرائزز لاہور۔ ۲۰۰۶

۲۰۔ زندگانی کی گذرگاہوں میں۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز۔ تسنیم پبلیکیشنز اردو بازار لاہور۔ ستمبر ۱۹۹۴

۲۱۔ اور میں پاکستان آ گیا۔ ڈاکٹر سید منظر حسین کاظمی۔ شیخ شوکت علی اینڈ سنز کراچی۔ ۲۰۰۵

۲۲۔ جہاد زندگانی۔ مولوی فیروز الدین۔ فیروز سنز ۱۹۵۹

۲۳۔ سفر نامہ حیات ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ۔ بار اول ۲۰۰۵

۲۴۔ بلاکم وکاست۔ مہدی علی صدیقی۔ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی۔ جنوری ۲۰۰۲

۲۵۔ بلبلیں نواب کی۔ موسیٰ رضا۔ فضلی سنز کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۹۸

۲۶۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ سیف الدین بوہرہ۔ شاد پبلیکیشنز کوئٹہ۔ ۲۰۰۵

۲۷۔ معین بیتی۔ ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۱۹۹۳

۲۸۔ سفر جاری ہے۔ ملک مقبول احمد۔ مقبول اکیڈمی لاہور۔ جنوری ۲۰۰۷

۲۹۔ معراج نامہ۔ ملک معراج خالد۔ جہانگیر بکس۔ لاہور کراچی ۲۰۰۸

۳۰۔ ان کی باتیں ہماری یادیں۔ ایس این خان۔ کراچی دسمبر ۱۹۹۵

۳۱۔ کچھ باتیں کچھ یادیں۔ محمد شمیم جیراجپوری۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۲

۳۲۔ ہوک۔ خودنوشت سوانح عمری از سکے دار۔ حکایات ٹمپل روڈ لاہور ۲۰۰۳

۳۳۔ میرے شب وروز۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ بک ہوم لاہور ۲۰۰۵

۳۴۔ پرواز۔ خودنوشت اے پی جے عبدالکلام۔ بک ہوم لاہور ۲۰۰۶

۳۵۔ گھر ہونے تک خودنوشت مالکم ایکس بک ہوم لاہور ۲۰۰۵

۳۶۔ انور السادات کی خودنوشت۔ فکیٹ پبلیکیشنز ٹمپل روڈ لاہور۔ سن اشاعت درج نہیں۔

۳۷۔ کیا دن تھے۔ قاضی جلیل عباسی۔ دانش محل بک سیلرز لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۸۵

۳۸۔ My days at Aligarh Prof MN Farooqi. 1995

۳۹۔ A Princess remembers by Gyatri Devi. Rupa & co. New Delhi. 1965

۴۰۔ فضائیہ میں گذرے ماہ وسال۔ ایئر مارشل ریٹائرڈ ظفر چوہدری۔ آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۵

۴۱۔ تماشا گاہ عالم۔ خودنوشت زبیدہ سلطانہ۔ مقبول اکیڈمی لاہور ۲۰۰۷

۴۲۔ ایک دل ہزار داستان۔ خودنوشت آغا اشرف۔ آتش فشاں پبلیکیشنز ۱۹۸۹ لاہور

۴۳۔ حکایت ہستی۔ ڈاکٹر صغرا مہدی۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی۔ ۲۰۰۶ پہلا ایڈیشن

۴۴۔ نوشاد۔ موسیقار اعظم۔ مرتبہ فاروق ارگلی۔ فرید بک ڈپو۔ دریا گنج نئی دہلی۔ ۲۰۰۶

۴۵۔ آپ بیتی سید امیر علی۔ مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۴

۴۶۔ داستاں میری۔ تصدق حسین راجا۔ مکتبہ دانیال اسلام آباد۔ اشاعت اول ۱۹۹۵

۴۷۔ محمد کاظم کی سوانح عمری۔ ترجمہ از فارسی۔ جریدہ ۳۷۔ مشفق خواجہ کراچی

۴۸۔ سرگزشت کرنل سید حسنین احمد۔ سن طباعت ومقام نامعلوم

۴۹۔ آہنگ بازگشت۔ مولوی محمد سعید۔ قومی ادارہ برائے تحقیق وتاریخ ثقافت اسلام آباد ۱۹۸۹

۵۰۔ چاہ یوسف سے صدا۔ یوسف رضا گیلانی۔ نگارشات پبلشرز لاہور ۲۰۰۶

۵۱۔ عدالت عالیہ تک کا سفر۔ جسٹس (ریٹائرڈ) محمد اسلام بھٹی۔ نیا زمانہ پبلیکیشنز۔ ٹمپل روڈ لاہور، ۲۰۰۹

۵۲۔ جو بچے ہیں سنگ۔ تجمل حسین۔ سنگ میل پبلشرز لاہور۔ ۲۰۰۶

۵۳۔ آپ بیتی/ پاپ بیتی۔ ساقی فاروقی۔ اکیڈمی بازیافت کراچی جنوری ۲۰۰۸

۵۴۔ گھونگرو ٹوٹ گئے۔ قتیل شفائی۔ الحمد لاہور ۲۰۰۷

۵۵۔ سچا گیت گایا۔ ملکہ پکھراج۔ کالی برائے خواتین دہلی ۲۰۰۳

۵۶۔ میں تو بھارتی جاسوس نہیں تھا۔ میجر محمد اکرم خاں۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔ ۲۰۰۲

۵۷۔ ایوان اقتدار کی جھلکیاں۔ گوہر ایوب خاں۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔ ۲۰۰۶

۵۸۔ میری آخری منزل۔ جنرل محمد اکبر خاں رنگروٹ۔ لاہور ۲۰۰۶

۵۹۔ تین صدور کا ایڈی کانگ۔ امبیسڈر ارشد سمیع خان۔ پینگا گان پریس دہلی۔ ۲۰۰۸

۶۰۔ ہنگاموں میں زندگی۔ مشتاق احمد خاں وجدی۔ لاہور ۱۹۷۴۔ طبع دوم ۱۹۸۰

۶۱۔ نربدہ سے مہران تک۔ فتح اللہ عثمانی فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۰۳۔

۶۲۔ واقعہ بھٹو سمیت۔ جنرل راحت لطیف۔ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۳

۶۳۔ جیون دھارا۔ جیون خاں۔ سنگت پبلشرز ۶۲ سی لوئر مال روڈ۔ لاہور ۲۰۰۶

۶۴۔ شناسائیاں رسوائیاں۔ کشور ناہید۔ سنگ میل پبلشرز لاہور ۲۰۰۷

۶۵۔ لخت لخت داستان۔ بریگیڈئیر اسمٰعیل صدیقی۔ دوست پبلیکیشنز اسلام آباد ۲۰۰۱

۶۶۔ In the land of invisible women از ڈاکٹر قانتہ احمد۔ امریکہ ۲۰۰۰

۶۷۔ تجربات جو ہیں امانت حیات کی۔ خودنوشت ثاقب زیروی۔ لاہور ۲۰۰۸

۶۸۔ کھلی کتاب۔ خودنوشت عبدالستار ایدھی۔ مرتبہ تہمینہ درانی۔ نیشنل بیورو آف پبلیکیشنز اسلام آباد ۱۹۹۸

۶۹۔ چند خوشگوار یادیں۔ خودنوشت امام بشیر احمد رفیق۔ قادیان۔ ۲۰۰۹

۷۰۔ دیکھی تیری دنیا۔ افضل توصیف۔ فیروز سنز لاہور ۲۰۰۹

۷۱۔ نایاب ہیں ہم۔ حمیدہ اختر حسین۔ دانیال کراچی۔ بارِ سوم جنوری ۲۰۰۳

۷۲۔ Daughter of Destiny. Benazir Bhutto. Simon and shuster, Simon and Shuster Building, Rockfeller center. 1230, Avenue of the Americas, New York 10020. 1989.

۷۳۔ Flight of the Falcon. Air Commodore Syed Sajjad Haider. Vanguard, Lahore. 2009

۷۴۔ بیتے لمحوں کی چاپ۔ خودنوشت پروفیسر سمیع اللہ قریشی۔ بک ہوم لاہور ۲۰۰۹

۷۵۔ ہم کہاں کہ دانا تھے۔ شیخ منظور الٰہی۔ سنگ میل لاہور ۲۰۱۰

کتابیات پس نوشت اور پس پس نوشت

۱۔ ''سرگزشت''۔ عبدالمجید سالک' الفیصل ناشران۔ اردو بازار لاہور ۱۹۹۳ء

۲۔ ''سرگزشت''۔ ذوالفقار علی بخاری۔ غالب پبلشرز لاہور۔

۳۔ ''آشفتہ بیانی میری''۔ رشید احمد صدیقی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۹ء

۴۔ ''زرگزشت'' مشتاق احمد یوسفی دانیال کراچی۔

۵۔ ''خواب باقی ہیں'' آل احمد سرور۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۱ء

۶۔ ''تحدیثِ نعمت'' سر محمد ظفر اللہ خان۔ ڈھاکہ بینیو ولینٹ ایسوسی ایشن۔ ۱۹۷۱ء

۷۔ ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں''۔ خواجہ غلام السیدین۔ سیدین میموریل ٹرسٹ دہلی ۱۹۷۴ء

۸۔ ''شام کی منڈیر سے''۔ وزیر آغا۔ مکتبہ فکر و خیال لاہور ۱۹۸۶ء

۹۔ ''ناممکن کی جستجو''۔ حمید نسیم۔ فضلی سنز کراچی ۱۹۹۰ء

۱۰۔ ''جنرل کی آپ بیتی''۔ میجر جنرل شاہد حامد ۔ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۲ء

۱۱۔ ''یادوں کی بارات'' جوش ملیح آبادی۔ مکتبہ شعر و ادب لاہور ۱۹۷۵ء

۱۲۔ ''یادوں کی دنیا'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔ فکشن ہاؤس لاہور ۱۹۹۴ء

۱۳۔ ''اعمال نامہ''۔ سر رضا علی۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۱۹۹۲ء

۱۴۔ ''آپ بیتی''۔ عبدالماجد دریابادی۔ مکتبہ فردوس لکھنؤ۔ ۱۹۸۸ء

۱۵۔ ''گردِ راہ''۔ اختر حسین رائے پوری۔ المسلم پبلشرز کراچی ۱۹۹۳ء

۱۶۔ ''شہاب نامہ''۔ قدرت اللہ شہاب۔ سنگ میل لاہور ۱۹۹۰ء

۱۷۔ ''میری داستانِ حیات'' ڈاکٹر غلام جیلانی برق۔ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۲ء

۱۸۔ ''جہانِ دانش'' ۔ احسان دانش۔ المسلم پبلشرز کراچی ۱۹۹۵ء

۱۹۔ ''سلیوٹ'' صدیق سالک۔ مکتبہ سرمد بکس راولپنڈی ۱۹۸۹ء

۲۰۔ ''ناقابلِ فراموش''۔ دیوان سنگھ مفتون۔ مکتبہ اردو ادب لاہور ۱۹۵۷ء

۲۱۔ ''مٹی کا دیا''۔ مرزا ادیب۔ سنگ میل لاہور ۱۹۸۴ء

۲۲۔ ''جو رہی سو بے خبری رہی''۔ ادا جعفری بدایونی۔ دانیال کراچی ۱۹۹۵ء

۲۳۔ ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' شہرت بخاری۔ سنگ میل لاہور ۱۹۸۷ء

۲۴۔ ''بری عورت کی کتھا''۔ کشور ناہید۔ سنگ میل لاہور ۱۹۹۳ء

۲۵۔ ''آتشِ چنار''۔ شیخ محمد عبداللہ۔ چوہدری اکیڈمی اردو بازار لاہور ۱۹۸۵ء

۲۶۔ ''خوں بہا''۔ احمد شجاع۔ آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۱ء

۲۷۔ ''بوئے گل نالہ دل دودِ چراغِ محفل''۔ شورش کاشمیری۔ مکتبہ چٹان لاہور ۱۹۹۴ء

۲۸۔ ''یادِ ایام''۔ عبدالرزاق کانپوری۔ آتش فشاں پبلیکیز۔ ۱۹۹۳ء (مضامین 'یادداشتیں' خاکے)

۲۹۔ ''جو ملے تھے راستے میں''۔ احمد بشیر۔ مرتبہ یونس جاوید۔ گورا پبلشرز لاہور ۱۹۹۶ء۔ (خاکے)

۳۰۔ ''میرا سیاسی سفر'' مخدوم زادہ حسن محمود۔ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۸۸ء

۳۱۔ ''رو میں ہے رخشِ عمر''۔ عبدالسلام خورشید۔ آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور۔

۳۲۔ ''آئینہء ایام'' کرنل غلام سرور۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۸۱ء

۳۳۔ ''مرقاۃ الیقین'' حکیم نورالدین۔ مرتبہ اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔ لاہور 1915ء

۳۴۔ ''حیاتِ قدسی''۔ مولانا غلام رسول راجیکی۔ سیٹھ علی محمد الہ دین۔ سکندر آباد دکن۔ ۱۹۵۱ء

۳۵۔ ''بہ یادِ صحبتِ نازک خیالاں''۔ آفتاب احمد خان۔ دانیال کراچی ۱۹۹۷ء۔ (شخصی خاکوں کا مجموعہ)

۳۶۔ ''اس آباد خرابے میں''۔ اختر الایمان۔ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۶ء

۳۷۔ ''گفتنی ناگفتنی''۔ وامق جونپوری۔ خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ۔ ۱۹۹۳ء

۳۸۔ ''دیواروں کے بیچ''۔ ندا فاضلی۔ معیار پبلیکیشنز نئی دہلی۔ ۱۹۹۲ء

۳۹۔ ''دیواروں کے باہر''۔ ندا فاضلی۔ معیار پبلیکیشنز دہلی

۴۰۔ ''گیان سنگھ شاطر''۔ گیان سنگھ شاطر۔ حیدر آباد۔ انڈیا۔ ۱۹۹۶ء

۴۱۔ ''در در ٹھوکر کھائے'' ڈاکٹر مبارک علی۔ فکشن ہاؤس لاہور

۴۲۔ ''چراغوں کا دھواں'' انتظار حسین۔ سنگ میل لاہور ۱۹۹۹ء

۴۳۔ '' شورشِ دوراں''۔ حمیدہ سالم۔ ادب پبلیکیز نئی دہلی ۱۹۹۵ء

۴۴۔ ''ڈگر سے ہٹ کر''۔ سعیدہ بانو احمد۔ دہلی ۱۹۹۸ء

۴۵۔ ''گرداب کی شناوری'' زہرا داؤدی۔ جاوداں کراچی ۱۹۹۶ء

۴۶۔ ''آپ بیتی'' ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل۔ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی لاہور ۱۹۶۴ء

۴۷۔ ''ورودِ مسعود'' ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ دہلی ۱۹۹۲ء

۴۸۔ ''گردشِ پا'' زبیر رضوی۔ دہلی ۱۹۹۹ء

۴۹۔ ''ہماری منزل'' (انگریزی) سید ہاشم رضا۔ کراچی ۱۹۹۸ء

۵۰۔ ''پاکستان: قیادت کا بحران''۔ جنرل جہانداد خان۔ الشفا ٹرسٹ اسلام آباد ۲۰۰۰ء

۵۱۔ ''اپنا گریباں چاک''۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔ سنگ میل لاہور ۲۰۰۳ء

۵۲۔ ''جست بھر زندگی'' اکبر حمیدی۔ رابطہ اسلام آباد ۱۹۹۷ء

۵۳۔ ''متاعِ کارواں'' سردار محمد چوہدری۔ لاہور ۱۹۹۷ء

۵۴۔ ''غبارِ زندگی'' حسن نواز گردیزی۔ لاہور۔ ۱۹۹۹ء

۵۵۔ ''عشرتِ فانی'' ۔عشرت رحمانی۔ لاہور ۱۹۹۴ء

۵۶۔ ''انوکھا لاڈلا'' محسن مگھیانہ۔ لاہور ۱۹۹۷ء

۵۷۔ ''آپ بیتی'' خواجہ حسن نظامی دہلوی۔ دہلی ۱۹۱۴ء

۵۸۔ ''اپنی تلاش میں'' کلیم الدین احمد۔ پٹنہ۔ ۱۹۹۸ء

۵۹۔ ''میرے ماہ و سال'' جاوید شاہین۔ لاہور ۱۹۹۹ء

۶۰۔ ''یادِ عہدِ رفتہ''۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ادارہ ادب و تنقید لاہور ۱۹۹۸ء

۶۱۔ ''عبدالغفور نساخ کی خود نوشت'' مرتبہ ڈاکٹر عبدالسبحان۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۸۹ء

۶۲۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے''۔ مرتبہ مظفر علی سید۔ کراچی ۱۹۹۰ء (مضامین)

۶۳۔ ہم سفر از حمیدہ اختر حسین کراچی ۱۹۹۵ء

۶۴۔ نقشِ حیات از حسین احمد مدنی' دارالاشاعت اردو بازار کراچی اشاعت اول سن نامعلوم

۶۵۔ گنجینۂ گوہر از شاہد احمد دہلوی (خاکے)

۶۶۔ ''خبر گیر'' خودنوشت قیصر تمکین۔دہلی

۶۷۔ ''مشتِ غبار'' چوہدری اقبال احمد گوندل۔جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۳ء

۶۸۔ ''دلی یاد آتی ہے''۔روح افزا حیدر۔ملٹی گرافکس اسلام آباد۔۲۰۰۲

۶۹۔ ''داستانِ غدر''۔۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات۔خودنوشت راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی داروغہ ماہی مراتب بہادر شاہ ظفر۔مکی دار الکتب لاہور۔۲۰۰۲ء

۷۰۔ ''میرا کوئی ماضی نہیں''۔سحاب قزلباش۔فضلی سنز۔کراچی ۱۹۹۵ء (خاکے)

۷۱۔ ''میرا بیان'' اخلاق احمد دہلوی۔ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۵ء

۷۲۔ ''میری کہانی'' اویس احمد دوراں۔دہلی ۱۹۹۹ء

۷۳۔خودنوشت ابوالکلام آزاد مرتبہ ملیح آبادی دہلی ۲۰۰۲ء

۷۴۔ ''لاہور کا جوذکر کیا''۔گوپال متل'موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی'

۷۵۔ ''کوچۂ قاتل'' رام لعل۔لکھنؤ ۱۹۹۵ء

۷۶۔دل بھٹکے گا۔احمد بشیر۔فیروز سنز لاہور ۲۰۰۳

۷۷۔میری داستان فرحت اللہ بیگ۔حیدر آباد دکن ۱۹۷۰

۷۸۔خاطرات۔ظفر حسن آئبک۔سنگ میل لاہور ۱۹۹۰

۷۹۔خودنوشت سوانح حیات۔مسعود کھدر پوش۔کھدر پوش ٹرسٹ لاہور ۲۰۰۳

۸۰۔جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی۔کلیم عاجز۔عرشی پبلیکیشنز دہلی ۱۹۸۱

۸۱۔یہ لاہور ہے۔ابوالحسن نغمی۔سنگ میل۔لاہور

۸۲۔میرے ہمسفر۔احمد ندیم قاسمی۔اساطیر لاہور

۸۳۔جہان حیرت۔سردار محمد چوہدری لاہور ۲۰۰۲

۸۴۔آپ بیتی یا ایم اے او کالج علیگڑھ کی کہانی۔میر ولایت حسین۔علیگڑھ ۱۹۴۶

۸۵۔کتاب زندگی۔فضلی سنز۔کراچی ۲۰۰۴

۸۶۔اور بستی نہیں یہ دلی ہے۔رفعت سروش۔دہلی ۱۹۹۳

۸۷۔باغی شہزادی کی یادداشتیں۔شہزادی عابدہ سلطان۔Memoirs of a rebel Princess آکسفرڈ پریس ۲۰۰۲

۸۸۔گوہر گزشت۔الطاف گوہر کراچی ۲۰۰۳

۸۹۔پراگندہ طبع لوگ۔داؤد رہبر سنگ میل لاہور۔۲۰۰۰

۹۰۔زندگی زنداں دلی کا نام ہے۔ظفر اللہ پوشنی۔لاہور ۲۰۰۰

۹۱۔خیمہ میں واپسی۔جنزل عتیق الرحمٰن۔Back to the Pavillion آکسفرڈ پریس کراچی

۹۲۔یادداشتیں اور تاثرات۔چیف جسٹس نسیم حسن شاہ۔ Reflections and Memoirs الحمراء اسلام آباد ۲۰۰۲

۹۳۔جہانِ دگر احسان دانش۔خزینۂ علم وادب لاہور ۲۰۰۱

۹۴۔اور پھر بیاں اپنا۔اخلاق احمد دہلوی مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۵

۹۵۔تماشائی کی یادداشتیں۔اقبال اخوند۔Memoirs of a Bystander آکسفرڈ پریس ۱۹۹۷

۹۶۔سفر آدھی صدی کا۔عبدالکریم عابد۔ادارۂ معارف اسلامی کراچی ۲۰۰۳

۹۷۔لمحات۔خرم مراد۔منشورات لاہور ۲۰۰۴

۹۸۔عدالتیں کانچ کے گھر میں۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ۔ Law Courts in a Glasshouse آکسفرڈ پریس ۲۰۰۱

۹۹۔میرا افسانہ۔افضل حق۔لاہور ۱۹۹۱

۱۰۰۔گم شدہ لوگ۔آغا ناصر۔سنگ میل۔۲۰۰۳

۱۰۱۔یادداشتیں۔پروفیسر حبیب الرحمٰن۔بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی.

۱۰۲۔خاک کے پردے۔آغا سہیل۔لاہور ۲۰۰۴

۱۰۳۔جائزہ۔جسٹس محمد احمد خاں صمدانی۔سنگ میل لاہور ۲۰۰۳

۱۰۴۔ایک جج بولتا ہے۔چیف جسٹس اجمل میاں۔A Judge Speaks Out آکسفرڈ پریس کراچی

.۱۰۵۔دیرپا محبت۔سابق ملکہ فرح پہلوی۔An Enduring Love. Miramaax Books, 2004-New york

۱۰۶۔آپ بیتی جگ بیتی۔سعد راشد الخیری۔فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۰۴

۱۰۷۔گئے دنوں کا سراغ۔نثار عزیز بٹ۔سنگ میل۔لاہور

۱۰۸۔ کار جہاں دراز ہے۔ قرۃ العین حیدر۔ سنگ میل ۲۰۰۳

۱۰۹۔ میری داستان محمد منصور کاظم۔ کراچی ۲۰۰۲

۱۱۰۔ ہاں میں باغی ہوں۔ مخدوم جاوید ہاشمی ساگر پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۵

۱۱۱۔ میں کیا میری حیات کیا۔ پروفیسر اطہر صدیقی ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ۲۰۰۳

۱۱۲۔ نامہ اعمال۔ نواب سر یامین خاں۔ آئینہ ادب لاہور ۱۹۷۰

۱۱۳۔ غبار کارواں۔ بیگم انیس قدوائی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۸۳

۱۱۴۔ امرتسر کی یادیں۔ اے حمید۔ لاہور ۱۹۸۴

۱۱۵۔ منزلیں گرد کی مانند۔ خلیق ابراہیم خلیق۔ فضلی سنز کراچی۔ ۱۹۹۹

۶۱۱۔ یادخزانہ۔ جمیل زبیری۔ دانیال کراچی ۱۹۹۳

۱۱۷۔ زندگی کی شاہراہیں اور پگڈنڈیاں۔ چیف جسٹس محمد منیر۔ High ways and Byways of Life لاہور ۱۹۷۸

۱۱۸۔ رسیدی ٹکٹ۔ امرتا پریتم۔ لاہور پبلشر اور سن اشاعت نامعلوم۔

۱۱۹۔ یادوں کے سائے۔ عتیق صدیقی۔ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۴

۱۲۰۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔ شاد عظیم آبادی۔ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ۱۹۵۸

۱۲۱۔ اردو میں خودنوشت سوانح عمریاں۔ مقالہ پی ایچ ڈی۔ لکھنؤ یونیورسٹی ڈاکٹر صبیحہ انور۔ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۲

۱۲۲۔ آشنائیاں کیا کیا۔ حمید اختر۔ جنگ پبلشرز لاہور۔ ۲۰۰۳

۱۲۳۔ احوال واقعی اخباری کالم۔ بک ہوم لاہور ۲۰۰۵

۱۲۴۔ کال کوٹھری (زنداں نامہ) حمید اختر۔ جنگ پبلشرز ۱۹۹۳

۱۲۵۔ احوالِ دوستاں۔ حمید اختر۔ لاہور ۱۹۹۸

۱۲۶۔ گلشنِ یاد۔ آغا ناصر۔ سنگ میل لاہور ۲۰۰۵

۱۲۷۔ گولیوں کی زد میں۔ پرویز مشرف۔ فری پریس نیویارک۔ In the Line of Fire. ۲۰۰۶

۱۲۸۔ ڈھلتے سائے۔ منیر الدین احمد۔ قوسین لاہور

۱۲۹۔ آپ بیتی مولانا زکریا کاندھلوی مہد الخلیل الاسلامی بہادر آباد کراچی۔

۱۳۰۔ کالا پانی۔ مولانا جعفر تھانیسری۔ طارق اکیڈمی فیصل آباد ۲۰۰۱

۱۳۱۔ چہرے۔ سحاب قزلباش۔ اشارات پبلیکیشنز مارچ ۲۰۰۲

۱۳۲۔ گمنام و بے ہنر۔ محمد سعید احمد لاہور ۲۰۰۵

۱۳۳۔ پاکستان خواب پریشاں۔ روئیداد خان۔ Pakistan a Dream Gone Sour آکسفرڈ یونیورسٹی پریس 1997

۱۳۴۔ یاد ایام۔ نواب احمد سعید خاں چھتاری۔ مسلم ایجوکیشنل پبلشرز علیگڑھ۔

۵۳۱۔ گئے دنوں کا سراغ۔ مظفر وارثی۔ خزینہ علم و ادب۔ لاہور مارچ ۲۰۰۰

۶۳۱۔ یادوں کی مالا رمیض احمد ملک۔ تخلیقات مزنگ روڈ۔ لاہور ۲۰۰۱

۷۳۱۔ ڈی سی نامہ۔ محمد سعید شیخ۔ سنگ میل لاہور ۲۰۰۴

۸۳۱۔ پریم چند کی آپ بیتی مدن گوپال۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲۰۰۱

۹۳۱۔ ان دیکھی گہرائیاں۔ ہارون ابن علی۔ ایون بکس لندن۔ بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی ۲۰۰۶

۱۴۰۔ یادوں کی نگری۔ حافظ بدر الدین۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۲۰۰۲

۱۴۱۔ چھتیس برس۔ ایم ایم حسن۔ انجمن علم و دانش کراچی ۱۹۹۳

۱۴۲۔ دیدہ شنیدہ۔ سید شہاب الدین دسنوی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۱۹۹۳

۱۴۳۔ لخت لخت داستان۔ بریگیڈیر اسماعیل صدیقی۔ دوست پبلیکیشنز اسلام آباد۔ ۲۰۰۱

۱۴۴۔ تمنا بیتاب۔ رشید امجد۔ حرف اکیڈمی پشاور روڈ راولپنڈی ۲۰۰۳

۱۴۵۔ عمر رفتہ۔ نقی محمد خاں خورجوی۔ ادارہ علم و فن کراچی ۲۰۰۳

۱۴۶۔ داستان امیر حمزہ شنواری (گفتگو خاطر غزنوی) سنڈیکیٹ آف رائٹرز پشاور ۱۹۹۶

۱۴۷۔ کہانی مختصر کوئی نہیں ہے۔ غوث متھراوی۔ ظہوریہ اکیڈمی خیابان بدر کراچی ۲۰۰۳

۱۴۸۔ جگر لخت لخت۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ مکتبہ خیابان ادب لاہور ۲۰۰۵

۱۴۹۔ زندگی کی یادیں۔ جہاں آرا حبیب اللہ۔ آکسفرڈ پریس کراچی ۲۰۰۳

۱۵۰۔ پاپ بیتی۔ اشفاق نقوی۔ نیو لائن کیولری گراؤنڈ لاہور

۱۵۱۔ عمر گزشتہ۔ سمیع محمد خاں۔ بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی ۲۰۰۶

۱۵۲۔ بتیس برس امریکہ میں۔ ابوالحسن نغمی۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۶

۱۵۳۔ حیات بقا اور کچھ یادیں۔ محمد مظہر بقا زوار اکیڈمی پبلیکیشنز کراچی ۲۰۰۶

۱۵۴۔ دنیا ساری خواب۔ شیخ ایاز۔ الفاظ پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۸

۱۵۵۔ جنت سے نکالی ہوئی حوا۔ نفیس بانو شمع۔ آبشار پبلیکیشنز جامعہ نگر دہلی۔ ۱۹۹۸

۱۵۶۔ کاروانِ حیات نواب مشتاق احمد خاں۔ ۱۸۰ ڈی ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۹۷۴

۱۵۷۔ سفر زندگی۔ مہاراجہ کرن سنگھ سابق مہاراجہ کشمیر سرینگر

۱۵۸۔ نشانِ جگر سوختہ۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ سنگ میل لاہور ۲۰۰۵

۱۵۹۔ کارنامہء سروری۔ علی گڑھ یونیورسٹی پریس ۱۹۲۹

۱۶۰۔ ایم ایف حسین کی کہانی اپنی زبانی۔ احمد مقصود حمیدی۔ خیابان باغبان کراچی ۲۰۰۴

۱۶۱۔ یاد کی رہگزر۔ شوکت کیفی۔ دانیال کراچی ۲۰۰۶

۱۶۲۔ داستاں کہتے کہتے۔ صبیح محسن۔ مکتبہ جمال گلستان جوہر کراچی ۲۰۰۶

۱۶۳۔ داستان حافظ بزبان حافظ۔۔ خودنوشت حافظ قدرت اللہ۔ لانگ ول کیوبیک کینیڈا ۲۰۰۶

۱۶۴۔ حیات مستعار۔ جلیل قدوائی۔ کراچی ۱۹۹۸

ڈاکٹر پرویز پروازی

نام: ناصر احمد خاں

قلمی نام: پرویز پروازی

جائے پیدائش: قادیان

تاریخ پیدائش: 20 اکتوبر 1936

1958۔ تعلیم: بی اے آنرز۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ

1960۔ ایم اے، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

1968۔ پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی

تدریس:

1960۔ گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ

1961 تا 1969 تعلیم الاسلام کالج ربوہ، لیکچرار

1969 تا 1975 تعلیم الاسلام کالج، پروفیسر

1975 تا 1979 وزیٹنگ پروفیسر، اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز، جاپان

1979 تا 1982 انٹر کالج کمالیہ، اسسٹنٹ پروفیسر

1982 تا 1986 مسلم انٹر کالج چک 41 ج ب فیصل آباد، اسسٹنٹ پروفیسر

1986 تا 1990، گورنمنٹ کالج فیصل آباد، اسسٹنٹ پروفیسر

1991 تا 2001 (دوسری ہجرت کے بعد) پروفیسر ریسرچ ایٹ اپسالا یونیورسٹی سویڈن

تصنیفات و تالیفات:

1964۔ ذکر اردو، تعلیم الاسلام کالج کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ،

1977۔خوبصورت جاپان اور میں،کاواباتا یاسوناری کی نوبل سپیچ کا اردو ترجمہ

1978۔یوکی گونی،کاواباتا کے نوبل ناول کا اردو ترجمہ،

1980۔جاپان کا سب سے لمبا دن،

1980۔جاپان کی ہائیکو شاعری کا انتخاب اور ترجمہ

1981۔سورج کے ساتھ ساتھ،جاپان کا سفر نامہ

1997۔صدائے آب،ہائیکو پر تنقیدی مضامین،

2002۔آ کی ے،ہیروشیما کے المیہ کے پس منظر میں ناول

2003۔احمدیہ کلچر

2003۔سر ظفر اللہ کا تحریک آزادی میں حصہ

2003،پس نوشت۔اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

2005۔سر ظفر اللہ کی یاداشتیں،

Reminiscences of Sir Zafarullah 2006

2008۔پس نوشت اور پسِ پس نوشت (مزید خودنوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

2010۔پس نوشت سوم (مزید خودنوشتوں کا جائزہ)

2012۔پس نوشت چہارم (مزید خودنوشتوں کا جائزہ)

خودنوشتوں کے تجزیہ کا کام جاری ہے،جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

حاصل عمر: ''حبل الورید'' قرآن حکیم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ)

تیسری ہجرت کے بعد 2003 سے کینیڈا میں مقیم ہیں